توجیہات

خواجہ شمس الدین عظیمیؔ



www.ksars.org

Khwaja Shamsuddin Azeemi Research Society

توجیہات

خواجہ شمس الدین عظیمی

اِنتساب

دل اللہ کا گھر ہے اس گھر میں، میں نے
عظیمی کہکشاں دیکھی ہے، اللہ کی معرفت اس
منور تحریر کو عظیم کہکشاؤں کے روشن چراغوں
کے سپرد کرتا ہوں تاکہ وہ اس نور سے اپنے
دلوں کو منّور کریں۔

فہرست

ترتیب و پیشکش

حضرت سلطان باہوؒ اپنے مرشد کریم کے بارے میں فرماتے ہیں۔

الف اللہ چنبے دی بوٹی میرے من وچ مرشد لائی ہو

نفی اثبات دا پانی ملیا ہر رگے ہر جائی ہو

ہر جا بوٹی مشک مچایا جاں پُھلّن تے آئی ہو

مرشد کامل ہر دم جیوے جیں اے بوٹی لائی ہو

ان اشعار میں حضرت سلطان العارفین نے طالب کے دل کو زمین اور اسم ذات اللہ کو تخم اور ذکر نفی اثبات کو پانی اور مرشد کامل کو بمثل باغبان اور مالی فرمایا ہے اور جب اسم ذات اللہ کا پودا مرشد کامل کی پرورش اور تربیت سے نشو و نما پا کر کامل ہو جاتا ہے تو اس کے نقوش چنبیلی کے پھولوں کی طرح طالب کے تمام اعضاء پر بجلی کے قمقموں کی طرح جگمگ جگمگ کرنے لگ جاتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ اللہ میرے مرشد کو سلامت رکھے یہ سب فیض میرے مرشد کامل کا ہی بخشا ہوا ہے۔

قدرت جب کسی سے کام لینا چاہتی ہے تو اس کے لئے وسائل فراہم کر دیتی ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ انسان کی حیثیت ایک کھلونے سے زیادہ نہیں ہے۔ کھلونے میں چابی بھر دی جاتی ہے یا بیٹری سے اس کو چارج کیا جاتا ہے۔ چابی ختم ہو جائے یا بیٹری کے اندر توانائی ختم ہو جائے تو کھلونا حرکت نہیں کرتا۔ اس کے اندر سے آواز بھی نہیں نکلتی۔ بالکل یہی صورت انسان کی بھی ہے۔

جب تک اس کے اندر توانائی (روح) رہتی ہے۔ انسان کھلونے کی طرح ناچتا، کودتا، بولتا، سنتا، سوتا، جاگتا، سوچتا اور سمجھتا ہے لیکن جیسے ہی انسانی کھلونے کے اندر توانائی (چابی) ختم ہو جاتی ہے' اس کی اپنی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ توانائی ہو یا اس کا نام کھلونے میں چابی بھرنا ہو' یہ سب دراصل وسائل سے متعلق باتیں ہیں۔ ہر انسان کے پیدا ہونے سے پہلے قدرت اس کے لئے وسائل فراہم کر دیتی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ انسان پہلے پیدا ہو اور وسائل بعد میں تخلیق ہوں۔ یہ ایک قانون ہے جو لوح محفوظ پر تخلیقی باب میں لکھا ہوا ہے۔

کائناتی نظام ہر فرد پر نافذ ہے۔ اس قانون کے تحت میرے مرشد کریم حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب (حضور اباجی) کے لئے قدرت نے وسائل فراہم کئے۔ یہ ایک عجیب کہانی ہے جس کے پیچھے غور و فکر کی بے شمار مشعلیں روشن ہیں۔ حضرت عظیمی صاحب ہجرت کر کے 1947ء میں لاہور تشریف لائے۔ پہلی مرتبہ حضرت داتا علی ہجویری گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ کے مزار اقدس پر حاضری دی تو روح کا روح سے ملاپ ہوا اور کھلونے میں تفکر کی چابی بھر گئی۔

زمانے کے نشیب و فراز سے گزر کر تجارت میں اللہ نے ایک مقام عطا کیا۔ کاروباری کامیابی اور دولت کی چکا چوند نے تفکر کے ڈانڈے مادیت کے ساتھ جوڑ دیئے۔ حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ کا روحانی ملاپ پردے میں چلا گیا۔

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا

ناقصاں را پیر کامل کاملاں را راہنما

لیکن قدرت کا یہ چلن عام ہے کہ قدرت دیئے سے دیا جلاتی ہے اور دیئے سے دیا جلانے کے لئے پہلے سے وسائل فراہم کر دیئے جاتے ہیں۔

کاروباری ترقی نے مادی طور پر روحانی تفکر پر قبضہ کر لیا تو کھلونے میں چابی بھرنے کا عمل تبدیل کر دیا گیا۔ اب دائیں بائیں اور آگے دوڑنے والے کھلونے کی چابی (Reverse) ہو گئی جو تھا سب بھک سے اڑ گیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب سب تدبیریں ناکام ہو جاتی ہیں تو بندے ہماری طرف رجوع کرتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات خود فرمائی ہے اس لئے یہ قانون بن گیا ہے۔ کاروباری معاملات میں دوبارہ برکت حاصل کرنے کے لئے اللہ کے ولیوں کا سہارا تلاش کیا گیا۔ قدرت جب فیاض ہوتی ہے۔ وہ سب ہو جاتا ہے جس کا کبھی گمان بھی نہیں ہوتا۔

حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب گئے تو تھے دنیا لینے اور ایک مستغنٰی مزاج ہستی کی زلفوں کے اسیر ہو گئے۔ اب سب کچھ مرشد کی ذات تھی۔ حضرت عظیمی صاحب کے مرشد گرامی حضور قلندر بابا اولیاء 14 سال شب و روز کی دھڑکن اور آنکھوں کا نور بنتے ہیں۔

خدا کے دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال

آگ لینے کو جائیں تو پیغمبری مل جائے

پیغمبری تو ختم ہو چکی ہے۔ لیکن قلندر بابا اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کی نسبت سے پیغمبرانہ طرز فکر روح میں منتقل ہو گئی۔ اس پیغمبرانہ طرز فکر کو عام کرنے کے لئے دسمبر 1969ء سے اخبارات و جرائد میں کالم اور مضامین کا سلسلہ شروع ہوا۔ قدرت چونکہ خود اپنے

کاموں کے لئے بندوں کا انتخاب کرتی ہے۔اس لئے قدرت کو یہ سلسلہ پسند آیااوراس سلسلہ کوزیادہ سے زیادہ عام کرنے کے لئے وسائل فراہم کردیے گئے۔ان وسائل کے زیر اثر1978ء میں روحانی ڈائجسٹ کا اجراء ہوااور مضامین کی اشاعت میں اخبارات کی تنگ دامنی کا مسئلہ حل ہوا۔

میں مولف کتاب ''توجیہات'' میاں مشتاق احمد عظیمی نہایت حقیر زدہ ہوں لیکن قرآن یہ بتاتا ہے کہ کائنات کا چھوٹا سے چھوٹا ناقابل بیان زرہ بھی اللہ کے نور کے خلاف بند ہے۔ مجھ جیسے ناچیز زرہ بے مقدار جزاور مسکین بندے کے اوپر جو نور کا غلاف ہے اس پر ایک روز خزانے لوٹانے والے داتا کی نظر پڑ گئی اور میری روح کا ملاپ حضرت خواجہ عظیمی صاحب کی روح سے کرادیا گیا۔اس وقت میں سلوک کی کس منزل پر ہوں۔(سلوک میں تو منزل ہوتی ہی نہیں ہے۔)منزل رسیدہ نہیں بلکہ سلوک کے راستے کا ایک مسافر ہوں۔میں خود کو حاضر بھی نہیں دیکھتا۔سچی بات یہ ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ میں کیا ہوں۔جب خود سے سوال کرتا ہوں۔ایک ہی جواب ملتا ہے۔روح کے الگ الگ نام نہیں ہوتے' تو کچھ نہیں ہے۔تو مرشد کریم کی روح کا عکس ہے۔مرشد کریم کی روح کا عکس مجھے زندہ رکھے ہوئے ہے۔

مجھے دوڑاتا پھرتا ہے۔۔۔۔۔بات یہ ہے کہ جب میں کچھ نہیں ہوں' مرشد کی ذات ہی سب کچھ ہے تو میرا مشن ہی مرشد کی طرز فکر کو عوام کرنا ہے۔ کبھی کبھی میرے اوپر جنون طاری ہوجاتا ہے کہ مرشد کی روشنیاں عالمین میں منعکس کردوں۔یہ جنون مجھے ہر وقت بے قرار رکھتا ہے۔

مرشد کی طرز فکر کو توانائی میں تبدیل کر کے دنیا کے کھلونوں (انسان) میں منتقل کرنے کے لئے میں نے 1978ء سے اپریل 1994ء کی تحریروں کو ایک جگہ جمع کرنے کی ٹھان لی۔

مجھے اس سے کوئی غرض نہیں' مجھے اس ضمن میں کچھ نہیں کہنا کہ میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوا ہوں یا نہیں۔اس لئے کہ میں دیکھتا ہوں کہ سورج روز نکلتا ہے' سورج کبھی نہیں سوچتا کہ میری روشنی کہاں پڑتی ہے۔آبشاروں،ندی،نالوں اور پہاڑوں پر بھی پڑتی ہے۔سورج اس سے بے نیاز ہے کہ دھوپ کیچڑ کو بھی روشن کرتی ہے۔

منہ چھوٹااور بات بڑی ہے۔میں اپنے مرشد کی روح کا سورج ہوں۔میرا کام روشنی پھیلانا ہے اور یہ کام میں کرتا رہوں گا۔تاوقتیکہ میں خود روشنیوں میں تحلیل نہ ہو جاؤں۔

آخر میں میاں محمد بخش صاحب کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں:

ہکو سخن نہ ہور تمامی جو نعمت میں پائی

اوسے مرد سچے دا صدقہ اپنی نہیں کمائی

خشخش جتنا قدر نہ میرا اس نوں لبھے وڈیایاں

میں گلیاں دا روڑا کوڑا محل چڑھایا سایاں

میاں مشتاق احمد عظیمی

روحانی فرزند

حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی

مراقبہ ہال 158 مین بازار مزنگ، لاہور

تاریخ 7 جولائی 1994ء

باب اول

مراقبہ کیا ہے؟

سوال: مراقبہ کسے کہتے ہیں اور مراقبہ کی حقیقت کیا ہے؟ وضاحت فرمادیں۔

جواب: جب ہم کوئی علم سیکھتے ہیں یا کسی چیز کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہم ایک طریقہ اختیار کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اس چیز کو سمجھنے اور جاننے کے لئے تفکر کرتے ہیں اور ہمارے ذہن میں یہ تجسس پیدا ہوتا ہے کہ اس چیز کی اصلیت کیا ہے، یہ کیوں ہے اور کس لئے ہے۔ اگر چھوٹی سے چھوٹی بات میں تفکر کیا جائے تو اس چھوٹی سی بات کی بڑی اہمیت ہے اور اگر کسی بڑی سے بڑی بات پر غور و فکر نہ کیا جائے تو وہ بڑی بات غیر اہم اور فضول بن جاتی ہے۔ تفکر سے ہمیں کسی شئے کے بارے میں علم حاصل ہوتا ہے اور پھر تفکر کے ذریعہ اس علم میں جتنی گہرائی پیدا ہوتی ہے اسی مناسبت سے کسی چیز اور اس کی صفات سے ہم باخبر ہو جاتے ہیں۔

مراقبہ دراصل اس تفکر کا نام ہے جس سے انسان اس علم کو حاصل کر لیتا ہے جو اس کی اپنی انا، ذات، شخصیت یا روح کا علم ہے۔ یہ علم حاصل ہونے کے بعد کوئی انسان اپنی انا یا روح سے وقوف حاصل کر لیتا ہے۔

بظاہر مراقبہ کا عمل یوں لگتا ہے کہ کوئی شخص آنکھیں بند کر کے اور گردن جھکا کر بیٹھا ہوا ہے لیکن صرف آنکھیں بند کر کے اور گردن جھکا کر بیٹھنا مراقبہ کے مکمل مفہوم کو پورا نہیں کرتا۔ مراقبہ دراصل ایک طرز فکر ہے جس کے ذریعہ مراقبہ کرنے والا خود کو ظاہری حواس سے لاتعلق اور آزاد کر کے باطنی حواس میں سفر کرنے لگتا ہے۔

اب ہم یہ تلاش کریں گے کہ مراقبہ سے ملتی جلتی کیفیت مراقبہ کی مخصوص نشست کے بغیر بھی ہم میں موجود ہے یا نہیں۔

ظاہری حواس سے آزادی کی کیفیت ہماری زندگی میں ارادتاً یا غیر ارادی طور پر دونوں طرح ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً ہم سوتے ہیں۔ سونے کی حالت میں ہمارا دماغ ظاہری حواس سے تعلق منقطع کر لیتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ قطع تعلق عارضی ہوتا ہے لیکن اس کیفیت کو ظاہری حواس سے قطع تعلق کے علاوہ اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ مراقبہ دراصل نیند کو بیداری میں منتقل کرنے کا ذریعہ ہے۔

ہر انسان پیدائش سے موت تک دو کیفیات میں سفر کرتا ہے۔ یعنی انسانی دماغ میں ہر آن اور ہر لمحہ دو کیفیات متحرک رہتی ہیں۔ ایک کیفیت کا نام بیداری اور دوسری کیفیت کا نام نیند یا خواب ہے۔ بیداری کی حالت میں وہ زمان و مکاں میں مقید ہے لیکن خواب کی حالت میں زمان و مکاں کی گرفت سے آزاد ہو جاتا ہے مراقبہ کے ذریعہ خواب کو بیداری میں منتقل کر کے زمان و مکاں کی حد بندیوں سے آزادی حاصل کرنے کی مشق کی جاتی ہے۔ مراقبہ میں کم و بیش وہ تمام حالتیں انسان کے اوپر وارد ہو جاتی ہیں جس کے نتیجہ میں وہ سو جاتا ہے یا خواب دیکھتا ہے۔

یہ اعتراض کہ خواب کی حیثیت محض خیالی ہے صحیح نہیں ہے۔ تمام آسمانی کتابوں اور قرآن پاک میں خوابوں کا لامتناہی سلسلہ بیان ہوا ہے۔ قرآن شریف میں خوابوں کا ذکر واضح طور پر نشاندہی کرتا ہے کہ خواب کی دنیا زمان و مکاں سے آزاد ہوتی ہے۔ جب کوئی انسان مراقبہ کے ذریعہ خود کو خواب کی کیفیت میں منتقل کرتا ہے تو اس پر سے زمان و مکاں کی گرفت ٹوٹ جاتی ہے اور مشق کر کے وہ خواب کی کیفیات میں اسی طرح سفر کرتا ہے جس طرح کہ بیداری کی کیفیات اور واردات میں سفر کیا جاتا ہے۔ موجودات کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ اس کی کوئی بنیاد ہو' بنیاد کے بغیر کسی چیز کا قیام ممکن نہیں ہے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس میں ابہام ہو اور سمجھ میں نہ آتی ہو۔ مثلاً کرسی کی پہچان کا ذریعہ اس کے چار پیر ہیں۔ کوئی مکان اس وقت مکان ہے جب زمین کے ایک مخصوص رقبہ پر بنیاد قائم کر کے ان بنیادوں پر دیواریں تعمیر کی جائیں۔ ہم کسی علم کو اس وقت سیکھ سکتے ہیں جب ہمیں اس کے فارمولے معلوم ہوں۔ اور یہ فارمولے ہی اس علم کی بنیاد قرار پاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد کیا ہے۔ ''اللہ نور السمٰوٰت والارض'' یعنی۔۔۔ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کائنات اور کائنات کے اندر بے شمار عالم اور کہکشانی نظام ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی حیثیت اور حکمت کیا ہے یہ بات اللہ تعالیٰ جانتے ہیں یا وہ مقربین جانتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے خود بتا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کے تخلیقی فارمولے اپنے مقربین کو کس حد تک اور کتنے بتائے ہیں یہ بات زیر بحث نہیں ہے۔ بہر کیف ہم اتنا جانتے ہیں کہ ساری کائنات اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے تخلیق کی ہے اور اس کا تذکرہ بارہا قرآن پاک میں کیا گیا ہے۔ کائنات کی بنیاد پر اللہ کا نور ہے۔ کائنات کے قیام کی بنیاد کے پیش نظر یہ بات لازم اور ضروری ہو گئی ہے کہ انسان خود اور انسان کے اندر کام کرنے والی تمام صلاحیتیں ایک بنیاد اور ایک مرکز پر قائم ہوں۔

ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ ہماری تمام حرکات و سکنات، توہمات، خیالات، تصورات اور احساسات گوشت پوست کے ڈھانچہ کے تابع نہیں ہیں۔ کیونکہ جب جسم انسانی سے روح اپنا رشتہ منقطع کر لیتی ہے تو گوشت پوست کے جسم میں کوئی حرکت واقع نہیں ہوتی۔ جب تک روح جسم کے ساتھ موجود ہے زندگی کے تمام تقاضے اور زندگی میں کام آنے والی سب تحریکات موجود ہوتی ہیں یعنی جسم انسانی کی بنیاد روح ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق روح کا علم قلیل دیا گیا ہے لیکن محل نظر یہ بات ہے کہ قلیل بھی تو ایک علم ہی ہے۔ واضح یہ کرنا ہے کہ لا محدود علم کے جاننے والوں نے اس کو سمجھنے کے لئے چند فارمولے بنائے ہیں اور ان فارمولوں کے اندر رہتے ہوئے اپنے شاگردوں کو اس سے روشناس کرایا ہے اگر اس پر روشنی ڈالی جائے کہ یہ علم کہاں سے شروع ہوا اور یہ فارمولے کس کس طرح ارتقاء پذیر ہوئے تو بات طویل ہو جائے گی۔ دراصل ہم بتانا یہ چاہتے ہیں کہ انسان فی الواقع وہ نہیں ہے جسے ہم انسان کہتے یا سمجھتے ہیں۔ ہم گوشت پوست اور ہڈیوں کے پنجر کو آدمی کہتے ہیں، جبکہ یہ سب مفروضہ ہے۔ دراصل انسان وہ ہے جو اس گوشت پوست کے جسم کی حفاظت کرتا ہے اور اسے متحرک رکھتا ہے جس کو قرآن پاک نے روح کا نام دیا ہے۔ ہر انسان اس بات سے واقف ہے کہ اس کی زندگی کا دار و مدار گوشت پوست کے جسم پر نہیں ہے اور وہ زندگی میں دو باتوں کا تجربہ ضرور کرتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ اپنے پورے شعوری حواس میں ہے اور زندگی رواں دواں ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ سو جاتا ہے لیکن سانس کی آمد و شد کے ساتھ زندگی کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔ انہی دو حالتوں میں وہ زندگی گزارتا ہے۔ سونے کی حالت میں اس کا رشتہ گوشت پوست کے جسم سے غیر شعوری رہ جاتا ہے۔

ان دو حالتوں کے علاوہ تیسری حالت جو ہر انسان پر وارد ہوتی ہے وہ موت ہے۔ موت ایسی حالت ہے کہ جس میں روح اس خاکی جسم سے رشتہ منقطع کر لیتی ہے اس گفتگو کا حاصل یہ ہوا کہ انسان کے اوپر تین حالتیں وارد ہوتی ہیں۔ ایک بیداری، دوسری نیند اور تیسری موت۔ بیداری اور نیند میں قدر مشترک یہ ہے کہ نیند میں جسم سے روح کا واسطہ براہ راست ہوتا ہے اور بیداری میں بالواسطہ، یعنی شعور کی معرفت اور موت میں روح اس جسم سے اپنا رشتہ توڑ لیتی ہے۔ بات وہی ہے کہ زندگی کا قیام روح پر ہے ور جسمانی تقاضے جن بنیادوں پر قائم ہیں وہ روح کی تحریکات ہیں۔

روح زندگی کے تقاضے پورے کرنے کے لئے اپنا ایک میڈیم بناتی ہے اس میڈیم کو ہم کروموسوم کا نام دے سکتے ہیں۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''ہم نے اس میں اپنی روح پھونک دی'' یعنی روح نے اپنے لئے ایک میڈیم بنالیا۔ اور اس میڈیم کو پروان چڑھا کر اسے حواس بخش دیئے۔

روح دراصل اللہ تعالیٰ کا ایک جزو ہے اور اس جزو میں اللہ کی وہ تمام مشیت اور وہ تمام اوصاف جس کا علم اللہ نے ودیعت کرنا پسند فرمایا اس میں موجود ہے۔ یہ علم جزو کو کس طرح حاصل ہوا یہ اللہ تعالیٰ کا ایک راز ہے جس کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔

انسان کے اندر تقریباً ساڑھے گیارہ ہزار لطیفے (جنریٹر) کام کرتے ہیں۔ صوفیائے کرام سے جن اسمائے الٰہیہ کا انکشاف ہوا ہے ان کی تعداد بھی تقریباً ساڑھے گیارہ ہزار ہے۔ اللہ کا ہر اسم اللہ کی ایک صفت ہے اور اللہ کی ہر صفت ایک علم ہے اور یہی علم شاخ در شاخ لامحدود دائروں میں پھیل کر اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر بن جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

''تمام سمندروں کا پانی روشنائی بن جائے اور سارے درخت قلم بن جائیں پھر بھی اللہ کی باتیں پوری نہیں ہونگی۔''

غیب کے عالم میں داخل ہونا یا زمان و مکاں سے ماوراء کسی چیز کو دیکھنا اس وقت ممکن ہے جب آدمی خود زمان و مکاں سے آزاد ہو جائے۔ زمان و مکاں سے آزاد ہونا اس وقت ممکن ہے جب کہ زمان و مکاں کو دیکھنے والی نظر زمان و مکاں کی حد بندیوں سے آزاد ہو جائے۔ زمان و مکاں سے آزاد نظر کو متحرک کرنے کے لئے ایسے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں جن سے انسانی ذہن اگر پوری طرح آزاد نہ ہو تو ایسی صورتحال ضرور پیدا ہو جائے کہ وہ آزادی سے قریب تر ہو جائے۔

اب یہ تلاش کرنا ضروری ہو گیا کہ آدمی کے حواس زمان و مکاں کی گرفت سے کب اور کس طرح آزاد ہوتے ہیں۔ اس کی ایک صورت ہمارے اوپر خواب کی کیفیت کا مسلط ہو جانا ہے۔ سونے کا مطلب دراصل بیداری کے حواس یعنی زمان و مکاں کے تسلط سے آزادی ہے۔ جب ہم سو جاتے ہیں تو بیداری کے حواس وہاں منتقل ہو جاتے ہیں جہاں زمان و مکاں کی کیفیت تو موجود ہے لیکن فی الواقع لمحات کے وہ ٹکڑے موجود نہیں ہیں جن میں ہم لحظہ بہ لحظہ زندگی گزارتے ہیں۔ دوسری صورت جو بیداری میں واقع ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کا ذہن پوری یکسوئی کے ساتھ کسی ایک نقطہ پر مرکوز ہو جائے۔ مثلاً ہم کسی کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں اور وہ کتاب ہمارے لئے اتنی دلچسپی رکھتی ہے کہ ہم ماحول سے بے خبر ہو جاتے ہیں تو بھی زمان و مکاں کسی حد تک ہمارے ذہن سے نکل جاتے ہیں۔ اور جب ہم کتاب رکھ کر یہ دیکھتے ہیں کہ کئی گھنٹے گزر گئے اور وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تو بڑی حیرت ہوتی ہے کہ اتنا طویل وقفہ گزر گیا۔

قرآن پاک میں جہاں حضرت موسیٰ کو زمان و مکاں سے ماوراء انکشافات یعنی تورات عطا فرمانے کا ذکر ہے وہاں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

''ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور چالیس راتوں میں اسے پورا کر دیا۔''

رات اور دن کے بارے میں اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں:

''ہم داخل کرتے ہیں رات کو دن میں اور داخل کرتے ہیں دن کو رات میں۔''

دوسری جگہ ارشاد ہے:

''ہم نکالتے ہیں رات کو دن میں سے اور ہر نکالتے ہیں دن کو رات میں سے۔''

تیسری جگہ ارشاد ہے:

''ہم ادھیڑ لیتے ہیں رات پر سے دن کو اور دن پر سے رات کو۔۔۔۔۔''

اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات میں تفکر کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ رات دن دو حواس ہیں۔ اب ہم اس بات کو یوں کہیں گے کہ ہماری زندگی دو حواس میں منقسم ہے یا ہماری زندگی دو حواس میں سفر کرتی ہے۔ ایک حواس کا نام دن ہے اور دوسرے کا رات۔ دن کے حواس میں ہمارے اوپر زمان و مکاں کی جکڑ بندیاں مسلط ہیں اور رات کے حواس میں ہم زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ ''ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور چالیس راتوں میں اسے پورا کر دیا۔'' بہت زیادہ فکر طلب ہے کیونکہ حضرت موسیٰ کوہ طور پر صرف چالیس راتیں نہیں رہے بلکہ آپ کا قیام وہاں چالیس دن اور چالیس راتیں رہا۔ ایسا بھی نہیں ہوا کہ وہ دن کے وقت کوہ طور سے نیچے آ جاتے ہوں اور رات کے وقت دوبارہ تشریف لے جاتے ہوں۔ وہ مسلسل چالیس دن اور چالیس راتیں کوہ طور پر قیام فرما رہے۔ فکر طلب بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دن کا تذکرہ نہیں کرتے بلکہ صرف رات کا ذکر کرتے ہیں۔

اس کا مطلب واضح ہے کہ حضرت موسیٰ پر چالیس دن اور چالیس راتیں، رات کے حواس غالب رہے۔ وہی رات کے حواس جو زمان و مکاں سے کسی انسان کو آزاد کر دیتے ہیں۔

قانون یہ بنا کہ اگر کوئی انسان اپنے اوپر رات اور دن کے وقفے میں رات کے حواس غالب کر لے تو وہ زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے اور زمان و مکاں سے آزادی دراصل غیبی انکشافات کا ذریعہ ہے۔

قرآن پاک اس پروگرام اور اس عمل کا نام۔ ''قیام الصلوٰۃ'' رکھتا ہے جس کے ذریعے دن کے حواس سے آزادی حاصل کر کے رات کے حواس میں سفر کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ نماز قائم کرنے کا لازمی نتیجہ دن کے حواس کی نفی اور رات کے حواس میں مرکزیت، حاصل ہونا ہے۔ نماز کے ساتھ لفظ ''قائم کرنا'' اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔ اگر کوئی نماز اپنی اس بنیادی شرط کو پورا نہیں کرتی کہ وہ کسی شخص کو رات کے حواس سے متعارف کرا دے تو وہ حقیقی نماز نہیں ہے۔ اس سلسلے میں حضرت علیؓ کا ایک مشہور واقعہ سامنے لانا بھی قیام الصلوٰۃ کی تشریح اور وضاحت میں معاون ثابت ہوگا۔

کسی جنگ میں دشمن کا ایک تیر حضرت علیؓ کی پشت میں پیوست ہو گیا۔ جب اس تیز کو نکالنے کی کوشش کی گئی تو حضرت علیؓ نے تکلیف محسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ ''میں نماز قائم کرتا ہوں۔'' حضرت علیؓ نے نیت باندھی لوگوں نے تیر کو نکال لیا اور مرہم پٹی کر دی۔ لیکن حضرت علیؑ کو اس بات کا احساس تک نہ ہوا کہ تیر نکال کر مرہم پٹی کر دی گئی ہے۔

اس واقعہ سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قیام نماز میں ان حواس کی نفی ہو جاتی ہے جن میں تکلیف اور پابندی موجود ہے۔ حضرت علیؓ نے جب نماز کی نیت باندھی تو وہ دن کے حواس سے نکل کر رات کے حواس میں پہنچ گئے۔ اور جیسے ہی ان کا ذہن رات کے حواس میں مرکوز ہوا۔ ان کی توجہ دن کے حواس (پابندی اور تکلیف) سے ہٹ گئی۔

روحانیت کی بنیاد اس حقیقت پر قائم ہے کہ انسان میں دو حواس، دو دماغ اور دو زندگیاں سر گرم عمل ہیں۔ جیسے ایک ورق کے دو صفحات۔ یعنی دو رخ دو زندگیوں میں سے ایک کا نام پابندی ہے اور دوسری زندگی کا نام آزادی۔ پابند زندگی دن، بیداری اور شعور ہے جبکہ آزاد زندگی کا دوسرا نام، رات، سکون اور اطمینان قلب ہے۔

اس زندگی کو حاصل کرنے کے لئے روحانیت میں ایک بہت آسان طریقہ مراقبہ ہے۔ مراقبہ دراصل ایک مشق، کوشش اور طرز فکر کا نام ہے جس کے ذریعہ کوئی روحانی کام کرنا ہے، کام ذہن انسانی پر بالکل اسی طرح وارد ہوتا ہے۔ اب اس اطلاع پر انسان اپنا ذاتی ارادہ استعمال کرتا ہے یہ ارادہ صعود کر کے لوح دوئم میں لوح محفوظ کے اس پروگرام کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے۔ لوح دوئم سے یہ مخلوط نشریہ دوبارہ نزول کر کے انسانی ذہن پر وارد ہوتا ہے اور وہ اس کام کو سر کر لیتا ہے۔ یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ لوح محفوظ سے نازل ہونے والے کسی پروگرام کے پورا ہونے کا دارومدار اگر انسانی ارادوں پر ہے تو انسان لوح محفوظ کا تابع نہیں ہوا بلکہ لوح محفوظ کا پروگرام انسان کا تابع ہوا۔ بات دراصل یہ ہے کہ لوح محفوظ کی نشریات میں یہ بات بھی شامل ہوتی ہے کہ انسان کو نیت اور ارادہ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ اس کی مزید تشریح یہ ہے کہ لوح محفوظ پوری کائنات بشمول فرشتے، جنات، سیارے، کہکشانی نظام، ہماری حرکات و سکنات اور ہماری پوری زندگی کی ریکارڈ ہے۔ یہ پوری کائنات نشر ہو کر جب لوح دوئم کی سکرین پر آتی ہے تو یہاں ایک اور فلم بن جاتی ہے اور جب یہ فلم نشر ہوتی ہے تو کائنات میں موجود ہر تخلیق الگ الگ ہو جاتی ہے۔ یعنی کہکشانی نظام الگ، نوع جنات الگ، نوع ملائکہ الگ، نوع انسان الگ، نوع نباتات الگ اور نوع حیوانات الگ خدوخال میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہ بات بہت ہی عجیب ہے کہ کائنات کی ہر تخلیق ایک دوسرے سے مخفی رشتہ کے ساتھ منسلک ہے یعنی جس طرح انسان کے اندر پوری کائنات موجود ہے اسی طرح فرشتہ کے اندر پوری کائنات موجود ہے اور بکری اور کبوتر کے اندر بھی پوری کائنات موجود ہے۔ اگر کائنات کی موجودگی اس طرح نہ ہو تو کوئی فرد دوسرے فرد کو پہچان نہیں سکتا۔ ہم ستاروں کو اس لئے پہچانتے ہیں کہ ستاروں سے ہمارا ایک مخفی رشتہ ہے۔ ان دیکھی مخلوق، ملائکہ اور جنات کا یقین کرنے پر ہم اس لئے مجبور ہیں کہ ان کا تشخص اور تمثیل ہمارے اندر موجود ہے۔ کوئی صاحب اگر یہ اعتراض کرے کہ ایک مکتبہ فکر جنات کو مانتا ہی نہیں ہے تو اس بات سے کوئی

فرق نہیں پڑتا۔اس لئے کہ انکار بجائے خود اس بات کا اقرار ہے کہ کوئی چیز موجود ہے۔اگر کسی چیز کا وجود ہی نہیں تو انکار یا اقرار دونوں ہی زیر بحث نہیں آتے۔

واضح یہ کرنا ہے کہ انسان کے اندر پوری کائنات تو موجود ہے لیکن چونکہ وہ اس بات سے واقف نہیں کہ وہ کائنات کا ایک حصہ ہے یا پوری کائنات کے اجزائے ترکیبی میں سے ایک جزو ہے اس لئے وہ اس بات کا مشاہدہ نہیں کر پاتا۔

شیخ یا مراد اس بات کو جانتا ہے کہ مرید کائنات کا ایک جزو ہے اور کائنات میں موجود ہر تخلیق کے ساتھ اس کا قریبی رشتہ قائم ہے۔ مراد' مرید کی شعوری صلاحیت کے پیش نظر ایسا پروگرام ترتیب دیتا ہے جس پر قدم بہ قدم مرید کو چلا کر اس بات سے واقف کر دیتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے تخلیقی کنبے کا ایک فرد ہے اور اس کا اس کے ساتھ ربط وضبط' اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا' محسوس کرنا' دیکھنا' سننا اور سمجھنا سب مشترک ہے۔یعنی تخلیقی اجزاء میں سے وہ ایک جزو ہے اور ظاہر ہے کہ اجزاء میں سے ایک جزو کو الگ کر دیا جائے تو تخلیق نامکمل رہ جاتی ہے۔

کہنا یہ ہے کہ کائنات میں موجود ہر مخلوق ایک دوسرے سے رشتہ رکھتی ہے اور ایک دوسرے کو پہچانتی ہے۔ جاننا اور پہچاننا اس وقت ممکن ہے جب جاننے اور پہچاننے کی صلاحیت موجود ہو اور صلاحیت کا پیدا ہونا اس وقت ممکن ہے جب صاحب صلاحیت کی طرف سے جاننے اور پہچاننے کی صلاحیت منتقل ہو۔ صاحب صلاحیت دراصل اللہ تعالیٰ ہیں اور اللہ تعالیٰ کی صفات ہی سننے، دیکھنے، سمجھنے اور پہچاننے کا ذریعہ بنتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کا ایک کنبہ بنایا اور اس کنبے میں کھربوں کہکشانی نظام اور ان نظاموں میں سنکھوں نوعیں اور ان نوعوں میں انسانی شماریات سے باہر مخلوقات پیدا کیں اور ان کے اندر سوچنے سمجھنے اور زندہ رہنے کی تحریکات عطا کیں۔اصل میں پہچان کا ذریعہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور وہ اس لئے کہ تمام مخلوقات جدا جدا ہیں اور ان کا پیدا کرنے والا یکتا و واحد خدا ہے۔

صاحب خدمت

سوال: صاحب خدمت کسے کہتے ہیں اور یہ کس قانون کے تحت کام کرتا ہے؟ روحانی طور پر بتائیں۔

جواب: یہ بات اس لئے ذہن میں آتی ہے کہ ہم زندگی کو شعوری پیمانوں سے ناپتے ہیں۔ مثلاً ہر آدمی کے ذہن میں یہ بات ہے کہ میں پیدا ہوا اور میری پیدائش کا ذریعہ والدین بنے۔ علیٰ ہذالقیاس ہر مخلوق کے بارے میں اس کا شعوری مشاہدہ یہی ہے۔ لیکن اگر کوئی انسان شعوری حواس یعنی شک و شبہ اور بے یقینی کی دنیا سے آزاد ہو کر یقین کی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے اور وہاں اس کے سامنے یہ بات آجاتی ہے کہ وہ اور تمام مخلوقات کو ایک ہستی نے بنایا ہے تو یہ بات اس کے ذہن سے حذف ہو جاتی ہے۔ یعنی اس لایعنی بات کا خانہ ہی ختم ہو جاتا ہے اور جب اس بات سے کہ خدا کو کس نے بنایا ہے' ذہن آزاد ہو جاتا ہے تو اس کی طرز فکر یہ بن جاتی ہے کہ وہ ہر بات اور ہر چیز کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھتا ہے اور اللہ ہی کی طرف موڑ دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے:

والراسخون فی العلم یقولون امنا بہ کل من عند ربنا۔

"وہ لوگ جو راسخ فی العلم ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں ہمارا ایمان ہے اور اس بات پر یقین ہے کہ ہر چیز ہمارے رب کی طرف سے ہے۔" جتنے پیغمبر علیہم الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے ان سب کی طرز فکر یہی رہی کہ ہمارا بشمول کائنات اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک رشتہ براہ راست قائم ہے اور یہ رشتہ ہی کائنات کو جاری و ساری رکھے ہوئے ہے۔ پیغمبروں کی تعلیمات بھی یہی رہیں کہ بندے کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو جائے کہ بندہ ذات باری تعالیٰ کے رشتہ کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ یعنی اللہ تعالیٰ جو کچھ' جس طرح اور جب کرنا چاہتے ہیں وہی انسان کا عمل بنتا ہے۔ پیغمبران علیہم الصلوٰۃ والسلام نے اسی طرز فکر میں ایک اور طرز فکر شامل کی اور وہ یہ کہ انہوں نے اچھائی اور برائی کا تصور اس لئے ظاہر فرمایا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ یہی چاہتے ہیں۔ اگر اچھائی اور برائی کا تصور نہ ہوتا تو اختیارات' نیکی اور بدی ناقابل تذکرہ ہو جاتے۔ اس بات سے کوئی آدمی انکار کی بحال نہیں رکھتا کہ شیطان کو بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا۔ کہنا یہ ہے کہ شیطان اور شر کو ہم اللہ تعالیٰ کی تخلیق سے جدا نہیں کر سکتے۔ لیکن شیطان زندگی کا ایک ایسا رخ ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے ناپسندیدہ ہے اور شیطنت کے برعکس اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجاآوری اللہ تعالیٰ کے لئے پسندیدہ عمل ہے۔ لیکن جو لوگ تخلیق کے اس رخ سے واقف ہیں اور جن کا ایمان، یقین اور مشاہدہ یہ ہو جاتا ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو وہ یہ بات بھی

سمجھ لیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ عمل کیا ہے اور جب وہ اللہ تعالیٰ کی پسندیدگی کو اپنی زندگی بنا لیتے ہیں تو ان کے اندر سے شر نکل جاتا ہے۔ بالالفاظ دیگر شیطان ان پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتا۔

حضرت رابعہ بصریؒ سے کسی نے سوال کیا آپ نے شادی نہیں کی کیا آپ کو شیطان سے ڈر نہیں لگتا؟ حضرت صاحبہؒ نے فرمایا۔ ''مجھے رحمان سے ہی فرصت نہیں۔'' جب رحمان سے ہی فرصت نہیں تو شیطان کا خیال ہی نہیں آتا۔ اسی بات کو خواجہ غریب نوازؒ نے یوں فرمایا۔ ''یار دم بہ دم و بار باری آید۔'' حضور غریب نوازؒ فرماتے ہیں۔ ''میری ہر سانس میں اللہ بسا ہوا ہے اور میرا ہر سانس اللہ کے ساتھ وابستہ ہے۔'' ظاہر ہے کہ جب ہر سانس کی وابستگی براہ راست اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہو تو وہاں شیطان کا عمل دخل نہیں ہو سکتا۔ بات مشکل ہے لیکن واقعتاً ایسا ہوتا ہے کہ ایسے برگزیدہ اور پاک نفس بندے موجود ہوتے ہیں جن کے ذہن سے شر کا خانہ نکل جاتا ہے۔ اور جب شر کا خانہ نکل جاتا ہے تو خیر کا خانہ بھی حذف ہو جاتا ہے۔ شر اور خیر دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے روشنی اور تاریکی، گرم و سرد، تلخ و شیریں، راحت اور تکلیف، خوشی اور غم، غصہ اور محبت وغیرہ لازم و ملزوم ہیں۔ بظاہر یہ بات خلاف عقل اور خلاف شرع معلوم ہوتی ہے لیکن ایسا ہے۔ یہ وہ پاکیزہ نفوس ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہمارے بندے ایسے بھی ہیں جو ہماری آنکھوں سے دیکھتے ہیں' ہماری زبان سے بولتے ہیں اور ہمارے ہاتھوں سے کام کرتے ہیں۔ ان بندوں کی طرز فکر میں یہ بات یقین کا درجہ حاصل کر لیتی ہے کہ ہماری حیثیت ایک معمول کی سی ہے اور ہم اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہیں۔ مشیت جو چاہتی ہے اور جیسا حکم دیتی ہے وہی ہوتا ہے۔ اگر مشیت یہ چاہتی ہے کہ کسی زمین پر آباد بستی کو ختم کر دیا جائے تو ایسے بندے کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی کہ یہ قتل عام ہے۔ بس اس کے ذہن میں ایک ہی بات آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہے کہ زمین کا تختہ الٹ دیا جائے۔ یہ تعریف ہے ان لوگوں کی جن کو صاحب خدمت کہا جاتا ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جن کے اندر اچھائی برائی کا تصور ہے اور وہ اچھائی کو اس لئے اختیار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو پسند کرتے ہیں اور برائی سے اس لئے بچتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ عمل ہے۔ خاتم النبیین حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے فکر کی دونوں طرزیں ان کی امت کو منتقل ہوئی ہیں۔

علم کے بارے میں گفتگو کے دوران حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا۔ مجھے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے علم کے دو لفظ ملے ہیں۔ ایک کو میں نے ظاہر کر دیا اور دوسرے کو چھپا لیا۔ لوگوں نے پوچھا کیا علم بھی چھپانے کی چیز ہے' آپ نے اس کو کیوں ظاہر نہیں کیا؟ حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ میں اگر وہ لفظ ظاہر کر دوں تو تم لوگ مجھے قتل کر دو گے۔

اب ہم یوں کہیں گے کہ حضرت موسیٰ کو علم کا وہ لفظ جس کو شریعت کہتے ہیں' حاصل تھا اور بندے کے پاس وہ علم تھا جسے تکوین یا خدمت کا علم کہا جاتا ہے۔ صاحب خدمت حضرات اللہ تعالیٰ کے معاملات میں اپنا ذاتی اختیار استعمال نہیں کرتے جبکہ شریعت کے قوانین کے تحت زندگی بسر کرنے والے حضرات اس بات پر مجبور ہیں کہ وہ اپنا اختیار استعمال کریں۔ یہ بات صرف طرز فکر کی

ہے۔راستے دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین ہیں۔ایک راستے پر طرز فکر آزاد ہے اور دوسرے راستے پر پابند۔پابند طرز فکر کی تعریف یہ ہے کہ یہ روح کی اطلاعات کو اس طرح قبول کرتی ہے کہ وہ اپنا اختیار استعمال کرے۔۔۔۔۔۔نیکی استعمال کرے یا بدی۔آزاد طرز فکر وہ ہے جو روح کی اطلاعات کو براہ راست قبول کرتی ہے۔اس کے سامنے ایسا ویسا' چوں چرا نہیں ہوتا۔بس یہ بات ہوتی ہے کہ ایسا ہے اور ایسا نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ اگر رات کے لئے یہ فرمادیں کہ یہ دن ہے تو آزاد طرز فکر میں یہ بات آتی ہی نہیں ہے کہ یہ رات ہے۔دنیا کے چار ارب انسان بھی یہ کہیں گے کہ رات ہے تو وہ اکیلا شخص یہی کہے گا کہ دن ہے۔اس کا یہ کہنا صرف کہنے کی حد تک نہیں ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے بعد رات اس کے مشاہدے میں دن بن جائے گی اور اس کے تمام حواس وہی بن جائیں گے جو دن کے حواس ہیں۔

یہاں ایک نکتہ پوشیدہ ہے اور وہ یہ کہ رات اور دن اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہیں۔جب اللہ تعالیٰ نے رات کو دن فرمایا تو تخلیقی فارمولے بدل گئے لیکن چونکہ ایک مخصوص شخص کے لئے فرمایا اس لئے صرف اس کے لئے اس فارمولے میں تبدیلی واقع ہوئی۔رات اور دن دراصل ایک ہی تخلیق یا ایک ہی ایونٹ کے دورخ ہیں۔ایک رخ کا نام رات اور دوسرے کا دن۔یہ دونوں چیزیں الگ الگ نہیں ہیں۔اسی بات کو قرآن پاک میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

"ہم نکال لیتے ہیں رات میں سے دن کو اور نکال لیتے ہیں دن میں سے رات کو۔۔۔۔۔۔"

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

"ہم رات پر سے دن کو ادھیڑ لیتے ہیں اور دن پر سے رات کو۔"

دراصل دن اور رات دو حواس ہیں۔وہی حواس یا طرز فکر جس کا ابھی ہم نے تذکرہ کیا ہے۔رات کے حواس آزاد طرز فکر ہیں اور دن کے حواس پابند طرز فکر۔دن کے حواس وہ زندگی ہیں جہاں انسان اپنے ذاتی اختیارات استعمال کر کے زندگی بسر کرتا ہے اور رات کے حواس وہ طرز فکر ہیں جہاں انسانی اختیارات زیر بحث نہیں آتے۔

کوئی فرد دن کے حواس میں اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل نہیں کر سکتا۔اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل کرنے یا غیب کی دنیا میں داخل ہونے کے لئے ہر حال میں رات کے حواس کا سہارا لینا پڑتا ہے۔جب رات کے حواس دنیا کے حواس پر غالب آجاتے ہیں تو یہ طرز فکر انسان کو اللہ تعالیٰ سے قریب کر دیتی ہے۔انسان اللہ تعالیٰ کی ان تجلیات کا مشاہدہ کر لیتا ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔"میں تمہاری رگ جاں سے بھی قریب ہوں۔" شریعت کے قوانین پر عمل کرنے والے بندوں کی کوششوں کا رخ اسی طرف ہوتا ہے کہ انہیں آزاد طرز فکر یا رات کے حواس نصیب ہو جائیں۔جس حد تک وہ اس کوشش میں کامیاب ہوتے ہیں ان کی طرز فکر آزاد ہوتی جاتی ہے لیکن چونکہ وہ اختیارات کی حد بندیوں میں جکڑے ہوتے ہیں اس لئے آزاد طرز فکر یا رات کے حواس

میں بھی یہ حد بندیاں قائم رہتی ہیں اور انہیں حد بندیوں کی وجہ سے وہ اپنی عبادت اور ریاضت کا ماحصل جنت یا دوزخ سے نہیں سمجھتے ہیں۔

عقل و شعور

سوال: تصوف میں اس بات پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے کہ پیر و مرشد کے حکم پر بلا چون وچرا سر تسلیم خم کر دینا چاہئے اور اس کے ہر حکم کی تعمیل ہر حال میں مرید پر ضروری ہے۔ یہاں یہ اعتراض بھی وارد ہوتا ہے کہ شیخ اگر کوئی ایسا حکم دے جو عقل و شعور کے منافی ہو تو کیا اس کی بھی تعمیل کرنا ضروری ہے؟

جواب: جب کوئی بچہ استاد کی شاگردی میں آتا ہے تو استاد کہتا ہے ''کہو الف۔ بے۔ ج۔ وغیرہ'' اور شاگرد بلا چون وچرا استاد کی بات مان کر الف۔ ب۔ ج۔ پڑھ دیتا ہے۔ اگرچہ وہ الف۔ ب۔ ج۔ کہہ دیتا ہے لیکن اس کو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ الف۔ ب۔ ج۔ کیا ہے۔ استاد جو کچھ کہتا ہے وہ اسے مانتا چلا جاتا ہے دوسرے الفاظ میں استاد کے حکم کی تعمیل اسے علم کی منازل طے کراتی ہے۔ اگر کوئی شاگرد اپنا شعوری فہم بیچ میں لا کے الف۔ ب۔ ج، کو قبول کرنے سے انکار کر دے تو وہ کوئی علم نہیں سیکھ سکتا۔

یہی حال مادری زبان کا ہے۔ بچہ جب ماحول میں چیزوں کے نام اور الفاظ اپنے والدین اور دوسرے افراد سے سنتا ہے۔ تو ان میں معانی پہنائے بغیر انہیں قبول کر لیتا ہے۔ پانی کے لئے جب پانی کا لفظ سنتا ہے تو پانی کہہ دیتا ہے اور آگ کے لئے آگ سنتا ہے تو آگ کہہ دیتا ہے۔ اسی طرح پیدائش کے بعد انسان کا کوئی نہ کوئی نام ضرور رکھا جاتا ہے نہ صرف یہ کہ بچہ اس نام پر یقین رکھتا ہے اور قبول کر لیتا ہے بلکہ اس کے اطراف کا پورا ماحول اس بات پر بغیر سوچے سمجھے یقین رکھتا ہے۔

جب کوئی شخص روحانیت کا سفر اختیار کرتا ہے اور کسی روحانی استاد (مراد) کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے تو اس کی حیثیت روحانیت میں ایک بچے سے زیادہ نہیں ہوتی کیونکہ وہ روحانیت کی الف۔ ب سے بھی واقف نہیں ہوتا۔

روحانی استاد کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے شاگرد (مرید) کی ذہنی صلاحیتوں اور شعوری سکت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کو قدم بہ قدم چلا کر اس پر غیب منکشف کر دے۔ اس راستے میں مرید کی انا، شعوری واردات و کیفیات، ماحول اور آباؤ اجداد سے ملی ہوئی پابندی، روایتی ربط وضبط وغیرہ رکاوٹ بنتے ہیں اور روحانی سفر میں شدت سے مزاحم ہوتے ہیں۔ جب تک ان کو ذہن سے کھرچ کر پھینک نہ دیا جائے۔ کوئی شخص روحانیت کی سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتا۔ اب یہ رکاوٹیں کیسے دور کی جائیں؟ ذاتی طور پر یہ صفائی کبھی نہیں ہو سکتی۔ مرید کے لئے مراد یہ بات جانتا ہے کہ اس کے ذہن کی صفائی کس طرح کی جائے۔

ان ہی وجوہات کی بناپر مرید کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک بچے کی طرح سمجھے اور جس طرح بچہ استاد کی بات مان کر الف کو الف اور ب کو ب کہہ دیتا ہے اسی طرح مراد کا ہر حکم اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کو بلا حیل و حجت تسلیم کر لیا جائے۔ اگر اس کے بتائے ہوئے احکامات پر ذہن استعمال کیا جائے گا تو کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ ذہنی صلاحیت بھی ضائع ہو گی اور ذہن آگے کے سفر پر ہر گز تیار نہیں ہو گا۔ جس طرح ایک بچہ استاد کی کہی ہوئی بات کو عقل و شعور بیچ میں لائے بغیر قبول کر لیتا ہے تب کہیں جا کر اگلے علوم حاصل کرتا ہے۔ روحانیت میں بھی ایک مرید کے لئے ضروری ہے کہ وہی طرز عمل اختیار کرے۔

اس سلسلے میں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کا ایک واقعہ بیان کرنا ضروری ہے۔ حضرت کے ایک خاص مرید تھے' انہیں جب بھی موقع ملتا درخواست کرتے:

''حضور! بہت لوگوں نے آپ سے فیض پایا ہے لیکن صاحبزادے (شیخ کے بیٹے) ابھی تک محروم ہیں۔ انہیں بھی نواز دیجئے۔''

وہ ایک عرصے سے درخواست کرتے رہے لیکن شیخ ان کی بات کو ٹالتے رہے۔ ایک روز انہوں نے ایسے وقت درخواست کی جب شیخ عالم استغراق میں تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ شیخ راضی نظر آرہے ہیں تو دوڑ کر صاحبزادے کو بلایا اور کہا۔ ''خاموشی سے بیٹھ کر ابا جی کے پیر دباؤ۔''

بیٹے نے ایک طرف بیٹھ کر پیر دبانا شروع کیا۔ اس دوران حضرت شیخ نے اپنا ایک پیر ان کے سینے پر پھیرنا شروع کر دیا۔ صاحبزادے کسمائے اور کہا۔ ''ابا جی! اس سینے میں علم شریعت ہے۔''

شاہ صاحب نے فرمایا۔ ''بیٹے! اسی کو مٹا رہا ہوں۔'' اور مسلسل اپنا پیر ان کے سینے پر پھیرتے رہے۔ صاحبزادے نے دوبارہ عرض کیا۔ ''ابا! اس میں قرآن ہے (وہ حافظ قرآن تھے۔)''

حضرت شیخ نے کہا۔ ''ہاں بیٹے! اس کو بھی مٹا رہا ہوں۔''

اللہ کا نور

سوال: سرورِ کائنات حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے۔ ’’مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔‘‘ حضور ﷺ کی اس حدیث شریف کا کیا مطلب ہے؟

جواب: دیکھنے کی ایک طرز یہ ہے کہ اس میں نور شامل ہو جاتا ہے اور آدمی کی آنکھ پر نور کا لینز فٹ ہو جاتا ہے۔ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ جب عینک میں سرخ شیشہ لگاتے ہیں تو ہمیں ہر چیز سرخ نظر آتی ہے۔ عینک کا شیشہ نیلا ہو تو ہر چیز نیلی، ہرا ہو تو ہر چیز ہری نظر آتی ہے لیکن اگر شیشہ بے رنگ، سفید اور شفاف ہو تو اس طرح نظر آتا ہے جس طرح بغیر عینک کے نظر آتا ہے۔ اس کا مطلب بالکل واضح ہے کہ آنکھ وہی کچھ دیکھتی ہے جو اسے دکھایا جائے۔ بالالفاظ دیگر آنکھ پر جس قسم کا لینز لگا دیا جائے اسی مناسبت سے رنگین، صاف، دور یا قریب دکھائی دیتا ہے۔

عام حالات میں آنکھ جس طرح دیکھتی ہے وہ اپنے اور دوسری چیز کے درمیان ایک خلا رکھ کر دیکھتی ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ فرمانا کہ مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ مومن کی آنکھ پر اللہ کے نور کا لینز فٹ ہو جاتا ہے یعنی مومن کی نظر کو اللہ کی نظر حاصل ہو جاتی ہے۔ اس بات کو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس طرح بیان کیا ہے:

’’اللہ کو کوئی آنکھ نہیں دیکھ سکتی مگر اللہ اس آنکھ کا ادراک بن جاتا ہے۔‘‘

ایک جگہ یوں بھی ارشاد ہوا ہے:

’’تم ہماری سماعت سے سنتے ہو‘ ہماری بصارت سے دیکھتے ہو اور سوچنا دماغ کا کام ہے۔‘‘

دوسری جگہ ارشاد ہے:

اللہ ہر چیز پر محیط ہے۔ یعنی اللہ ایک دائرہ ہے اور ہر چیز اس میں بند ہے۔

جب کوئی سالک اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس قابل ہو جاتا ہے کہ اللہ کا یہ ارشاد کہ میں تمہاری رگِ جاں سے قریب ہوں‘ اس کے مشاہدہ میں آ جاتا ہے تو اس کو وہ نظر حاصل ہو جاتی ہے جس کے بارے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ مومن کی

فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد کیا گیا ہے۔ "اے رسول ﷺ! آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کے امر سے ہے۔" قرآن پاک کی آیات میں یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ انسان ناقابل تذکرہ شے تھا۔ پھر ہم نے اس کے اندر اپنی روح ڈال دی یہ بولتا، سنتا، سوچتا، محسوس کرتا اور حرکت کرتا ہوا بن گیا۔۔۔۔۔ بات سیدھی اور صاف ہے کہ انسان گوشت پوست اور ہڈیوں کے ڈھانچے کے اعتبار سے ناقابل تذکرہ تھا اور ہے۔ اس کے اندر اللہ کی روح، اس کی تمام صلاحیتوں اور زندگی میں تمام اعمال و حرکات کی بنیاد ہے۔ ہم روزمرہ دیکھتے ہیں کہ جب آدمی مر جاتا ہے تو قائم رہتا ہے لیکن حرکت ختم ہو جاتی ہے یعنی حرکت تابع ہے روح کے۔ کہنا یہ ہے کہ روح ہی زندگی ہے اور زندگی کے تمام اعمال اور حرکات کا دار و مدار ہی روح پر ہے۔

روح کی ہر حرکت میں مقداریں کام کرتی ہیں اور یہ معین مقداریں استعمال کرکے روح مختلف حیثیتوں اور مختلف رنگ و روپ میں اپنا تعارف پیش کرتی ہے۔ روح جب ان معین مقداروں کے تانے بانے کے ساتھ وہ لباس تیار کرتی ہے جس کو ہم درخت کہتے ہیں تو روح ہمیں درخت کی شکل میں نظر آتی ہے اور روح جب وہ مقداریں پیش کرتی ہے جو بکری میں کام کرتی ہیں تو وہ ہمیں بکری نظر آتی ہے۔ علیٰ ہذاالقیاس جتنی نوعیں اور نوعوں کے اندر مختلف شکل و صورت ہم دیکھتے ہیں یا ایسی نوعیں جو ہماری نظروں سے پوشیدہ ہیں وہ روح کی ہر آن اور ہر لمحہ بدلتی ہوئی تصویریں ہیں۔ روح ملاءاعلیٰ کے لباس میں خود کو پیش کرتی ہے۔ تو ملاءاعلیٰ ہے۔ ملاءاعلیٰ میں جبرائیلؑ، میکائیلؑ، اسرافیلؑ اور عزرائیلؑ شامل ہیں۔ جب روح حاملان ملائکہ سماوی یا ملائکہ ارضی کے لباس میں خود کو پیش کرتی ہے تو اسی نام سے پکاری جاتی ہے۔

باب دوم

دوسرے سیاروں کی مخلوق

سوال: کیا زمین کے علاوہ دوسرے سیاروں میں بھی کوئی مخلوق آباد ہے اگر ہے تو اس مخلوق کی کیا تعریف کی جائے گی؟

جواب: ہمیں جو سیارے نظر آتے ہیں ان میں اربوں کھربوں انسانوں اور جنات کی مخلوق آباد ہے۔البتہ ہر سیارے میں مخلوقات کی حرکات و سکنات، شکل و صورت کی مقداروں میں فرق ہوتا ہے کسی سیارے میں انسان روشنی کا بنا ہوا ہیولا نظر آتا ہے۔کسی سیارے میں انسان Transparent نظر آتا ہے یعنی اگر ایسے سیارے کا انسان ہمارے سامنے آجائے تو ہمیں اس کے آر پار نظر آئے گا۔ کسی سیارے میں انسان کا رنگ سونے کی طرح سنہرہ ہے۔یہ بات بہت دلچسپ اور تحیر خیز ہے کہ ہر سیارہ پر جس نوع کی مخلوق آباد ہے اس سیارہ میں ذیلی مخلوق یعنی حیوانات، نباتات وغیرہ بھی اسی مخلوق کی طرح تخلیق کی گئی ہیں مثلاً جس سیارہ میں انسانی مخلوق Transparent ہے تو اس سیارہ کی سرزمین پر پیدا ہونے والی ہر شے Transparent ہے۔درخت کا تنا اس طرح ہے جیسے شیشے کا ایک ستون۔لیکن اس شیشے کے ستون میں درخت سے متعلق رگیں، لکڑی کے جوڑ سب موجود ہیں' پتے بھی موجود ہیں۔وہ بھی شیشے کی مانند شفاف ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ وقت کی پیائش اور درجہ بندی بھی الگ الگ ہے۔اس کی مثال ہم اس طرح دے سکتے ہیں کہ جنات کی نوع میں بھی ولادت کا سلسلہ جاری ہے۔ان کے یہاں بھی پیدائش نوماہ میں ہوتی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ اگر ہم اپنے ماہ و سال سے اس کی پیائش کریں تو وہ مدت نو سال بنتی ہے۔یعنی ہمارا ایک ماہ جنات کے ایک سال کے برابر ہے۔ اسی مناسبت سے ان کی عمریں بھی ہوتی ہیں۔ بہت سے بزرگوں کے اقوال میں یہ بات ملتی ہے کہ انہوں نے ایسے جنات سے ملاقات کی جنہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت کی ہے۔اب اگر ایک انسان سو سال کی زندگی پاتا ہے تو اس حساب سے ایک جن کی عمر بارہ سو سال ہو گی۔اب بھی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ اس دنیا میں کسی شخص کی عمر 150 سال یا اس سے زیادہ ہے اس حساب سے ایک جن کی عمر پندرہ سو سال یا اس سے زیادہ ہو گی۔

ہر سیارہ میں انسان اور جنات آباد ہیں اور مذہبی نقطۂ نظر سے ان کے اندر فرقے بھی موجود ہیں۔جنات سب وہی کام کرتے ہیں جو انسان کرتے ہیں۔کائنات کے اندر جاری و ساری ہر سیارہ کے نظام میں وقت کا تعین الگ الگ ہے۔بعض سیاروں کے وقت اور ہماری زمین کے وقت میں اتنا بعد ہے کہ ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ وہاں وقت ہے ہی نہیں۔

پر عظمت ہستی

سوال: تصوف کا مقصد و منشا یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کو پہچان لے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ سڑی ہوئی مٹی سے بنا ہوا آدمی' اللہ رب العزت جیسی پر عظمت ہستی کو دیکھ لے۔ کیونکہ دیکھے بغیر پہچاننا ممکن نہیں؟ اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب: تخلیق کائنات کی ابتداء کو جس طرح اہل روحانیت بتاتے ہیں اگر قلم بند کیا جائے تو وہ اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ماسوا کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ میں ایسی مخلوق پیدا کروں جو مجھے جانے اور پہچانے اللہ تعالیٰ نے تخلیق کے فارمولے اپنے ذہن میں کیا بنائے وہ خود جانتے ہیں۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے یہ بات چاہی اور پسند کی کہ کائنات کو تخلیق کیا جائے۔ چنانچہ کائنات کو پورے خدوخال اور عمل و حرکت کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ''کن'' کہہ کر وجود کا لباس پہنا دیا۔ کائنات (بشمول انسان اور جنات) وجود میں تو آ گئی لیکن کسی کو یہ علم نہیں تھا کہ وہ کون ہے؟ کیوں ہے؟ اور کیا ہے؟

اور کس لئے ہے؟ اس مرحلے پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں' جنات' فرشتوں اور پوری کائنات کو ان کی حیثیت سے آگاہ کیا۔ یعنی انہیں یہ علم بخشا کہ تمہارا ایک وجود ہے۔ چنانچہ فرمایا الست بربکم (میں ہوں تمہارا رب) مخلوق کے دماغ کے پردے پر دو باتیں وارد ہوئیں۔ ایک یہ کہ اسے اپنی موجودگی کا احساس ہوا۔ دوسرے یہ کہ اسے یہ علم حاصل ہو کہ مجھے پیدا کرنے والی میرے علاوہ کوئی ہستی ہے۔ مخلوق نے جب اللہ تعالیٰ کی آواز سنی تو اس کے اندر فہم و ادراک اور نظر پیدا ہو گئی اور دریائے حیرت سے نکل کر اس نے آواز کی جانب دیکھا۔ جیسے ہی اسے نظر ملی۔ نظر کی مرکزیت اللہ تعالیٰ قرار پائے۔ دیکھنے کے بعد مخلوق نے کہا۔ قالو بلیٰ جی ہاں! ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ آپ ہمارے رب ہیں۔

تفکر کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ تخلیق کے پروگرام سے اللہ تعالیٰ کا منشاء یہ ہے کہ اسے جانا پہچانا جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے پہچاننے کے بے شمار راستے متعین کئے ہیں اور مختلف نوعوں کو پہچاننے کی مختلف صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ حاملان عرش ملائکہ سماوی، کروبی اور ملائکہ عنصری سب ہی اللہ تعالیٰ کا عرفان رکھتے ہیں۔ جنات کو بھی اللہ تعالیٰ کے عرفان کی صلاحیت دی گئی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان سب کرداروں میں سب سے زیادہ باصلاحیت انسان کو بنایا ہے۔ یعنی انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایسی صلاحیتیں

ودیعت کر دی ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کو کائنات کی تمام مخلوقات سے زیادہ قرب سے پہچان سکتا ہے اللہ تعالیٰ نے کائنات میں ایک کردار جس کو آدم کہا گیا ہے کو اپنے خصوصی عرفان کے لئے منتخب کیا اور اسے اپنی صفات کا براہ راست علم بخشا اور یہ علم عطا فرمانے کے بعد اس بات کو بھی ظاہر فرما دیا کہ صفات کا یہ خصوصی علم صرف انسان کو حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"اور ہم نے آدم کو اسماء (صفات) کا علم سکھایا، پھر ان اسماء کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا اگر تم اس علم کو جانتے ہو تو بیان کرو۔"

فرشتوں نے جواب دیا کہ "ہم آپ کی پاکی بیان کرتے ہیں اور اس علم سے بے خبر ہیں۔"

بات بالکل واضح ہے کہ آدم بہ شمول کائنات اللہ تعالیٰ کا ذہن ہے اور اس کو کائنات سے ہٹا کر اللہ کو پہچاننے کا خصوصی علم عطا کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتے ہیں:

"تم ہماری سماعت سے سنتے ہو، ہماری بصارت سے دیکھتے ہو، ہمارے دماغ سے سوچتے ہو۔"

"جہاں تم ایک ہو وہاں دوسرا اللہ ہے، جہاں تم دو ہو وہاں تیسرا اللہ ہے۔ اللہ وہی وہ ذات ہے جس نے تمہارا احاطہ کیا ہوا ہے۔"

آدم کی کتنی حرمان نصیبی ہے کہ باوجود اس کے کہ اس کی زندگی کا ہر لمحہ اللہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ وہ اپنے اختیاری عمل سے اللہ سے دور ہے۔ اللہ کے عرفان کا خصوصی علم اس کے اندر موجود ہے اور وہ پوری پوری صلاحیتوں سے مالا مال ہے لیکن پھر بھی اللہ کے عرفان سے محروم ہے۔ یہی بات بتانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر مبعوث فرمائے اور سب نے یہی بات بتائی کہ تمہارا رشتہ اللہ تعالیٰ سے قریب ترین ہے۔ اس کے برعکس کتنی ستم ظریفی ہے کہ نوع انسانی نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کی بات نہیں مانی اور ایک شیطان کی بات پر برابر لبیک کہہ رہی ہے۔ پیغمبروں کے وارث اولیاء اللہ نے اس مشن کو آگے بڑھانے کی کوشش کی مگر آدمی اتنا بدنصیب اور محروم ہے کہ اس نے یہاں بھی شیطان کی بات کو زیادہ اہمیت دی۔

جس چیز کو ہم شعور کا نام دیتے ہیں اس کی عادت ہے کہ وہ ایک قدم کو بھول کر دوسرا قدم اٹھاتا ہے اور اسی طرح ساری زندگی گزر جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر شعور ایک ایسا Pattern ہے جس کا دارومدار نسیان اور بھول پر ہے اس کے برعکس جب ہمارا کوئی قدم لاشعور میں داخل ہو جاتا ہے تو ہم اس کو اپنے ارادے کے تحت شعور میں لے آتے ہیں۔ شعور کی زندگی انسان کو مفروضہ حواس میں گرفتار کرتی ہے۔ اس کے برعکس لاشعور انسان کو مفروضہ حواس سے دور کر کے حقیقت کی طرف لے جاتا ہے۔ لاشعور کا دوسرا نام روح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب یہ کائنات بنائی تو الست بربکم فرما کر اس بات کا اقرار کرایا کہ تم مخلوق ہو اور میں خالق۔ لیکن جب انسان اپنی نادانی سے شعوری حواس کو اپنے اوپر مسلط کر بیٹھا تو وہ اس وعدے کو بھول گیا اور اس نے اپنی ساری زندگی کو شعور کے اندر مقید کر دیا۔ مخلوق بشمول انسان کا یہ جواب دینا کہ "جی ہاں! آپ ہمارے رب ہیں۔" اس بات کی ضمانت

ہے کہ انسان نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا، سمجھا اور پھر اقرار کیا۔ اب اگر کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کو دیکھے بغیر اور سمجھے بغیر اس کی ربوبیت کا تذکرہ کررہا ہے تو یہ تذکرہ شعوری کہلائے گا۔ اقرار بذات خود اس بات کی شہادت ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا اور سمجھ کر یہ بات کہی کہ آپ ہمارے رب ہیں۔

جب کوئی بندہ کسی روحانی استاد کی شاگردی میں آتا ہے تو استاد اسے یہ بتاتا ہے کہ تم نے اللہ تعالیٰ سے جو وعدہ کیا ہے اسے بھول گئے ہو اور وہ اپنے شاگرد کو شعور کی بھول بھلیوں سے آزاد کرنے کے لئے ایسی طرزیں اس کے ذہن میں منتقل کرتا ہے جو اسے لاشعور کے قریب کردیں اور ایفائے عہد میں جدوجہد کرکے بالآخر اپنے ازلی وعدہ کو پورا کردے۔ جب کوئی بندہ ایسی زندگی میں داخل ہو جاتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی آواز بھی سنتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا مشاہدہ بھی کرتا ہے۔

طرز فکر

سوال: انسان کسی بھی ڈھنگ سے زندگی گزارے اس کے پیچھے ایک سوچ، ایک طرز فکر کارفرما ہوتی ہے۔ کیا روحانیت ہمیں کوئی ایسی کسوٹی فراہم کرتی ہے جس پر پرکھا جاسکے کہ کون سی طرز فکر درست ہے؟

جواب: معاشرے کو سامنے رکھ کر تفکر کیا جائے تو یہ نظر آتا ہے کہ معاشرے میں موجود زندگی گزارنے اور زندگی میں سوچ بچار کی طرزیں ایک ہی طرح کام کرتی ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ آدمی کی سوچ بچار اور مخصوص طرز فکر کی بنیاد پر الگ الگ گروہ بنے ہوئے ہیں۔ ایک گروہ کی طرز فکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اس گروہ پر اتنا ہی فضل ہو جائے وہ ناشکرا ضرور ہوتا ہے۔ ایک گروہ کی عادت یہ ہے کہ وہ فیاض ہے، سخی ہے۔ اس کے برعکس دوسرے گروہ کی جبلت یہ بن گئی ہے کہ وہ بخیل ہے، کنجوس ہے اور اس کے دل میں دولت کی محبت اس حد تک جاگزیں ہے کہ اس کے اوپر دولت کی پرستش کا گمان ہوتا ہے۔ ایک گروہ ایسا ہے کہ اسے اس بات میں خوشی ہوتی ہے کہ وقت ضائع کیا جائے، ایک گروہ وعظ و نصیحت سننے کا شوقین ہے، دوسرا گروہ سیاسی تقاریر سننے کا خواہش مند رہتا ہے۔ کچھ لوگوں کو ناچنے گانے کا شوق ہوتا ہے اور کچھ لوگوں کو پینے پلانے کا اور ان لوگوں کے برعکس ایک گروہ ان لوگوں کا ہے جو خوش عقیدہ ہیں اور اولیاء اللہ کے مزارات پر حاضری دینے میں لذت محسوس کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ زمین پر موجود نوع انسانی مختلف گروہوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ننانوے فی صد گروہوں کی زندگی اور ان کی طرز فکر کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ یہ ننانوے فیصد گروہ شک اور وسوسوں میں مبتلا ہیں۔ ہم بتا چکے ہیں کہ شک اور وسوسہ کی زندگی سے آدمی کے اوپر غم، خوف اور پریشانی مسلط ہو جاتی ہے۔

روحانیت ہمیں صحیح طرز فکر کی جو کسوٹی فراہم کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے اندر غم اور خوف موجود نہ ہو۔ دنیا کی چار ارب آبادی اپنا محاسبہ کرسکتی ہے۔ ننانوے فیصد افراد ایسے ملیں گے جن کی ساری زندگی خوف اور غم میں گزر گئی ہے۔

تخلیقی فارمولوں کے سلسلے میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ کوئی تخلیق دو رخ کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ اس تخلیقی قانون کے تحت جس بندے کے اندر شک اور وسوسہ موجود ہے اس بندے کے اندر یقین بھی موجود ہے۔ جب کوئی بندہ یقین کی طاقت حاصل کر لیتا

ہے تو شک اور وسوسہ والا رخ مغلوب ہو جاتا ہے اور جب کسی بندے پر شک اور وسوسے کا رخ غالب ہو جاتا ہے تو یقین کا رخ مغلوب ہو جاتا ہے۔ بے یقینی کا دوسرا نام شک ہے، شک شیطنت ہے اور شیطنت غم اور خوف ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے بتائے ہوئے قاعدوں اور ضابطوں پر اگر عمل کیا جائے تو شک اور وسوسے کا رخ مغلوب ہو جاتا ہے اور یقین کا رخ غالب آجاتا ہے۔ روحانی طرز فکر یہی ہے کہ روحانی علوم سکھانے والا استاد، شیخ یا مرشد قدم قدم چلا کر اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ شک اور وسوسہ کا رخ مغلوب ہو جائے اور یقین کا رخ غالب آجائے اور بندہ الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیہم ولا ہم یحزنون کی زندگی کی تفسیر بن جائے۔ قرآن پاک کے ارشاد کے مطابق اللہ کے دوست ایسی طرز فکر میں زندگی گزارتے ہیں کہ ان کو نہ خوف ہوتا ہے، نہ غم۔

علم حضوری

سوال: کیا مرید اپنے مرشد سے سینکڑوں میل دور رہ کر بھی اسی طرح فیض یاب ہو سکتا ہے جس طرح نزدیک رہ کر چاہے وہ ساری زندگی مرشد کو ظاہری آنکھوں سے نہ دیکھے؟ مہربانی فرما کر اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب: علم کی دو اقسام ہیں۔ علم کی ایک قسم کا نام علم حضوری ہے اور دوسری کا نام علم حصولی ہے۔ یعنی ایک علم یہ ہے کہ آدمی اپنی کوشش، محنت جدوجہد اور صلاحیتوں کے مطابق ظاہری اسباب میں رہ کر کوئی علم سیکھتا ہے اور اس علم میں مادی وسائل بروئے کار آتے ہیں۔ اس کی مثال یوں ہے کہ ایک آدمی لوہار بننا چاہتا ہے اب اس کے سامنے تین چیزیں ہیں۔ ایک لوہا، دوسرے وہ صلاحیت جو لوہے کو مختلف شکلوں میں ڈھالتی ہے اور تیسرے صلاحیت کا استعمال۔ جب وہ اس صلاحیت کو استعمال کرتا ہے تو اس لوہے سے بے شمار چیزیں بن جاتی ہیں۔

سی علم کو سیکھنے کے لئے ایک قدر مشترک (Common Factor) نیت ہے یعنی علم کس لئے سیکھا جا رہا ہے؟ اس علم کی بدولت جو چیزیں تخلیق پا رہی ہیں ان چیزوں میں تخریب کا پہلو نمایاں ہے یا اس کے اندر تعمیر پنہاں ہے۔ جس طرح لوہا ایک دھات ہے اس طرح صلاحیت بھی ایک ہے یعنی لوہے کو مختلف چیزوں میں ڈھالنا، لیکن یہ دیکھنا ضروری ہے کہ یہ چیزیں کس مقصد کے لئے بنائی گئی ہیں۔ اس کے اندر تعمیر ہے یا تخریب۔ لوہے کی دھات سے ایسی چیزیں بھی بنتی ہیں جن کے اوپر انسان کی فلاح و بہبود کا دار و مدار ہے۔ مثلاً چمٹا، پھونکنی، توا، ریل کے پہیئے، ریل کے ڈبے، ہوائی جہاز اور دوسری بے شمار چیزیں۔ اور اگر نیت میں تخریب ہے تو یہی دھات نوع انسانی کی تباہی کا پیش خیمہ بن جاتی ہے جیسے بم، میزائل، ٹینک وغیرہ۔

علم حصولی ایک ایسا علم ہے جو وسائل کے تعین کے ساتھ سیکھا جاتا ہے، وسائل ہوں گے تو یہ علم سیکھا جا سکتا ہے۔ وسائل نہیں ہونگے تو یہ علم نہیں سیکھا جا سکتا۔ قلم ہو گا تو تحریر کاغذ پر منتقل ہو گی۔ قلم نہیں ہو گا تو تحریر کاغذ پر منتقل نہیں ہو گی۔ مطلب یہ ہے کہ قلم وسیلہ ہے اس بات کے لئے کہ تحریر کو کاغذ پر منتقل کیا جائے۔ علم حصولی کے لئے وسائل کے ساتھ ساتھ استاد کی بھی ضرورت پیش آتی ہے۔ ایسا استاد جو گوشت پوست سے مرکب ہو اور (Time and Space) میں مقید جسمانی خدوخال کے ساتھ موجود ہو اور یہ بتائے کہ قلم اس طرح پکڑا جاتا ہے اور قلم سے الف۔ ب۔ پ اس طرح لکھی جاتی ہے۔

علم کی دوسری قسم علم حضوری ہے۔ علم حضوری ایک ایسا علم ہے۔ جو مادی وسائل کا محتاج نہیں ہے۔اس علم کو سیکھنے کے لئے کاغذ، قلم، دوات کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ یہ علم مادی وسائل سے ماوراء ہے جس طرح حصولی علم کو سیکھنے کے لئے استاد کی ضرورت ہے اسی طرح حضوری علم کو سیکھنے کے لئے بھی استاد کی ضرورت پیش آتی ہے۔ کیونکہ یہ علم(Time and Space) کی جدوجہد سے باہر ہے۔اس لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ استادمادی خدوخال اورمادی وسائل کے ساتھ شاگرد کے سامنے موجود ہو۔

علم حصولی کے طالب کو شاگرد کہا جاتا ہے اور علم سکھانے والے کو استاد کا نام دیا جاتا ہے۔ علم حضوری سیکھنے والے طالب علم کا نام مرید ہے اور سکھانے والے کا اصطلاحی نام مراد ہے۔ جب کوئی مرید اپنے مراد سے کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو اپنی طرز فکر میں تبدیلی پیدا کرنا ضروری ہے۔ باالفاظ دیگر اس کے لئے استاد کی طرز فکر اختیار کرنا واجب ہے۔

علم حصولی میں استاد کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ شاگرد کو یہ بتادے کہ تصویر کس طرح بنتی ہے؟ پنسل کس طرح پکڑی جاتی ہے؟

لکیروں' دائروں اور قوسوں کے تناسب سے تصویر کس طرح تشکیل پاتی ہے؟ شاگرد جب استاد کی ہدایات پر عمل کرتا ہے تو وہ تصویر بنالیتا ہے لیکن یہ تصویر اس کی اپنی صلاحیتوں کا اظہار بھی ہوتی ہے۔استاد کا کام صرف اتنا تھا کہ اسے تصویر بنانے کا قاعدہ سمجھا دیا۔ جتنی مشق کی جائے گی اسی مناسبت سے تصویر کے خدوخال بہتر اور خوب صورت ہوتے چلے جائیں گے۔اس کے متضاد علم حضوری میں مراد مرید کے اندر اپنی صلاحیتیں منتقل کر دیتا ہے۔ مرید جب تصویر کشی کرے گا تو اس تصویر میں مراد کی صلاحیت کا عکس نمایاں ہو گا۔صلاحیتوں کا منتقل کرنا مادی وسائل کا محتاج نہیں ہے۔ صلاحیتوں کو قبول کرنے کے لئے اور مراد کی طرز فکر کو اپنانے کے لئے صرف اور صرف ایک بات کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ مرید خود کو اپنی ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ مراد کے سپرد کر دے اور اپنی ذات کی اس طرح نفی کر دے کہ اس کے اندر بجز مراد کے کوئی چیز نظر نہ آئے۔ جیسے جیسے یہ طرز مرید کے اندر مستحکم ہوتی ہے۔اسی مناسبت سے مراد کی طرز فکر مرید کے اندر منتقل ہوتی رہتی ہے۔ حضرت اویس قرنیؓ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ حضرت اویس قرنیؓ کی حضور اکرم ﷺ سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ لیکن محبت اور قربت کا یہ عالم تھا کہ حضرت اویسؓ کے تذکرے سے حضور ﷺ کا چہرۂ مبارک خوشی سے کھل اٹھتا تھا۔

دماغ' آدمی کے اندر دراصل ایک سکرین ہے بالکل ٹی وی کی طرح۔ٹی وی اسٹیشن سے آواز اور تصویر نشر ہوتی ہے اور بغیر کسی وقفہ کے ٹی وی سکرین پر منتقل ہو جاتی ہے اسی طرح جب مراد اپنے مرید کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو مراد کی (Time and Space) کو حذف کرنے والی صلاحیتیں مرید کے دماغ کے س کرین پر متحرک ہو جاتی ہیں اور جیسے جیسے یہ منتقلی عمل میں آتی ہے مرید کے اندر ذہنی تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔انتہا یہ ہے کہ مرید کی طرز فکر مراد کی طرح ہو جاتی ہے۔

مراد کی صلاحیتیں مرید کی صلاحیتیں بن جاتی ہیں اور جب یہ عمل اپنے عروج پر پہنچتا ہے تو مراد اور مرید ایک ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ دونوں کی گفتگو ایک ہو جاتی ہے' دونوں کی شکل وصورت ایک ہو جاتی ہے اور دونوں کی طرز گفتگو ایک ہو جاتی ہے۔ایسے بے شمار واقعات تاریخ کے صفحات میں موجود ہیں کہ مراد کے جسم کے کسی حصہ میں درد ہوا تو مرید نے بھی اسی وقت اپنے جسم کے اسی حصہ میں درد محسوس کیا۔ مراد کو بخار ہوا' مرید بھی بخار میں تپنے لگا۔ جبکہ مرید مراد سے ہزاروں میل کے فاصلے پر موجود تھا۔ اگر مرید کے اندر جذبہ صادق ہے اور مرید مراد کے عشق میں مبتلا کرتا ہے تو پھر دور دراز کے فاصلے معدوم ہو جاتے ہیں اور مرید ہزاروں میل دور رہ کر بھی مراد یا پیر و مرشد سے فیضیاب ہوتا ہے۔

حقیقت مذاہب

سوال: کیااسلام کے علاوہ دیگر مذاہب و نظریات میں کوئی حقیقت موجود ہے؟ اگر ہے تو بتائیں۔

جواب: انسانی زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات بالوضاحت ہمارے سامنے آتی ہے کہ انسان کے لئے کسی عقیدے پر ذہنی مرکزیت رکھنا ضروری ہے۔ کوئی ہوش مند آدمی عقیدے کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی شخص ایسے عقیدے پر قائم ہو جسے بد عقیدہ کہا جاتا ہے۔ جتنے بھی مذاہب تاریخ کے صفحات میں موجود ہیں ان سب کی بنیاد یہ ہے کہ بندہ کو عقیدہ کے مضبوط اور مستحکم بندھن میں باندھ دیا جائے۔ قرآن کے متعلق سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے واشگاف الفاظ میں اس حقیقت کا انکشاف فرمایا ہے کہ میں کوئی نئی بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ اللہ کی سنت میں نہ تغیر ہوتا ہے اور نہ تعطل واقع ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اس سنت کو جاری و ساری رکھنے کے لئے پیغمبر مبعوث ہوتے رہے یہاں تک کہ اللہ کی نعمتیں پوری کر دی گئیں اور دین مکمل ہو گیا لیکن ہمیشہ یہ ہوتا رہا کہ پیغمبروں کی تعلیمات کو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگ اپنی ذاتی مصلحتوں کے خوش نما پردوں میں چھپا دینے کی کوشش کرتے رہے۔ علمائے حق اولیاء اللہ نے ایسی مصلحت آمیز کوششوں کو تحریف کا نام دیا ہے۔ انجیل اور دوسری الہامی کتابوں میں جس قدر تحریف کی گئی ہے' وہ سب کے سامنے ہے۔ چونکہ قرآن پاک کے ایک ایک لفظ کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے ذمہ لے لیا ہے' اس لئے اس کے اصل میں کوئی قدغن نہیں لگا سکا لیکن تراجم میں کوشش جاری رکھی گئی۔ یہاں تک کہ (نعوذ باللہ) ایک نبی بھی پیدا ہو گیا۔ تفاسیر کا عالم یہ ہے کہ دو چار تفسیریں پڑھ لی جائیں تو ذی فکر آدمی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ پاتا۔ بلکہ وہ بھول بھلیوں میں گم ہو جاتا ہے جبکہ خالق کائنات کا ارشاد ہے۔ ''اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو۔''

المیہ یہ ہے کہ ہم لوگ ہمیشہ تخریبی ذہن اور تحریف کرنے والوں سے زیادہ متاثر رہے۔ بظاہر وہ لوگ اپنے مشن میں کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔ اب سے چالیس سال پہلے فوٹو کھنچوانا گناہ کبیرہ تھا۔ لاؤڈ اسپیکر پر اذان دینا بھی جائز نہیں تھا' گانا لہو و لعب میں آتا تھا۔

مگر آج کے دور میں ہر بڑے اور چھوٹے رہنما کے فوٹو رسالوں اور اخباروں کی زینت بنتے ہیں اور کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ گھر گھر گانوں کی محفلیں سجی ہوئی ہیں اور کسی کے دل کی حرکت تیز نہیں ہوتی۔ اس میں بلاشبہ وہ حضرات بھی شامل ہیں جنھوں نے اپنے اوپر صراط مستقیم دکھانے کی عظیم ذمہ داری لے رکھی ہے۔

وال یہ ہے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ ہم سچے ہیں' ہمارا دین برحق ہے' ہمارے نبی ﷺ اللہ کے آخری رسول ہیں اور آپ ﷺ کے اوپر تمام نعمتیں اللہ نے پوری کر دی ہیں۔

سیدھی سی بات ہے کہ آدمی جس راستے پر چلتا ہے اس کے نشیب و فراز اس کے سامنے آجاتے ہیں۔ آدمی جس ہستی کے جتنا قریب ہوتا ہے اسی مناسبت سے اس کی طرز فکر منتقل ہو جاتی ہے۔ انبیاءؑ کی طرز فکر یہ ہے کہ وہ ارادتاً یا غیر ارادی طور پر ہر عمل، ہر کام اور ہر بات کو منجانب اللہ جانتے ہیں یعنی اس بات کا رخ اللہ کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ اللہ سے ان کا تعلق اس قدر مستحکم اور یقینی ہوتا ہے کہ وہ ہر آن، ہر لمحہ اور ہر سانس میں اللہ کے ساتھ وابستہ رہتے ہیں۔ اللہ ایسی ذات ہے جسے کسی قسم کی احتیاج نہیں ہے۔ اللہ پریشان اور رنجیدہ نہیں ہوتا۔ اللہ سے قربت رکھنے والے حضرات میں بھی یہ صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ خود اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق اللہ کے دوستوں کو خوف ہوتا ہے اور نہ غم' وہ اطمینان و سکون کی زندگی گزارتے ہیں۔ انہیں اس بات کا افسوس نہیں ہوتا کہ ماضی میں کیا گزر چکا ہے اور اس بات کا خوف نہیں ہوتا کہ مستقبل ہمارے لئے پریشانیوں اور صعوبتوں کا پیش خیمہ ہو گا۔ اگر کسی شخص کے اندر یہ صفات موجود ہیں تو بے شک وہ صحیح راستے پر گامزن ہے اور اگر ہماری زندگی میں سکون نہیں ہے تو ہمارا شمار اللہ کے دوستوں میں نہیں ہو گا۔

اسلام اور دوسرے تمام مذاہب کی حقانیت کے بارے میں عرض ہے کہ ہر وہ مذہب جو اللہ کی طرف سے وحی کی بنیاد پر نازل ہوا' حق ہے۔ ہر الہامی کتاب میں یہ بشارت دی گئی ہے کہ ایک نجات دہندہ آئے گا۔ جب یہ نجات دہندہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آگئے تو تمام گزرے ہوئے مذاہب کی پیش گوئی پوری ہو گئی۔

مختلف مذاہب و نظریات صدیوں سے موجود ہیں جو ایک پائیدار ہستی کا عقیدہ و تصور رکھتے ہیں۔ نظر کی گہرائی اسے مفروضہ قرار نہیں دے سکتی۔ ان مذاہب و نظریات میں حقیقت موجود ہے۔

پائیدار ہستی کا تصور جو گوناگوں صلاحیتوں کی اہل ہے اور ہر چیز پر قادر ہے' انسان ہمیشہ سے رکھتا ہے۔ شاید یہی تصور اسے صحیح راستوں پر گامزن کر دیتا ہو یا اس کی تسکین کا باعث بن جاتا ہو۔ مختلف مذاہب و نظریات کا وجود زمانہ ازل سے اس بات کا ثبوت ہے لیکن یہ تصور صرف تصور تک محدود نہیں کیا جانا چاہئے بلکہ ان تصورات کی گہرائی میں حقیقت پنہاں ہے۔ زرتشت، بدھ مت، مادہ پرست، یہودیت، عیسائیت، ہندومت، کمیونسٹ اور سینکڑوں نظریات و مذاہب خدا کی پائیداری پر مقرر ہیں۔ ہر فرقہ، ہر مذہب

اور ہر نظریہ اپنے وجود کو پائیداری کے زیادہ قریب تصور کرتا ہے (یعنی خدا کے زیادہ قریب)۔اس کا احساس آپ کو ان کے نام لیواؤں میں ملے گا۔لیکن کیا میں سوال کر سکتا ہوں کہ کس نظریہ کو تسلیم کر کے خدا کو پہچان لیا جائے۔یہ سوال خالی الذہن ہو کر کیا جائے تو جواب کی امید بہت کم نکلتی ہے' سب اپنے آپ کو حق جانتے ہیں۔ان میں صحائف رکھنے والے بھی ہیں۔سوال یہ ہے کہ زرتشت کو بھی خدا مل جاتا ہے۔ستارے' چاند' سورج پوجنے والوں کو بھی خدا مل جاتا ہے۔سب کے نزدیک خدا نا قابل تصور صلاحیتوں سے مزین ہے۔بات گڑ گڑانے اور ایمان وعقیدے کی ہے۔

باب سوم

غیب بینی

سوال: روحانیت میں غیب بینی کے اصطلاحی نام یہ ہیں۔ غنود، درود، کشف اور شہود یہ کیا ہیں؟ مہربانی کر کے اس کی وضاحت کی جائے۔

جواب: یہ بات ہم جانتے ہیں کہ انسان کے اندر دو دماغ کام کرتے ہیں۔ ایک دماغ مفروضہ حواس (حواس خمسہ) کے ذریعے کام کرتا ہے اور دوسرا دماغ مفروضہ حواس سے ہٹ کر حقیقی دنیا کا مشاہدہ کرتا ہے۔ مفروضہ حواس اور مکان اور زمان کی قرآن مجید نے نفی کر دی ہے۔

قرآن پاک کا ارشاد ہے۔ ''تم دیکھ رہے پہاڑ جمے ہوئے یہ بادلوں کی طرح تیر رہے ہیں۔ قیامت کا وقفہ اتنا ہے جیسے پلک جھپکنا یا اس سے بھی قریب وہ دیکھ رہے ہیں تیری طرف اور نہیں دیکھ رہے۔''

''لیلۃ القدر بہتر ہے ہزار مہینوں سے' یعنی اس رات میں آدمی کے اندر حواس کی رفتار تقریباً ساٹھ ہزار گنا زیادہ ہو جاتی ہے۔ آیات مقدسہ میں تفکر کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہماری نظر جو شعور سے ہم رشتہ ہے ناقص مفروضہ اور غیر حقیقی ہے۔ شعور دیکھنے کے لئے ہمیشہ کسی واسطے (میڈیم) کا محتاج ہوتا ہے اور وہ واسطہ خود شعور کی طرح فرض کردہ ہوتا ہے' جب پہاڑ جمے ہوئے نہیں ہیں۔ تو بلور' پارہ' کاغذ' کینوس نقوش تصویر سب مفروضہ ہیں' تصوف میں غنود، درود اور کشف کو بھان متی کہا جاتا ہے۔

اس لئے کہ اس عالم میں مفروضہ شعور کی کارفرمائی برقرار رہتی ہے۔ البتہ شہود ایسی نظر ہے' جو مفروضہ حواس زمان و مکاں اور حساب و کتاب سے ماوراء دیکھتی ہے۔ جن پاکیزہ نفس حضرات کو ''شہود'' حاصل ہوتا ہے۔ وہ پیش گوئیاں نہیں کرتے اور اگر کچھ کہتے ہیں تو ماہ و سال کا تعین نہیں کرتے۔ کیونکہ غیب کی دنیا میں ذہن کی رفتار ساٹھ ہزار گنا زیادہ ہونے کی وجہ سے دن، مہینہ، سال اور زمان و مکاں کا کوئی تعین نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک مستقبل نمائی کا تعلق ہے۔ حالات کے پیش نظر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اور کہا جاتا رہا ہے۔ لیکن یہ غیب بینی اور مستقبل بینی کے زمرے میں نہیں آتا۔۔۔۔۔۔ یہ سب اندازوں اور حساب و کتاب کی باتیں ہیں حساب و کتاب کا تعلق مشق سے ہوتا ہے۔ زیادہ مشق کرنے والا بندہ زیادہ بہتر حساب کر لیتا ہے لیکن پھر بھی ضروری نہیں ہے کہ حساب یا پیشن گوئی سو فیصد درست ہو۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے:

"اے گروہ جنات اور انسان اگر تم استطاعت رکھتے ہو تو آسمان اور زمین کے کناروں سے نکل جاؤ، نہیں نکل سکتے مگر سلطان کے ساتھ! (روحانی استعداد یا پیر و مرشد کی توجہ)۔"

سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وسیلہ اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اگر کوئی بندہ سلطان (اپنی روح) سے تعارف حاصل کر لیتا ہے تو اس کے اوپر غیبی علوم منکشف ہو جاتے ہیں۔ ایسے بندے جو کچھ کہتے ہیں اس کی حیثیت صرف پیشن گوئی سی نہیں ہوتی بلکہ ان کا کہنا مبنی بر حقیقت ہوتا ہے۔۔۔۔۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پاک ہے:

"مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔"

ہم کسی چیز کو اس وقت دیکھتے ہیں جب اس چیز پر ہمارا ذہن ٹھہر جائے۔ جب تک ذہن یا نظر کی مرکزیت قائم نہیں ہوتی، کوئی شے ہمیں نظر نہیں آتی۔

خون میں دو قسم کی لہریں ہوتی ہیں۔ ٹھنڈی اور گرم۔ ٹھنڈی لہروں سے حواس بنتے ہیں اور گرم لہروں سے حواس میں تعطل واقع ہوتا ہے۔ بے ہوشی، غشی، پاگل پن سب گرم لہروں کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ مرگی کا دورہ بھی گرم لہروں کی پیداوار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ وصف بخشا ہے کہ حرکت ہمیشہ اس کے ارادے کے تحت ہوتی ہے۔ زمین پر جو کچھ نظر آتا ہے وہ انسان کے ارادے کا مظہر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انسان اس سے واقفیت حاصل نہ کرنا چاہے۔

اللہ وہ ہے جس نے بنائے سماوات اور ارض اور اتاری سماء سے کتاب المبین، ایک شعاع۔ اس شعاع میں سے نکالے وسائل اور مظاہر وسائل اور مظاہر کو اپنے حکم سے تمہارے تابع کر دیا (یعنی پہنانے کا اختیار دے دیا۔)

اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق ارض (زمین) کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری زمین کو ارض فرماتے ہیں۔ ارض کے معانی ہیں بساط۔ ایسی بساط جہاں شعاع آکر ٹکراتی ہے۔

پانی کا ایک قطرہ بھی پانی ہے اور پانی کا سمندر بھی پانی ہے۔ آگ کی چھوٹی سی چھوٹی چنگاری کو بھی آگ ہی کہا جائے گا۔

قانون یہ ہے کہ جب آدمی انتظار میں کسی جگہ کھڑا ہو جاتا ہے تو اس کے لئے منزل ختم ہو جاتی ہے۔

ایمان یہ ہے کہ ایک چیز مشاہدہ میں نہیں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "یہ ہے۔" تو پھر ساری دنیا اگر یہ کہے کہ "یہ چیز نہیں ہے۔" ایمان والا کہتا ہے کہ "یہ چیز ہے۔" اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ یہ ہے۔

خواب کی حالت

سوال: مراقبہ کرنے والے کسی شخص کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ نیند کی حالت میں ہے مکمل خاموشی اور سکون، بند آنکھیں اور سانس کا ایک مخصوص زیروبم، یہ سب وہ علامات ہیں جو خواب کی حالت کو ظاہر کرتی ہیں۔ براہ کرم اس پر روشنی ڈالیں۔
جواب: خواب اور بیداری کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ خواب اور بے داری دراصل زندگی کے دو رخ ہیں۔ اللہ تعالی کے ارشاد کے مطابق ہر چیز دو رخوں پر پیدا کی گئی ہے اور زندگی کی تمام حرکات و سکنات بھی دو رخوں پر قائم ہیں۔ زندگی کے وہ دو رخ جس پر ماضی حال اور مستقبل رواں دواں ہیں۔ بنیادی طور پر خواب اور بیداری ہیں جبکہ سمجھا یہ جاتا ہے کہ خواب کوئی خاص زندگی نہیں ہے، البتہ بیداری زندگی ہے۔ علوم ظاہری کے دانشور جب خواب کا تذکرہ کرتے ہیں تو خواب کو ایک خیالی زندگی کہہ کر گزر جاتے ہیں جبکہ اللہ تعالی کے ارشاد کے مطابق خواب اور بیداری الگ الگ نہیں ہیں صرف حواس کی درجہ بندی کا فرق ہے۔ ایک حواس میں ذی روح اپنے اوپر پابندی محسوس کرتا ہے اور دوسرے حواس میں خود کو پابندی سے آزاد دیکھتا ہے۔ سفر ایک ہی ہے فرق صرف پابندی اور آزادی کا ہے۔

مراقبہ دراصل ایک ایسی کیفیت اور مشق کا نام ہے جو انسان کو حواس کے دو رخوں سے متعارف کراتی ہے۔ اس کیفیت سے متعارف ہونے کا ایک ذریعہ یہ ہے کہ آدمی اعصابی تھکن کی وجہ سے پابندی کے حواس سے ہٹ کر ایسے حواس میں قدم رکھنا چاہتا ہے جہاں پابندی نہیں ہے تو طبیعت اسے دنیاوی آلام و مصائب سے آزاد کر کے اس زندگی میں لے جاتی ہے جس زندگی کا نام خواب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی اعصابی طور پر بے بس ہو کر سو جائے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اعصابی سکون کے ساتھ اپنے ارادے اور اختیار سے بیدار رہتے ہوئے اپنے اوپر خواب کے حواس مسلط کر لے۔ جس مناسبت سے خواب کے حواس بیداری میں منتقل ہوتے ہیں۔ اسی مناسبت سے کوئی آدمی روحانی ترقی کرتا ہے۔

جب آدمی سونے کے لئے لیٹتا ہے تو اعصابی خمار کی کیفیت سے دوچار ہونے کے بعد غنودگی کے عالم میں چلا جاتا ہے۔ غنودگی کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے شعوری حواس لاشعوری حواس میں منتقل ہونا شروع ہو گئے ہیں اور جب غنودگی اپنے عروج پر پہنچتی ہے یعنی شعوری حواس لاشعوری حواس میں منتقل ہو جاتے ہیں تو آدمی سو جاتا ہے یہ وہ عمل ہے جو ہر ذی روح میں جاری ہے خواہ وہ کسی نوع سے تعلق رکھتا ہو۔۔۔۔۔۔ انسان کو اللہ تعالی نے اشرف المخلوقات بنایا ہے اور اس کو اپنی صفات کا وہ علم عطا فرمایا ہے جو

دوسری مخلوقات کو عطا نہیں کیا گیا۔اللہ تعالیٰ کی صفات کے تمام علوم غیبی انکشافات ہیں اور یہ وہی صلاحیتیں ہیں جن کو ’’علم الاسماء‘‘ کہا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ بندہ غیب کی دنیا میں اللہ تعالیٰ کی صناعی کا مشاہدہ کرے اور اللہ تعالیٰ کی صفات کا عرفان حاصل کرے۔اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ بندے کے اندر وہ صلاحیتیں بھی موجود ہوں، جن کو بروئے کار لا کر وہ اللہ تعالیٰ کے منشاء کو پورا کر سکے۔ یہ منشاء آزاد زندگی میں داخل ہو کر پورا ہو سکتا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ غیب کی دنیا میں Time and Space نہیں ہوتا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ انسان کے حواس پابند زندگی میں بھی سفر کرتے ہیں اور پابند زندگی سے آزاد ہو کر بھی۔ پابند زندگی بیداری ہے اور آزاد زندگی خواب ہے۔خواب کی زندگی میں داخل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بیداری کے حواس بھی قائم رہیں اور آدمی جس طرح بیدار رہ کر ارد گرد کے ماحول سے متصل رہتا ہے، اسی اتصال کے ساتھ آزاد زندگی میں بھی سفر کرے

اس بات کو آسان الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ مراقبہ دراصل بیداری کے حواس میں رہتے ہوئے خواب دیکھنا ہے یعنی ایک آدمی بیدار ہے، شعوری حواس کام کر رہے ہیں، وہ ماحول اور فضا سے متاثر بھی ہو رہا ہے، آوازیں بھی سن رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ خواب بھی دیکھ رہا ہے۔وہ بیک وقت دو کام کر رہا ہے۔جاگ بھی رہا ہے، سو بھی رہا ہے۔Time and Space میں بند بھی ہے اور آزاد بھی ہے۔

اس بات کو ایک مثال سے سمجھئے۔ایک آدمی کسی دوست کو خط لکھ رہا ہے۔خط لکھنے میں اس کا دماغ بھی کام کر رہا ہے، اس کا ہاتھ بھی چل رہا ہے۔ماحول میں پھیلی ہوئی آوازیں بھی سن رہا ہے۔کوئی بولتا ہے تو اس کی بات کا مفہوم بھی اس کے ذہن میں منتقل ہوتا ہے، کوئی شخص اس سے سوال کرتا ہے تو اس کا جواب بھی دیتا ہے۔ فضا میں خنکی ہے تو سردی محسوس کر رہا ہے، گرمی ہے تو گرمی کا احساس بھی اسے ہو رہا ہے۔بنیادی طور پر وہ خط لکھ رہا ہے اور خط لکھنے میں شعوری کیفیت الفاظ کی شکل میں منتقل ہو رہی ہے اور الفاظ کے اندر جو مفہوم ہے وہ لاشعور سے شعور میں منتقل ہو رہا ہے۔مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی بیک وقت اپنے اندر چھپی ہوئی کئی صلاحیتوں کو استعمال کر رہا ہے۔جب کوئی بندہ بیداری میں رہتے ہوئے خواب کے حواس کو اپنے اوپر وارد کر لیتا ہے تو جس طرح خط لکھنے کی حالت میں وہ بہت سی صلاحیتیں ایک ساتھ استعمال کر رہا تھا اسی طرح وہ خواب یا لاشعوری زندگی میں بھی بیداری اور خواب کی صلاحیتوں سے ایک ساتھ متعارف ہو کر ان کو استعمال کر سکتا ہے۔

شعوری اور لاشعوری صلاحیتوں سے ایک ساتھ کام لینے کے طریقہ کا نام مراقبہ۔۔۔۔۔۔ہے۔

ماوراءذات

سوال: اللہ تعالیٰ کو دیکھنے، اللہ کی بات سننے، اللہ کو چھو لینے کی باتیں کی جاتی ہیں۔ یہ سب کیا ہیں؟ اس پر روشنی ڈال دیں۔

جواب: اللہ تعالیٰ سے قربت کا احساس ہوتا ہے مگر درمیان میں حجاب حائل ہوتا ہے۔ بعض اوقات ادراک میں یہ بات سماجاتی ہے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کو چھو لیا ہے یا اللہ تعالیٰ نے ہمارے اوپر اپنا ہاتھ رکھ دیا ہے یا اللہ تعالیٰ نے سجدہ کی حالت میں اپنا پائے مبارک ہمارے سر پر رکھ دیا ہے۔ فکر کے بعد نتیجہ ہمیشہ یہی نکلتا ہے کہ ہمارے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان حجاب قائم ہے۔

پائے مبارک کے بارے میں صرف ادراک کام کرتا ہے لیکن ہم اس کو بیان نہیں کر سکتے کہ اللہ تعالیٰ کے پیر مبارک اس طرح کے ہیں۔

ہوتا یہ ہے کہ ادراک میں یہ بات آجاتی ہے کہ حجاب کے پیچھے اللہ تعالیٰ تشریف فرما ہیں۔ ذوق عبدیت بندہ کو سجدہ کی حالت میں لے آتا ہے۔

اب ادراک میں یہ بات آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عبدیت کو قبول فرما لیا ہے۔ بندہ کے سر پر پائے مبارک رکھ کر قبولیت کا اظہار کر رہے ہیں۔

عرش و کرسی پر اللہ تعالیٰ کا دیدار کسی نہ کسی طرح خدوخال میں بیان کیا جاسکتا ہے لیکن حتمی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ایسی شکل و صورت ہے۔ صرف اشارہ کنایہ میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عرش پر اللہ تعالیٰ تشریف فرما ہیں۔ بصارت کا ادراک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک نور ہیں۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کا ہاتھ دیکھا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہنا پڑے گا۔ صرف ہاتھ دیکھا، پورا جسم نہیں دیکھا۔

عرش پر ایک ہستی تشریف فرما ہے۔ اس ہستی کے خدوخال کیا ہیں۔ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ایک ہستی تشریف فرما ہے جو اللہ ہے مگر اس مقدس ہستی نے ایک برقعہ سے اپنا سراپا چھپایا ہوا ہے۔

ہم نے اللہ تعالیٰ کی آنکھ کا مشاہدہ کیا۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی اس طرح کی آنکھیں ہوتی ہیں جس طرح انسان کی ہوتی ہیں۔ تو جواب یہ ہوگا کہ صرف آنکھ دیکھی ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اللہ تعالیٰ کا چہرہ پر دو آنکھیں ہیں اور اس طرح کی ہیں۔

ہمارے اندر کائنات کی Base تسلسل کے ساتھ آرہی ہے اور ہمارے اندر کائنات تخلیق ہو رہی ہے۔

زوجین اثنین (مثلث) کے دونوں رخ ہمارے اندر ہیں اور اس مثلث کو ایک دائرے نے محیط کر رکھا ہے۔

مثلث کے اندر رو کی صورت میں نور کی لہر بغیر کسی انقطاع کے گر رہی ہے۔ جیسے ہی وہ مثلث سے آکر ٹکراتی ہے۔ مثلث کے اندر بکھر جاتی ہے اور اس کا بکھرنا ہی کائنات ہے۔

اس کی مثال سینما سے دی جاسکتی ہے۔ مشین سے ایک رو لہروں کی صورت میں نزول کرتی ہے اور وہ لہریں سکرین سے ٹکراتی ہیں۔ جیسے ہی ٹکراناو قوع پذیر ہوتا ہے، پردہ پر مختلف شکلیں نمودار ہو جاتی ہیں۔

یہی صورت انسان کے اندر جاری و ساری ہے۔ مصدر اطلاعات یا عالم امر سے ایک رو چلتی ہے اور انسان کے اندر (مثلث) سکرین پر آکر ٹوٹتی اور بکھر جاتی ہے۔ بکھرنے کے ساتھ ہی وہ سب لہریں مختلف شکلوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اس رو کے اندر پوری کائنات پوشیدہ ہے۔

اس رو میں انسان، جنات، فرشتے تمام اجرام سماوی، عرش و کرسی اور حجابات سب کچھ ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات اس رو سے ماوراء ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وجود بالکل ایک الگ ہستی ہے۔

حجابات تک اس رو اور مثلث میں مشاہدات ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات بھی اس رو اور مثلث میں مشاہدہ ہوتی ہیں۔ لیکن ذات باری تعالیٰ اس رو اور مثلث سے ماوراء ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس Dimension اور خدوخال سے ماوراء ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ کی ہستی کو شکل و صورت اور خدوخال میں محدود نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا ادراک ضرور کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب شرف ہم کلامی عطا فرماتے ہیں تو پردہ کے پیچھے سے آواز سنائی دیتی ہے اور ادراک میں اللہ تعالیٰ کی ہستی بھی ہوتی ہے لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ اللہ تعالیٰ جس وقت تکلم فرما رہے تھے تو ان کے ہونٹ ہل رہے تھے۔

تصرف

سوال: کیاانسان اللہ کی کسی تخلیق میں کوئی تبدیلی لانے کااختیار رکھتا ہے؟مہربانی فرماکراس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب: اللہ تعالیٰ نے جہاں کائنات کی تخلیق کاتذکرہ کیاہے وہاں یہ بات ارشاد کی ہے کہ میں تخلیق کرنے والوں میں سب سے بہتر خالق ہوں۔اللہ تعالیٰ بحیثیت خالق کے ایک ایسے خالق ہیں کہ جن کی تخلیق میں وسائل کی پابندی زیر بحث نہیں آتی۔اللہ کے ارادے میں جو چیز جس طرح اور جس خدوخال میں موجود ہے جب وہ اس چیز کو وجود بخشنے کاارادہ کرتے ہیں تو حکم دیتے ہیں اور اس حکم کی تعمیل میں تخلیق کے اندر جتنے وسائل ضروری ہیں وہ سب وجود میں آکر اس تخلیق کو علم میں لے آئے ہیں جو تخلیق اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود ہے۔خالقین کالفظ ہمیں یہ بتاتاہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور بھی تخلیق کرنے والے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی تخلیق کے علاوہ دوسری ہر تخلیق وسائل کی پابند اور محتاج ہے۔اس کی مثال آج کے دور میں بجلی سے دی جاسکتی ہے۔اللہ تعالیٰ کی ایک تخلیق بجلی (Electricity) ہے۔جب بندوں نے اس تخلیق سے دوسری ذیلی تخلیقات کو وجود میں لاناچاہاتواربوں کھربوں چیزیں وجود میں آگئیں۔اللہ تعالیٰ کا یہ وصف ہے کہ اللہ نے ایک لفظ 'کن' کہہ کر بجلی کو تخلیق کیا۔آدم نے اختیاری طور پر یاغیر اختیاری طور پر جب بجلی کے علم کے اندر تفکر کیاتواس بجلی سے ہزاروں چیزیں وجود میں آگئیں۔بجلی سے جتنی چیزیں روحانی نقطۂ نظر سے اللہ کی اس تخلیق میں سے دوسری ذیلی تخلیقات کامظہر بنناآدم زاد کادراصل بجلی کے اندر تصرف ہے۔یہ وہی علم ہے جو اللہ نے آدم کو سکھادیاتھااسماء سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے آدم کوایک ایساعلم سکھادیاکہ جو براہ راست تخلیقی فارمولوں سے مرکب ہے۔

جب انسان اس علم کوگہرائی کے اندر جاکر حاصل کرتاہے اور اس علم کے ذریعے تصرف کرتاہے تونئی نئی چیزیں سامنے آجاتی ہیں۔

کائنات دراصل ایک علم ہے۔ایساعلم جس کی بنیاد اور حقیقت سے اللہ نے بندوں کو وقوف عطاکردیاہے لیکن اس وقوف کو حاصل کرنے کے لئے ضروری قرار دے دیاہے کہ بندے علم کے اندر تفکر کریں۔اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایاہے کہ ہم نے لوہا نازل کیااور اس کے اندر لوگوں کے لئے بے شمار فائدے محفوظ کردیئے۔جن لوگوں نے لوہے کی حیثیت اور طاقت کو تسلیم کرکے لوہے میں تفکر کیاتولوگوں کے سامنے لوہے کی لامحدود صلاحیتیں آگئیں اور جب ان صلاحیتوں کواستعمال کرکے لوہے کے اجزائے ترکیبی کو متحرک کردیاتولوہاایک ایسی عظیم شئے بن کر سامنے آیاکہ جس سے موجودہ سائنس کی ہر ترقی کسی نہ کسی طرح وابستہ ہے۔یہ ایک تصرف ہے جو وسائل میں کیاجاتاہے یعنی ان وسائل میں جن وسائل کاظاہراً وجود ہمارے سامنے ہے۔جس طرح لوہا

ایک وجود ہے اسی طرح روشنی کا بھی ایک وجود ہے۔ وسائل کی حدود سے گزر کر یا وسائل کے علوم سے آگے بڑھ کر جب کوئی بندہ روشنیوں کا علم حاصل کرتا ہے تو جس طرح لوہے (دھات) میں تصرف کے بعد وہ عظیم مشینیں کل پرزے جہاز، ریل گاڑیاں، خطرناک اور بڑے بڑے بم اور دوسری ترقیوں میں لوہے کو استعمال کرتا ہے۔ اس طرح روشنیوں کا علم حاصل کرکے وہ روشنیوں کے ذریعے بہت ساری تخلیقات وجود میں لے آتا ہے۔

وسائل میں محدود رہ کر ہم سونے کے ذرات کو اکٹھا کرکے ایک خاص پروسیس (Process) سے گزار کر سونا بناتے ہیں۔ لوہے کے ذرات اکٹھا کرکے خاص پروسیس سے گزار کر ہم لوہا بناتے ہیں۔ اسی کو وسائل میں تصرف کا نام دیا جاتا ہے لیکن وہ بندہ جو روشنیوں میں تصرف کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ اس کے لئے سونے کے ذرات کو مخصوص پروسیس سے گزارنا ضروری نہیں ہے وہ اپنے ذہن میں روشنیوں کا ذخیرہ کرکے ان مقداروں کو الگ کرلیتا ہے جو مقداریں سونے کے اندر کام کرتی ہیں اور ان مقداروں کو ایک نقطہ سے مرکوز کرکے ارادہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ’’سونا‘‘ اور سونا بن جاتا ہے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی تخلیق میں کسی کا محتاج نہیں ہے، جب وہ کوئی چیز تخلیق کرتا ہے تو تخلیق کے لئے جتنے وسائل موجود ہونا ضروری ہیں وہ خود بخود موجود ہو جاتے ہیں اور بندے کا تصرف یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی تخلیق کا تصرف کرتا ہے۔ تصرف کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ وسائل میں محدود رہ کر وسائل کو مجتمع کر کے کوئی نئی چیز بنائی جاتی ہے اور دوسرا طریقہ روشنیوں میں تصرف کرنا ہے۔ یعنی کوئی چیز جن روشنیوں پر قائم ہے ان روشنیوں میں حرکت دے کر تصرف کیا جاتا ہے اور تصرف کا یہ طریقہ انسان کے اندر موجود ان روشنیوں سے متعلق ہے، جن روشنیوں کو قلندر بابا اولیاءؒ نے نسمہ کہا ہے روشنیوں کے اس ذخیرے کو استعمال کرنے کا طریقہ ہی دراصل روحانیت ہے۔ روحانیت میں یہ بات دن کی روشنی کی طرح سامنے آجاتی ہے کہ زمین پر موجود یا کائنات میں موجود ہر شئے کی بنیاد اور بساط روشنی ہے اور یہ روشنی اللہ کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہر صفت معین مقداروں کے ساتھ قائم ہے اور معین مقداروں کے ساتھ تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ پیدائش سے موت تک کا زمانہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ کوئی بچہ اپنی ایک حیثیت پر قائم نہیں رہتا۔ جن معین مقداروں پر بچہ پیدا ہوا ہے، ان معین مقداروں میں ایک ضابطہ، ایک قانون اور ایک ترتیب کے ساتھ ردو بدل ہوتا رہتا ہے جس طرح مقداروں میں ردو بدل ہوتا رہتا ہے اسی مناسبت سے انسان بھی بدلتا رہتا ہے۔ بچہ، جوان ہو، بوڑھا ہو، بہر صورت وہ انسان ہے یعنی اس کی شکل وصورت اور خدوخال میں تو تبدیلی ہوتی رہتی ہے لیکن نوع انسانی کی شکل وصورت برقرار رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کے کنبے کو مختلف نوعوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک معین مقدار یہ ہے کہ انسان ہر حال میں انسان رہتا ہے لیکن اس کے خدوخال تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

ایک بکری کا بچہ بہر صورت بکری کا بچہ رہتا ہے لیکن عمر کے ساتھ ساتھ اس کے اندر زندگی گزارنے کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں۔

اب اس بات کو اس طرح کہا جائے گا کہ معین مقداریں دورخ پر قائم ہیں۔ایک رخ یہ ہے کہ اس میں ردوبدل ہوتا رہتا ہے اور دوسرا رخ یہ ہے کہ بظاہر کوئی ردوبدل واقع نہیں ہوتا۔ردوبدل یہ ہے کہ پیدا ہونے والے بچے کے نقوش جوانی میں سرتاپا بدل جاتے ہیں۔جوانی کے بعد بڑھاپا آجاتا ہے۔بڑھاپے میں جوانی کے نقوش ڈھل جاتے ہیں اور اس طرح ماضی میں چلے جاتے ہیں یا مٹ جاتے ہیں کہ جوانی کی تصویر اور بڑھاپے کی تصویر دو الگ الگ تصویریں نظر آتی ہیں۔اس کو معین مقداروں میں ردوبدل کا نام دیا جاتا ہے اور وہ مقداریں جو قائم بالذات ہیں، یہ ہیں کہ آدمی ایک دن کا بچہ ہو یا سو سال کا بوڑھا، بھوک کا تقاضہ اس کے اندر موجود ہے۔پانی پینے کا تقاضا اس کے اندر موجود ہے۔عجیب رمز ہے کہ دو سال کا بچہ پانی پیتا ہے، دو سال کا بچہ غذا کھاتا ہے، سو سال کا بوڑھا آدمی بھی پانی پیتا ہے، سو سال کا بوڑھا آدمی بھی غذا کھاتا ہے لیکن سو سال کا بوڑھا، دو سال کا بچہ نہیں ہوتا اور دو سال کا بچہ، سو سال کا بوڑھا نہیں ہوتا۔

بتانا یہ مقصود ہے کہ روحانی علوم ہمارے اوپر یہ بات واضح کرتے ہیں کہ باوجود اس کے کہ تقاضے، بڑھاپے اور بچپن میں یکساں ہیں، صورت و شکل اور خدوخال میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔شکل و صورت اور خدوخال میں ردوبدل اللہ تعالیٰ کے کون سے علوم کرتے ہیں، ان علوم سے روشناس ہونے کے لئے پہلی بات ضروری ہے کہ ہم ان روشنیوں کا علم حاصل کریں جن روشنیوں کو اللہ نے اپنی صفات کہا ہے۔

علم کا مظاہرہ

سوال: آپ فرماتے ہیں کہ یہ کائنات اللہ کے علم کا مظاہرہ ہے اس کی وضاحت فرمادیں۔

جواب: اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے۔ ''اللہ وہ ہے جو ہر چیز پر محیط ہے۔'' یہ بھی ارشاد ہے کہ ''جو کچھ تم کرتے و، اللہ اسے دیکھتا ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو، اللہ اسے جانتا ہے۔ اگر تم ایک ہو تو دوسرا اللہ ہے اور اگر تم دو ہو تو تیسرا اللہ ہے۔ اللہ ہی ابتدا ہے، اللہ ہی انتہا ہے۔''

ان سارے ارشادات میں یہ بات پوری طرح واضح کر دی گئی ہے کہ اللہ کا علم لا محدود، غیر متغیر اور لا متناہی اس لئے ہے کہ یہ علم Time and Space کی حد بندیوں سے ماوراء ہے۔ ان ارشادات سے یہ بات بھی منکشف ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جب اپنے علم کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس سے منشاء خالصتاً آزادی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب کائنات بنانے کا ارادہ کیا تو فرمایا کن اور کائنات وجود میں آ گئی۔ اس بات کو آسان الفاظ میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ کائنات دراصل اللہ تعالیٰ کا علم ہے۔ چونکہ علم کا مظاہرہ ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ کے علم نے کائنات کے خدوخال کا روپ اختیار کیا ہے، اس لئے پوری کائنات بھی بجز علم کے کوئی اور حیثیت نہیں رکھتی۔ علم کی حیثیت زیادہ ہو یا قلیل، بہر حال وہ علم ہے۔ اس کو ہم اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ سمندر کے پانی کا ایک قطرہ بہر حال سمندر ہے۔ سمندر سے لئے ہوئے ایک قطرۂ آب کو پانی کے علاوہ کوئی دوسرا نام نہیں دیا جاسکتا۔ چونکہ ساری کائنات اللہ تعالیٰ کے علم کا مظاہرہ ہے، اس لئے کائنات کی حقیقت، کائنات کی بنیاد اور کائنات کی ہیئت سوائے علم کے کچھ نہیں ہے۔ جب ہم عالم ناسوت میں بند زندگی کا تجزیہ کرتے ہیں اور زندگی کے اندر غور و فکر کرتے ہیں تو یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ساری زندگی کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور علم اس وقت علم ہے جب اس کے اندر معانی اور مفہوم موجود ہوں۔ علم کے اندر معانی اور مفہوم کی ایک طرز یہ ہے کہ بندہ اپنے اختیارات سے علم کے اندر معنی پہناتا ہے اور علم کے اندر اصل مفہوم وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے ذہن میں ہے۔ بظاہر کائنات میں غور کرنے سے عجیب قسم کی پریشانی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا نظام قائم کیا ہے کہ جس نظام میں زیادہ تر تکلیف و قباحت ہے مثلاً یہ کہ کوئی آدمی کھائے بغیر نہیں رہ سکتا، ہر آدمی سونے پر مجبور ہے۔ اتنی بندشیں ہیں کہ جن کا کوئی شمار نہیں۔ علم کا یہ مفہوم اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود علم سے الگ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم سے فرمایا کہ اے آدم! تو اور تیری بیوی جنت میں رہو

اور خوش ہو کر کھاؤ جہاں سے دل چاہے۔ جنت ایک ایسی بستی ہے کہ جس کے رقبے کی حدود کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی اس کی حدود لا متناہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ خوش ہو کر کھاؤ جہاں سے دل چاہے، یہ ظاہر کرتا ہے کہ آدم کو اللہ نے لا محدود جنت کے رقبے پر تصرف عطا کر دیا تھا۔ بالالفاظ دیگر آدم جنت کے لا محدود رقبے پر بلا شرکت غیرے مالک تھے۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ یہ درخت ہے اس کے قریب مت جانا۔ اور اگر تم نے ہمارے اس حکم یا ہدایت پر عمل نہیں کیا تو تم اپنے اوپر ظلم کرو گے۔ جنت لا محدود رقبہ ہے۔ اس میں لا تعداد اور لا شمار درخت ہیں۔ ایک مخصوص درخت کی طرف اللہ تعالیٰ اشارہ کر کے آدم کو ہدایت کرتے ہیں کہ اس درخت کے قریب مت جانا۔ آدم سے نافرمانی واقع ہوئی اور اس نافرمانی کے جرم میں جنت کی فضاؤں نے آدم کو رد کر دیا۔ اور آدم جس سرزمین کے بلا شرکت غیرے مالک تھے وہ زمین ان سے چھین لی گئی۔ اس واقعہ کا نقشہ کچھ اس طرح بنتا ہے۔ ایک بہت وسیع و عریض باغ ہے۔ باغ کے پھل، پھول، پودوں، نہروں، آبشاروں وغیرہ پر آدم کو پورا پورا تصرف حاصل ہے۔ باغ کے اندر صرف ایک درخت ایسا ہے جس پر اسے تصرف تو حاصل ہے لیکن تصرف کو اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ جب تک آدم سے نافرمانی کا ارتکاب نہیں ہوا، آدم کے لئے جنت کا وسیع رقبہ Time and Space سے آزاد رہا اور جب آدم سے نافرمانی سرزد ہو گئی تو آدم کے اندر زمان و مکاں کی حد بندیاں ظاہر ہو گئیں۔ اس درخت کے بارے میں بہت سی باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ گیہوں کا درخت تھا۔ کوئی کہتا ہے سیب تھا۔ کسی مذہب و مسلک کے لوگ کہتے ہیں کہ وہ درخت انگور کا تھا۔ علیٰ ہذالقیاس، مختلف لوگ مختلف باتیں کہتے ہیں۔ لیکن قرآن نے اس کا کوئی نام نہیں رکھا۔ صرف درخت کے نام سے یاد کیا ہے۔ روحانی نقطۂ نظر سے جب لاشعوری واردات و کیفیات میں اس درخت کا مشاہدہ کیا جاتا ہے تو دراصل یہ ایک طرز فکر کا سمبل ہے۔

جنت میں ہو یہ رہا ہے کہ جو کچھ جنت میں موجود ہے وہ دروبست آدمی کے ارادے کے تابع ہے۔ آدمی کا دل چاہا کہ وہ سیب کھائے۔

جنت میں سیب کا درخت بھی ہے' اس پر سیب لگے ہوئے بھی ہیں۔ لیکن سیب کا توڑنا وہاں زیر بحث نہیں آتا۔ سیب کھانے کو دل چاہا اور سیب موجود ہو گیا۔ پانی پینے کو دل چاہا اور پانی موجود ہو گیا۔ اس طرز فکر سے تصرف کی دو طرزیں سامنے آتی ہیں۔ تصرف کی ایک طرز فکر یہ ہے کہ ایک بندہ سیب کا درخت لگاتا ہے۔ اس کی نشو و نما کا انتظار کرتا ہے۔ طویل عرصے کے بعد سیب کا درخت اس قابل ہوتا ہے کہ اس کے اوپر پھل لگے۔ اس کے اندر سیب کھانے کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور وہ درخت کی طرف چلتا ہے اور درخت پر سے سیب توڑ کر کھا لیتا ہے۔ تصرف کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ سیب کے درخت پر سیب لگے ہوئے ہیں۔ اس درخت کو نہ کسی بندے نے زمین پر بویا ہے، نہ اس کی نگہداشت کی ہے، نہ اس درخت کو پروان چڑھانے میں کوئی خدمت انجام دی ہے اور نہ اسے درخت پر سے سیب توڑنے کی زحمت کرنا پڑتی ہے۔ دل چاہا کہ سیب کھاؤں اور سیب موجود ہو گیا۔ اس میں ایک بہت باریک نکتہ بیان ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ارادے میں یہ بات موجود تھی کہ کائنات وجود میں آئے۔اللہ تعالیٰ نے کہا''کن'' کائنات وجود میں آ جا۔کائنات بن گئی۔جنت کی زندگی میں آدم کے دماغ میں یہ بات موجود تھی کہ وہ سیب کھائے۔آدم نے کہاسیب،اور سیب موجود ہو گیا۔کن کہنے سے کائنات بن گئی،سیب کہنے سے سیب مل گیا۔اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنی ذات کے لئے احسن الخالقین کہہ کر بیان کیاہے کہ میں تخلیق کرنے والوں میں بہترین خالق ہوں،یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے علاوہ بھی مخلوق کو تخلیق کرنے کی صلاحیتوں سے نوازاہے۔انسانی تخلیق اور اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں حد فاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وسائل کے بغیر محض علمی بنیاد پر تخلیق فرماتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے ذہن میں جو کچھ تھا،اس کے بارے میں ''کن'' کہہ کر ان تمام چیزوں کو جو اللہ تعالیٰ ظاہر فرماناچاہتے تھے، تخلیق کر دیا۔آدم کے اندر اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی جو تخلیقی صلاحیتیں کام کر رہی ہیں وہ وسائل کی محتاج ہیں۔جب تک کوئی بندہ ان تخلیقی صلاحیتوں کو زمان و مکاں کی حد بندیوں سے آزاد رہ کر استعمال کرتاہے وہ سب جنت کی زندگی ہے اور جب کوئی بندہ ان تخلیقی صلاحیتوں کو زمان و مکاں کی حد بندیوں کے اندر اور وسائل کے اندر بند کر دیتاہے،اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق یہ جہالت اور ظلم ہے۔جس طرح عقل و شعور اور دانائی ایک درخت کی طرح پھلتی پھولتی ہے یعنی علم کے اندر طرح طرح کی شاخیں پھولتی ہیں، نئے نئے فلسفے کی داغ بیل پڑتی ہے،طرح طرح کی ایجادات ہوتی ہیں،اسی طرح ظلم و جہالت کے درخت پر بھی پھول،پتے اور شاخیں اُگتی ہیں۔لیکن چونکہ بنیاد ظلم اور جہالت پر ہوتی ہے اس لئے آدمی ان ساری ایجادات اور ترقیوں سے خوش ہونے کی بجائے ناخوش ہوتاہے۔پرسکون ہونے کی بجائے بے سکون ہو جاتاہے۔مطمئن ہونے کی بجائے غیر مطمئن زندگی گزارتاہے۔اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی روشنی میں جب ہم موجودہ سائنسی ترقیوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس ترقی میں وہ تمام چیزیں ملتی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ظلم اور جہالت کے نام سے بیان فرمایاہے۔آج کی ترقی پوری نوع انسانی کے لئے ایک عذاب بن گئی ہے۔ہر شخص غیر مطمئن اور بے سکون ہے۔دنیاکے اس کونے سے اس کونے تک عدم تحفظ کااژدھامنہ کھولے ہوئے پوری نوع انسانی کو نگلنے کے لئے بے قرار ہے۔حالانکہ جہاں تک ترقی کا معاملہ ہے یہ ساری ترقیاں،یہ ساری ایجادات،یہ ساری تخلیقات اس خیال کے تحت وجود میں آئی ہیں کہ نوع انسانی کو سکون ملے گا۔لیکن چونکہ یہ تمام چیزیں Time and Space میں بند ہو کر معرض وجود میں آئی ہیں اس لئے آدمی بدحال اور پریشان ہے۔جنت کی زندگی ہمیں یہ بتاتی ہے کہ جب آدم نے اللہ تعالیٰ کی واضح ہدایت کو پس پشت ڈال دیاتو وہ مصائب اور آلام میں گرفتار ہو گیا۔قرآن پاک میں ہے۔

''اتر جاؤ!اب تمہارے اوپر ذلت اور مسکنت کی مار ہے۔''

یہ بات بالوضاحت بیان کی جاچکی ہے کہ کائنات اور کائنات میں موجود تمام تخلیقات،تخلیقات میں تمام نوعیں اور ہر نوع کے الگ الگ افراد،افراد کا پھیلنا اور سمٹنا،پیدائش کا تسلسل اور موت کا وارد ہونا،ارض و سماوات،سورج،چاند،ستارے،بے شمار کہکشانی نظام،جنت،دوزخ اور جنت دوزخ کے اندر زندگی گزارنے کے تمام حواس اور تقاضے،حواس میں ردوبدل اور ردوبدل کے ساتھ

حواس میں کمی بیشی، ذہنی رفتار کا گھٹنا یا بڑھنا، حواس کا الگ الگ تعین۔ سننا، دیکھنا، چھونا، چکھنا، محسوس کرنا، جسمانی خدوخال کا الٹ پلٹ ہونا، جذبات میں اشتعال پیدا ہونا یا کسی بندے، کسی ذی روح کا نرم خو ہونا۔ یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود علم کا عکس ہیں۔

کائنات میں موجود کوئی ایک شئے۔۔۔۔۔اس کی حیثیت کسی بڑے سے بڑے ستارے(Star) کی ہو یا زمین کے چھوٹے سے چھوٹے ذرے(Atom) کی ہو، اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے ذہن کے اندر اس خوبصورت دنیا کو مظہر بنانا چاہا تو فرمایا "کن" اور کائنات میں موجود تمام چیزیں من و عن اسی طرح جس طرح اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود تھیں یا ہیں ایک تخلیقی وجود میں ظاہر ہو گئیں۔ تخلیقات کا یہ سلسلہ یا کنبہ اتنا وسیع ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے۔ "سارے سمندر روشنائی بن جائیں اور سارے درخت قلم بن جائیں پھر بھی اللہ تعالیٰ کی باتیں پوری نہیں ہو نگی۔" اللہ تعالیٰ نے کائنات کو کیوں بنایا؟ اور یہ ساری خوبصورت تخلیقات کیوں عمل میں آئیں؟ جنت دوزخ کے دو الگ الگ گروہ کیوں وجود میں آئے؟ ظاہری دنیا کے عجائبات اور غیب کی دنیا کے لامحدود عجائبات کو کیوں بنایا گیا؟ اس کی وجہ خود اللہ تعالیٰ بیان فرماتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ "میں چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ ایک ایسی کائنات تخلیق کروں جو مجھ سے متعارف ہو کر مجھے پہچان لے۔" اس حدیث قدسی میں تفکر کرنے سے یہ بات واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ کائنات کی تخلیق کا منشا بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ مجھے پہچانا جائے۔ پہچاننے کے لئے ضروری ہے کہ تمام مخلوقات میں سے کسی ایک مخلوق کا انتخاب کیا جائے اور اس منتخب مخلوق کو دوسری مخلوقات کے مقابلے میں زیادہ علم دیا جائے۔ نہ صرف یہ کہ علم دیا جائے علم کے اندر مفہوم اور معنویت تلاش کرنے کی صلاحیت عطا کی جائے۔ جہاں تک علم کی تقسیم کا تعلق ہے، ہر ذی روح کے اندر علم موجود ہے۔ ایک بکری یہ جانتی ہے کہ درخت کے پتے میری غذا ہیں۔ لیکن بکری یہ نہیں جانتی کہ بیری کا درخت کس طرح اگتا ہے اور درخت سے درخت اور دوسرے درخت سے تیسرا درخت کیسے اگا یا جاتا ہے۔ بھوک پیاس کا علم تمام مخلوقات میں قدر مشترک ہے خواہ وہ ذی روح ہوں یا انہیں ذی روح نہ سمجھا جاتا ہو۔

مخلوق کی دو نوعیں ایسی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے علم کے اندر معانی تلاش کرنے اور مفہوم پہنانے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ ایک انسان اور دوسرے جنات۔ جنات کی تخلیق کے فارمولے بیان کرنا اس وقت ہمارے پیش نظر نہیں ہے۔ چونکہ اب تک ان اسباق کو انسان تک محدود رکھا گیا ہے اس لئے انسانی علم ہی ہمارے پیش نظر ہے۔

ذرا تفصیل سے اس بات کو دوسرے پیرائے میں بیان کیا جاتا ہے تاکہ ذہن کے اوپر الگ سے جو بار پڑ سکتا ہے اس کی شدت کم سے کم ہو جائے۔ ابھی یہ بات عرض کی گئی ہے کہ کائنات دراصل اللہ تعالیٰ کا وہ علم ہے جو اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود تھا۔ یعنی اللہ تعالیٰ

اس بات سے واقف تھے کہ کائنات کے تخلیقی خدوخال کیا ہیں۔ اپنے علم کے مطابق اللہ تعالیٰ نے تخلیقی خدوخال کو اپنے حکم اور ارادے سے شکل و صورت بخش دی۔ اس کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنا مخصوص اور ذاتی علم شکل و صورت بن کر وجود میں آ گیا۔ اب ہم یوں کہیں گے کہ کائنات کی بنیاد، کائنات کی حقیقت علم اور صرف علم ہے۔ یعنی کائنات نام ہے صرف اللہ تعالیٰ کے علم کا۔ جب تک یہ علم، علم تھا اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود تھا اور جب اللہ تعالیٰ کے ذہن میں یہ علم اپنے معنی، مفہوم اور نقش و نگار کے ساتھ ظاہر ہوا تو اس کا نام کائنات بن گیا۔ اب اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ بندے مجھے پہچانیں، میرا تعارف حاصل کریں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ خود ایک علم میں ایسا علم جو ماوراء اور تمام علوم پر محیط ہے، اس لئے ضروری ہوا کہ مخلوقات میں سے کسی ایک مخلوق کا انتخاب کر کے اسے علم کی دولت سے نوازا جائے۔ قرعہ فال آدم کے حق میں نکلا۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو علم سکھایا۔ وعلم ادم الاسماء کلھا اپنی صفات اور اسماء کا علم عطا کیا۔ اسماء سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ صفات ہیں جو صفات کائنات کے خدوخال میں موجود ہیں۔ یہ وہ علم ہے جو آدم کے لئے مخصوص ہے۔ یہ ایسا علم ہے کہ جس سے فرشتے بھی ناواقف ہیں۔ اس علم کی حیثیت اتنی عظمت والی ہے کہ جب یہ علم آدم نے سیکھ لیا تو فرشتوں کو آدم کے سامنے جھکنا پڑا۔ علم ادم الاسماء سے مراد یہ ہے کہ آدم کو اللہ تعالیٰ نے یہ بتا دیا کہ کائنات میرے ذاتی علم کا ایک حصہ ہے اور اس علم میں معانی اور مفہوم کے ساتھ بے شمار فارمولے ہیں، جن فارمولوں پر کائنات کی تخلیق کی گئی ہے۔ آدم کو کائناتی تخلیق کے فارمولے سکھانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے جنت میں بھیج دیا۔ یہ بات بہت زیادہ اہم ہے کہ اس وقت جنت میں آدم کی پوزیشن ایک ایسے سائنس دان کی ہے جو کائنات کے تخلیقی فارمولوں کا عالم ہے۔ ان فارمولوں میں بنیادی فارمولا یہ ہے کہ ساری کائنات ایک علم ہے۔ اور آدم اس علم میں معانی اور مفہوم کے ساتھ تصرف کر سکتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ''کن'' ارشاد فرما کر ساری کائنات کو وجود عطا کر دیا ہے، اسی طرح کائنات میں موجود تمام تخلیقات پر فی الارض خلیفۃ کی حیثیت سے آدم کو تصرف کرنے کا اختیار ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جہاں کائنات کی تخلیق کا تذکرہ کیا ہے وہاں یہ بھی فرمایا ہے کہ میں تخلیق کرنے والوں میں بہترین خالق ہوں۔ اللہ تعالیٰ بحیثیت خالق کے ایک ایسے خالق ہیں کہ جن کی تخلیق میں وسائل کی پابندی زیر بحث نہیں آتی۔ اللہ تعالیٰ کے ارادے میں جو چیز جس طرح اور جن خدوخال میں موجود ہے، جب وہ اس چیز کو وجود بخشنے کا ارادہ کرتے ہیں تو حکم دیتے ہیں اور اس حکم کی تعمیل میں تخلیق کے اندر جتنے وسائل ضروری ہیں وہ سب وجود میں آکر تخلیق کو عمل میں لے آتے ہیں۔

''خالقین'' کا لفظ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور بھی تخلیق کرنے والے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی طرح دوسری ہر تخلیق وسائل کی پابند اور محتاج ہے۔ اس کی مثال آج کے دور میں بجلی سے دی جا سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ایک تخلیق بجلی (Electric) ہے۔ جب بندوں نے اس تخلیق سے دوسری ذیلی تخلیقات کو وجود میں لانا چاہا تو اربوں کھربوں چیزیں وجود میں آ گئیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ وصف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک لفظ ''کن'' کہہ کر بجلی کو تخلیق کر دیا۔ آدم نے اختیاری طور پر یا غیر اختیاری

طور پر جب بجلی کے علم کے اندر تفکر کیا تو اس بجلی (Electricity) سے ہزاروں چیزیں وجود میں آگئیں۔ بجلی سے جتنی چیزیں وجود میں آئیں وہ انسان کی تخلیق ہیں۔ مثلاً ریڈیو، ٹی وی، لاسلکی نظام اور دوسری بے شمار چیزیں۔ روحانی نقطہ نگاہ سے اللہ تعالیٰ کی اس تخلیق میں سے دوسری ذیلی تخلیقات کا مظہر بننا، آدم زاد کا دراصل بجلی کے اندر تصرف ہے۔ یہ وہی علم ہے جو اللہ تعالیٰ نے آدم کو سکھا دیا تھا۔ اسماء سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو ایک ایسا علم سکھا دیا جو براہ راست تخلیقی فارمولوں سے مرکب ہے۔ جب انسان اس علم کو گہراء کے اندر جا کر حاصل کرتا ہے اور اس علم کے ذریعے تصرف کرتا ہے تو نئی نئی چیزیں سامنے آجاتی ہیں۔ بات یہی ہے کہ کائنات دراصل ایک علم ہے، ایسا علم جس کی بنیاد حقیقت سے اللہ تعالیٰ نے بندوں کو وقوف عطا کر دیا ہے۔ لیکن اس وقوف کو حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری قرار دے دیا ہے کہ بندے علم کے اندر تفکر کریں۔ یہ بات ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا۔ ’’ہم نے لوہا نازل کیا اور اس کے اندر لوگوں کے لئے بے شمار فائدے ذخیرہ کر دیئے۔‘‘ جن لوگوں نے لوہے کی حیثیت اور طاقت کو تسلیم کر کے لوہے کی صفات میں تفکر کیا، ان لوگوں کے سامنے لوہے کی لامحدود صلاحیتیں آگئیں اور جب ان صلاحیتوں کو استعمال کر کے لوہے کے اجزائے ترکیبی کو متحرک کر دیا تو لوہا ایک ایسی عظیم شئے بن کر سامنے آیا کہ جس سے موجودہ سائنس کی ہر چیز، ہر ترقی کسی نہ کسی طرح وابستہ ہے۔ یہ ایک ایسا تصرف ہے جو وسائل میں کیا جاتا ہے یعنی ان وسائل میں جن وسائل کا ظاہری وجود ہمارے سامنے ہے۔ جس طرح لوہا ایک تخلیق ہے اسی طرح روشنی بھی ایک تخلیق ہے۔ وسائل کی حدود سے گزر کر یا وسائل کے علوم سے آگے بڑھ کر جب کوئی بندہ روشنیوں کا علم حاصل کرتا ہے تو جس طرح لوہے میں تصرف کے بعد وہ عظیم الجثہ مشینیں، کل پرزے، جہاز، ریل گاڑیاں، بڑے بڑے بم اور دوسری ترقیوں میں لوہے کا استعمال کرتا ہے اسی طرح روشنیوں کے علوم حاصل کر کے وہ روشنیوں کے ذریعے بہت ساری تخلیقات وجود میں لے آتا ہے۔ تصوف میں اسی بات کو ’’ماہیت قلب‘‘ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وسائل میں محدود رہ کر ہم سونے کے ذرات کو اکٹھا کر کے ایک خاص پروسیس سے گزار کر سونا بناتے ہیں۔ اس کو وسائل میں تصرف کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن وہ بندہ جو روشنیوں میں تصرف کرنے کا اختیار رکھتا ہے اس کے لئے سونے کے ذرات کو مخصوص پروسیس سے گزارنا ضروری نہیں ہے۔ وہ اپنے ذہن میں روشنیوں کا ذخیرہ کر کے ان مقداروں کو الگ کر لیتا ہے جو مقداریں سونے کے اندر کام کر رہی ہیں اور ان مقداروں کو ایک نقطہ پر مرکوز کر کے ارادہ کرتا ہے اور کہتا ہے ’’سونا‘‘ سونا بن جاتا ہے۔

اس بات کو دوبارہ بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی تخلیق میں کسی کے محتاج نہیں ہیں۔ جب وہ کوئی چیز بنانا چاہتے ہیں تو ’’کن‘‘ کے ساتھ تخلیق کے لئے جتنے وسائل کا ہونا ضروری ہے وہ خود بخود تخلیق ہو جاتے ہیں اور بندے کا تصرف یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی تخلیق میں تصرف کرتا ہے۔ تصرف کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ وسائل میں محدود رہ کر وسائل کو مجتمع کر کے کوئی نئی چیز بنائی جاتی ہے اور دوسرا طریقہ روشنیوں میں تصرف کرنا ہے یعنی کوئی چیز جن روشنیوں پر قائم ہے، ان روشنیوں کی مقداروں میں

ردوبدل کر کے تصرف کیا جاتا ہے۔ تصرف کا یہ طریقہ انسان کے اندران روشنیوں سے متعلق ہے جن روشنیوں کو اللہ تعالیٰ نے علم الاسماء کہا ہے۔ روشنیوں کے اس ذخیرے کو حاصل کرنے کا طریقہ ہی دراصل روحانیت ہے۔ روحانیت میں یہ بات دن کی روشنی کی طرح سامنے آجاتی ہے کہ زمین پر موجود اور پوری کائنات میں موجود ہر شئے کی بنیاد اور بساط روشنی ہے اور یہ روشنی اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہر صفت معین مقداروں کے ساتھ قائم ہے اور معین مقداروں کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے اور معین مقداروں کے ساتھ گھٹتی بڑھتی ہے۔ پیدائش سے موت تک کا زمانہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ کوئی بچہ اپنی ایک حیثیت پر قائم نہیں رہتا۔ جن معین مقداروں پر بچہ پیدا ہوا ہے ان معین مقداروں میں ایک ضابطہ، ایک قانون اور ایک ترتیب کے ساتھ ردوبدل ہوا رہتا ہے۔ جس طرح مقداروں میں ردوبدل ہوتا رہتا ہے اسی مناسبت سے آدمی بھی بدلتا رہتا ہے۔ یہاں دو طرزیں زیر غور آتی ہیں۔ آدم کا بچہ، بچہ ہو، جوان ہو، بوڑھا ہو بہر صورت وہ آدمی رہتا ہے۔ یعنی اس کی شکل و صورت اور خدوخال میں تو تبدیلی ہوتی رہتی ہے لیکن نوع انسانی کی شکل و صورت برقرار رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کے کنبے کو مختلف نوعوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک معین مقدار یہ ہے کہ انسان ہر حال میں انسان رہتا ہے لیکن اس کے خدوخال تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اور زندہ رہنے کے تقاضوں میں ردوبدل ہوتا رہتا ہے۔ ایک بکری کا بچہ بہر صورت بکری کا بچہ رہتا ہے لیکن عمر کے ساتھ ساتھ اس کے اندر زندگی گزارنے کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں۔ اب اس بات کو اس طرح کہا جائے گا کہ معین مقداریں دو رخ پر قائم ہیں۔ ایک رخ یہ ہے کہ اس میں ردوبدل یہ ہے کہ پیدا ہونے والے بچے کے نقوش جوانی میں سرتاپا بدل جاتے ہیں۔ جوانی کے بعد بڑھاپا آتا ہے تو بڑھاپے میں جوانی کے نقوش ڈھل جاتے ہیں اور اس طرح ڈھل جاتے ہیں یا مٹ جاتے ہیں کہ جوانی کی تصویر اور بڑھاپے کی تصویر دو الگ الگ تصویریں نظر آتی ہیں۔ اس کو معین مقداروں میں ردوبدل کا نام دیا جاتا ہے اور وہ مقداریں جو قائم بالذات ہیں یہ ہیں کہ آدمی ایک دن کا بچہ ہو یا سو سال کا بوڑھا ہو، بھوک کا تقاضا اس کے اندر موجود ہے، پانی پینے کا تقاضا اس کے اندر موجود ہے۔ عجیب رمز ہے کہ دو سال کا بچہ بھی پانی پیتا ہے، دو سال کا بچہ بھی غذا کھاتا ہے۔ سو سال کا بوڑھا آدمی بھی پانی پیتا ہے، سو سال کا بوڑھا آدمی بھی غذا کھاتا ہے۔ لیکن سو سال کا آدمی دو سال کا بچہ نہیں ہوتا اور دو سال کا بچہ سو سال کا بوڑھا آدمی نہیں ہوتا۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ روحانی علوم ہمارے اوپر یہ بات واضح کرتے ہیں کہ بڑھاپے اور بچپن کے تقاضے یکساں ہونے کے باوجود صورت، شکل اور خدوخال کیوں تبدیل ہو جاتے ہیں اور صورت شکل اور خدوخال کے ردوبدل میں اللہ تعالیٰ کے کون سے علوم کام کر رہے ہیں۔ ان علوم سے روشناس ہونے کے لئے پہلی بات یہ ضروری ہے کہ ہم ان روشنیوں کا علم حاصل کریں جن روشنیوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کہا ہے۔

باب چہارم

علم حصولی

سوال: روحانیت میں علم حصولی کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اس کے حصول کا کیا طریقہ ہے؟ مہربانی فرما کر بتائیں۔

جواب: ہم نے علوم کو دو درجوں میں بیان کیا ہے ایک کا نام علم حصولی قرار پایا اور دوسرے کا نام علم حضوری رکھا گیا۔ علم حصولی اور علم حضوری کے ضمن میں عقل اور وجدان کی مختصر تشریح بھی بیان کی گئی۔ مثالوں سے یہ واضح کر دیا گیا کہ عقل کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے ہم جو کچھ دیکھتے، سنتے، سمجھتے اور محسوس کرتے ہیں ہمارے پاس کوئی ایسی علمی توجیہہ نہیں ہے کہ ہم اس کو دیکھنے، سننے، چھونے اور محسوس کرنے کو حقیقی عمل قرار دے سکیں۔ بالآخر جب ہم عقلی اور شعوری دائرہ کار میں رہتے ہوئے کسی عمل کا تفکر کے ساتھ اور وجدان کے ساتھ تجزیہ کرتے ہیں تو ہمارے ہاتھ سوائے ٹٹولنے کے کچھ نہیں آتا۔ کسی چیز کو سمجھنے کے لئے بنیادی عمل نظر ہے۔ یعنی جب ہم کسی چیز کو دیکھتے ہیں۔ تب اس چیز کے بارے میں ہمیں مزید معلومات حاصل کرنے کا تجسس پیدا ہوتا ہے۔ دوسری صورت میں جب ہمیں کسی چیز کا یقین حاصل ہوتا ہے تب بھی یہی صورت حال ہمارے دماغ پر وارد ہوتی ہے کہ ہم اس چیز کے بارے میں معلومات حاصل کریں، جس چیز کا ہمیں علم تو حاصل ہوا لیکن ابھی نگاہ کے سامنے نہیں آئی۔ جہاں تک نگاہ کا تعلق ہے اس کے بارے میں یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ نگاہ کا جب تک کوئی ٹارگٹ یا نشانہ نہ بنے، نگاہ اس چیز کو نہیں دیکھ سکتی۔ ضروری ہوا کہ دیکھنے کے لئے نگاہ کے واسطے کوئی مرکزیت قائم ہو اور جس مرکزیت پر نگاہ ٹھہری اس مرکزیت کے اوصاف دماغ کی سکرین پر منعکس ہو گئے۔ قانون یہ بنا کہ نگاہ وہی کچھ دیکھتی ہے جو دماغ کے اوپر منعکس ہوتا ہے۔ اس کو اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ دماغ وہی کچھ محسوس کرتا ہے جو نگاہ دماغ کے اوپر منتقل کر دیتی ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ دیکھنے کی طرزوں میں ہم جب تفکر کرتے ہیں تو دو باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں ایک یہ کہ جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں اس کی معنوی اور حقیقی حیثیت کیا ہے؟ اور دوسری بات یہ ہے کہ وہ چیز حقیقت سے کتنی دور ہے یا کتنی قریب ہے۔ دیکھنے کی یہ دو طرزیں بھی علم حضوری یا علم حصولی کے دائرے میں آتی ہیں۔ علم حصولی کے دائرے میں نظر کا جتنا کام ہے وہ مفروضہ اور فکشن ہے۔ مفروضہ اور فکشن سے مراد یہ ہے کہ اس چیز میں ردوبدل اور تغیر واقع ہوتا رہتا ہے۔ علم حضوری کے اندر جو نظر کام کرتی ہے وہ حقیقت پر مبنی ہوتی ہے اس لئے کہ علم حضوری میں نگاہ جو کچھ دیکھتی ہے اس میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر کسی راہ سلوک کے مسافر نے فرشتے کو دیکھا وہ اگر سو سال بعد بھی اس فرشتے کو دیکھتا ہے تو فرشتے میں کوئی تغیر اور تبدل اسے نظر نہیں آتا۔ وہ کسی بندے کی روح کو دیکھتا ہے، جب بھی دیکھتا

ہے روح اپنے خدوخال کے اعتبار سے وہی نظر آتی ہے جو وہ دیکھ چکا ہے اس کے برعکس ایک آدمی بکر کو جوانی کی عمر میں دیکھتا ہے۔ دس سال بعد جب وہ اس کو دیکھتا ہے، اس کے خدوخال میں نمایاں تبدیلی پیدا ہو چکی ہوتی ہے۔ ردوبدل اور تغیر میں دیکھنا شعوری حواس کا کام ہے اور اس دنیائے ناپیدا کنار کا مشاہدہ کرنا جس میں تغیر اور تبدل نہیں ہے، لاشعوری حواس کا دیکھنا ہے۔ اب بات اس طرح بنی کہ آدمی کی زندگی میں دیکھنے کی دو طرزیں ہیں۔ ایک طرز بالواسطہ اور ایک طرز براہ راست، بالواسطہ دیکھنا شعوری نظر ہے۔ اور براہ راست دیکھنا لاشعوری نظر ہے شعوری نظر سب کی سب مفروضہ اور فکشن ہے۔ لاشعوری نظر سب کی سب غیر مفروضہ، غیر فکشن اور حقیقت ہے۔ انبیاء کرام کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمی فکشن نظر کی نفی کر کے اس نظر کو حاصل کرے جو حقیقت پر مبنی ہے۔ ایک چیز سے گزر کر دوسری چیز میں داخل ہونا یا ایک چیز کو چھوڑ کر دوسری چیز حاصل کرنا اسی وقت ممکن ہے جب ہم چھوڑنے والی چیز سے اپنا تعلق عارضی طور پر یا مستقل طور پر منقطع کر لیں۔ اس رشتہ کو منقطع کرنے کا نام روحانیت میں اپنی نفی کرنا ہے اور جب آدمی اپنی نفی کرتا ہے تو اس کے سامنے مثبت حواس آ جاتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتا ہے لا الہ، نہیں کوئی معبود، الا اللہ۔ مگر اللہ کو جاننے اور اللہ کے اوپر یقین کرنے کے لئے ضروری ہوا کہ پہلے وہ اس اللہ کی نفی کر دے۔ جس اللہ کو وہ مفروضہ حواس سے جانتا ہے۔ سیدنا حضور اکرم ﷺ کی بعثت سے پہلے بے شمار بتوں کی پوجا ہوتی تھی اور لوگ ان بتوں کو خدا کا درجہ دیتے تھے اور ان بتوں سے اسی طرح مرادیں مانگتے اور دعائیں کرتے تھے جس طرح اللہ سے دعا کی جاتی ہے۔ لا الہ کا مطلب یہ ہوا کہ تم جس طرح شعوری حواس میں خدا کو جانتے ہو اس خدا کی نفی کر دو۔ اس خدا سے اپنا رشتہ منقطع کر دو اور یہ رشتہ منقطع کرنے کے بعد اس خدا سے اپنا ذہنی ارتباط اور ذہنی رشتہ قائم کرو جو دیکھا ہوا خدا ہے اور دیکھنے والی ذات محمد ﷺ اللہ کے رسول ﷺ ہیں۔ محمد اللہ کے رسول ﷺ نے جب اللہ کی نشاندہی کی، یہ علم، علم حضوری ہے اور جب تک محمد الرسول اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے خلاف لوگ بتوں کو خدا کا درجہ دیتے رہے یہ سب علم حصولی ہے۔ مختصر یہ کہ آدمی کو حقیقت کے اندر داخل ہونے کے لئے مفروضہ اور فکشن حواس کی نفی کرنا پڑتی ہے۔ روحانیت میں مراقبہ کا عمل اپنی نفی کرنے کے لئے پہلی سیڑھی ہے یعنی آدمی ایک ایسا طریقہ کار استعمال کرتا ہے کہ جس کی کوئی شعوری توجیہہ فی الواقع پیش نہیں کی جا سکتی۔ بجز اس کے کہ مراقبہ کرنے والے بندے کے ذہن میں یہ بات ضرور ہوتی ہے کہ آدمی کے اندر بیک وقت دو نگاہیں کام کرتی ہیں۔ ایک نگاہ محدود ہے اور بغیر کسی میڈیم کے کچھ نہیں دیکھتی۔ دوسری نگاہ غیر محدود ہے اور اس کو کسی میڈیم کی ضرورت نہیں ہے۔ میڈیم سے مراد Space ہے۔ آنکھ یعنی گوشت پوست کی آنکھ Space کے دائرے سے باہر نہیں دیکھ سکتی۔ اگر آنکھ کے سامنے Space حذف کر دیا جائے تو کچھ نظر نہیں آتا اور اس کا تجربہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ آدمی کسی ایک نقطہ پر نظر کو اس طرح مرکوز کر دے کہ آنکھ کے ڈھیلے کی حرکت اور پلک جھپکنے کا عمل ساکت ہو جائے تو نظر کے سامنے سوائے خلا اور روشنی کے کوئی چیز نہیں آئے گی۔ یہاں سے نظر کا ایک اور قانون سامنے آتا ہے۔ فکشن حواس میں دیکھنے کی طرز یہ ہے کہ ڈھیلا حرکت کرتا رہے اور پلک جھپکتی رہے اگر کسی آدمی کی پلکیں باندھ دی جائیں تو چند سیکنڈ کے بعد اس کی آنکھوں کے سامنے سوائے اندھیرے کے کچھ نہیں رہے گا۔ یعنی ڈھیلے کے اوپر پلک

جھپکنے کے عمل کے ساتھ ساتھ جو ہلکی ضرب پڑتی ہے وہی باہر سے آنے والے عکس کو دماغ پر منتقل کرتی ہے۔اس کی مثال یوں ہے کہ ایک کیمرہ ہے،اس کے اندر فلم ہے۔کیمرہ کے اندر نہایت عمدہ لینز ہے۔فلم کے اوپر عکس منتقل ہونے کے لئے جتنی روشنی کی ضرورت ہے فضا میں وہ روشنیاں بھی موجود ہیں،کیمرہ کے لینز کو ہم تشبیہاً آنکھ قرار دیتے ہیں اور کیمرہ کے اندر فلم کو ہم دماغ یا حافظہ کی وہ سکرین قرار دیتے ہیں جس پر عکس منتقل ہوتا ہے۔لینز کے اوپر جو بٹن لگا ہوا ہے اس کو ہم پلک سے تعبیر کرتے ہیں جب تک کیمرہ کے اندر لگا ہوا بٹن یعنی کیمرہ کی آنکھ کی پلک نہیں جھپکے گی یا حرکت میں نہیں آئے گی فلم پر کسی قسم کا نقش نہیں ہوگا۔اسی طرح جب تک آنکھ کے ڈھیلے کے اوپر پلک جھپکنے کا عمل صادر نہیں ہوگا دماغ کی سکرین پر کوئی نقش و نگار منتقل نہیں ہوگا۔روحانی نقطہ نظر سے اور موجودہ سائنس کی روشنی میں ایک منظر کا عکس دماغ کی سکرین پر 15 سیکنڈ تک قائم رہتا ہے۔15 سیکنڈ تک قائم رہنے کا مطلب یہ ہے کہ عکس پہلے ہلکا ہوتا ہے،پھر کچھ واضح ہوتا ہے پھر اور زیادہ روشن ہوتا ہے اور پھر دھندلا ہو کر ریکارڈ ہو جاتا ہے۔15 سیکنڈ گزرنے سے پہلے دوسرا عکس منتقل ہو جاتا ہے۔جب یہ بات سامنے آئی کہ اگر ہم پلک جھپکنے کے عمل کو مسلسل 15 سیکنڈ تک بار بار ساکت کر دیں تو ایک ہی نقش دماغ کی سکرین پر منتقل ہوتا رہے گا۔جب کوئی بندہ آنکھیں بند کر کے مراقبہ میں بیٹھتا ہے تو اس صورت میں پلک جھپکنے اور پتلی کی حرکت کا عمل جاری رہتا ہے۔آنکھیں اگر بند ہوں تو عارضی طور پر پلک جھپکنے کا عمل تو ساکت ہو جاتا ہے لیکن پتلی کی حرکت اپنی جگہ موجود رہتی ہے اور پتلی کی حرکت کے ساتھ ساتھ پپوٹے بھی متحرک رہتے ہیں۔پپوٹوں کے متحرک رہنے سے مراد یہ ہے کہ پلک کی حرکت ابھی جاری ہے یعنی دیکھنا اور دماغ کے اوپر عکس بندی کا عمل جاری و ساری ہے۔مراقبہ کرنے والا بندہ ایک نقطہ پر اپنے ذہن کو مرکوز کرتا ہے اور وہ نقطہ یا مرکزیت یا میڈیم تصور شیخ ہے۔یعنی وہ دیکھنے کی پوری صلاحیتوں کو شیخ کے تصور میں مجتمع کر دیتا ہے مطلب یہ ہوا کہ ایک ہی عکس پانچ منٹ،10 منٹ،15 منٹ تسلسل کے ساتھ دماغ کے اوپر منتقل ہوتا رہتا ہے۔قانون یہ بھی ہے کہ جو عکس دماغ کی سکرین پر منتقل ہوتا ہے اس عکس کے اندر موجود صلاحیتیں،صفات اور خاصیتیں بھی دماغ کے اوپر منتقل ہوتی ہیں اور دماغ انہیں محسوس کرتا ہے مثلاً ایک آدمی آگ دیکھتا ہے۔آگ کا عکس جیسے ہی دماغ کی سکرین پر منتقل ہوتا ہے آدمی کے اندر حرارت،حدت اور گرمی کی خاصیت پیدا ہو جاتی ہے۔ایک آدمی سر سبز و شاداب درخت دیکھتا ہے،باغ کے اندر خود کو دیکھتا ہے،جو سبز ہے،ہرا ہے اس کے اندر جو پر سکون خاصیت ہے۔درخت پھل اور پھول کے ساتھ ساتھ اس رنگ کی ٹھنڈک بھی دماغ کو محسوس ہوتی ہے اسی طرح جب شیخ کی شبیہہ دماغ کی سکرین پر منتقل ہوتی ہے تو شیخ کے اندر جو علم حضوری کی نظر کام کر رہی ہے وہ دماغ کے اوپر منتقل ہو جاتی ہے۔

اعراف کیا ہے؟

سوال: قرآن پاک نے ہمیں بہت سے عالموں سے متعارف کرایا ہے مثلاً حشر و نشر، جنت و دوزخ، عرش و کرسی وغیرہ۔ ان میں سے ایک نام اعراف بھی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اعراف کی روحانی حیثیت کیا ہے اور اہل سلوک اعراف کو کیا سمجھتے ہیں؟ اس کی وضاحت فرمادیں۔

جواب: عام طور سے مرنے کا مفہوم ختم ہو جانا لیا جاتا ہے۔ مرنے کا مفہوم ختم ہونا ہر گز نہیں ہے۔ عربی لغت کے اعتبار سے اگر اس لفظ کے معنی پر غور کیا جائے تو اس کا مفہوم اور ترجمہ منتقل ہونا ہے۔ یعنی ایک آدمی اس گوشت پوست کے جسم کو چھوڑ کر دوسرے عالم میں منتقل ہو گیا۔ ہماری مادری زبان میں انتقال کا لفظ مرنے کے لفظ کے مترادف ہے یعنی آدمی مر گیا۔ مرنے کے لفظ کا ترجمہ بھی امر ہوتا ہے۔ اب ہم یوں کہیں گے کہ آدمی اس عارضی زندگی کو چھوڑ کر ایسے عالم میں چلا گیا جہاں موت نہیں ہے یعنی اس نے دائمی زندگی اختیار کر لی۔ روحانی طور پر مرنا اور جسمانی طور پر مرنا بظاہر الگ الگ دو حالتیں نظر آتی ہیں لیکن ان دو حالتوں میں فرق اگر ہے تو صرف یہ ہے کہ ایک آدمی اس جسم کی موجودگی میں اپنے ارادے اور اختیار کے ساتھ جسم کو چھوڑ کر مر جاتا ہے اور دوسری حالت یہ ہے کہ اس جسم کو اس طرح چھوڑ دیتا ہے کہ پھر اس جسم کی اپنی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ اس کی مثال ہماری زندگی میں بھی ملتی ہے ہم جب سو جاتے ہیں تو خواب دیکھتے ہیں۔

خواب کی حالت میں ہزاروں میل کے فاصلے پر خود کو دیکھتے ہیں، وہاں جو چیزیں کھاتے ہیں، اس کا مزا بھی محسوس کرتے ہیں۔ اس ملک کا جو موسم ہے اس کے اثرات کو بھی قبول کرتے ہیں۔ ایک آدمی کسی گرم ملک میں رہتے ہوئے یہ خواب دیکھتا ہے کہ وہ کسی پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہوا ہے، ایسا پہاڑ جو برف پوش ہے، خواب میں اسے اتنی زیادہ سردی محسوس ہوتی ہے کہ جب اس کی آنکھ کھلتی ہے تو اس کے اوپر سردی کے تمام اثرات غالب ہوتے ہیں۔ یہی صورت خواب میں عالم اعراف میں منتقل ہونے کے بعد بھی ہوتی ہے۔ آدمی ایک دو یا زیادہ ایسے خواب ضرور دیکھتا ہے جس میں اس کی ملاقات اس کے عزیزوں، رشتہ داروں اور پیاروں کی ارواح سے ہوتی ہے۔ مرے ہوئے لوگوں کی روحوں سے ملاقات اس بات کی نشاندہی ہے کہ آدمی خواب میں عالم اعراف میں منتقل ہو گیا۔

تصوف اور روحانیت کا منشاء یہی ہے کہ انسان کے اندر وہ صلاحیت جو خواب میں کام کرتی ہے بیداری میں اپنے اوپر طاری کر لی جائے۔ آدمی کے اندر وہ صلاحیت جو اس کو Time and Space سے آزاد کر دیتی ہے، موت ہے۔ ''موتو قبل ان تموتوا'' (مر جاؤ مرنے سے پہلے) کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اس زندگی میں زمان و مکاں کی گرفت سے آزاد ہو کر اس عالم کا مشاہدہ کر لے جہاں Time and Space سے آزاد ہوئے بغیر کوئی بندہ نہیں پہنچ سکتا۔ اب ہم بیداری میں رہتے ہوئے ایک خواب دیکھتے ہیں یعنی بیداری میں خواب کے حواس اپنے اوپر غالب کر کے عالم اعراف میں منتقل ہوتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے۔ ذہن کو یکسو کر کے ایسے مقام پر لے جانا چاہئے کہ جن ذہنی کیفیات میں آدمی سوتا ہے۔ سونے میں سب سے پہلے جو عمل سرزد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آدمی نہایت آرام و سکون کے ساتھ بستر پر لیٹ جاتا ہے۔ دوسرا کام یہ ہے کہ ذہن اور دماغ کو بیداری کے حواس سے ہٹا کر ان حواس میں منتقل کر دیتا ہے جن حواس کا نام نیند ہے۔ تیسرے یہ کہ آنکھیں بند کر لیتا ہے اور بالآخر وہ سو جاتا ہے۔ آیئے بیداری میں سوتے ہیں نہایت سکون اور آرام سے بیٹھ جائیں۔ ذہن کو تمام دنیوی خیالات سے آزاد کر لیں، آنکھیں بند کر لیں اور شعور سے لاشعور میں داخل ہو جائیں۔ جیسے ہی شعور کی گرفت کمزور پڑے گی، بند آنکھوں کے سامنے لاشعور کا دروازہ آئے گا۔ یہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو جایئے۔ اب آپ عالم اعراف میں ہیں۔ جس طرح کوئی مسافر کسی بڑے شہر میں داخل ہوتا ہے اسی طرح آپ بھی عالم اعراف کے ایک بڑے شہر میں ہیں۔ جس طرح آپ اس زمین پر آباد شہر دیکھتے ہیں یہاں بھی آپ کو آبادیاں نظر آ رہی ہیں۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ ہے کہ آدمی کے اوپر لباس کی نوعیت بدلی ہوئی ہے۔ یہاں روح نے گوشت پوست اور پٹھوں کو جمع کر کے اپنے لئے لباس بنایا تھا۔ گوشت پوست، رگ و پے کا تانا بانا مٹی کے ذرات تھے۔ وہاں روح نے گوشت پوست اور پٹھوں کا جو لباس بنایا ہے اس کا تانا بانا روشنیوں سے بنا ہوا ہے۔ چونکہ مٹی میں وزن ہوتا ہے مٹی کشش ثقل کا دوسرا نام ہے اس لئے آدمی اس زمین پر خود کو پابند اور مجبور دیکھتا ہے اس دنیا میں چونکہ تانا بانا روشنیوں کے اوپر بنا ہوا ہے اس لئے وہاں آدمی خود کو پابند اور مجبور نہیں دیکھتا۔ پابند دنیا میں سفر کرنے کے لئے پابند وسائل کی ضرورت پیش آتی ہے۔ رفتار تیز اور کم ہو سکتی ہے لیکن وسائل سے چھٹکارا نہیں مل سکتا۔ ایک آدمی ایک گھنٹے میں پیدل چل کر تین میل کا سفر طے کرتا ہے اس وقفہ میں دوسرا آدمی سائیکل پر آٹھ میل کا سفر طے کر لیتا ہے۔ گاڑی میں بیٹھ کر ساٹھ، ستر، اسی میل کا سفر طے کر لیتا ہے۔ ہوائی جہاز میں ہزاروں میل کا سفر طے ہو جاتا ہے۔ رفتار کی تیزی اپنی جگہ ہے لیکن وسائل کی محتاج ہے اس لئے محتاج ہے کہ اس کا جسم یا روح کا لباس بھی مٹی کا بنا ہوا ہے اور جتنے اس کے ساتھ کام کرنے والے وسائل ہیں وہ بھی مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ ایک سائیکل مٹی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اس لئے کہ سائیکل کے اندر جتنے کل پرزے ہیں وہ سب لوہے سے مرکب ہیں اور لوہا مٹی ہے۔ مٹی کو بہت سے مراحل سے گزارا جاتا ہے تو مٹی کے مخصوص ذرات لوہا بن جاتے ہیں۔ ہوائی جہاز میں جتنے کل پرزے ہیں وہ بھی مٹی ہیں۔ سطح زمین پر کوئی بھی دھات اس کا بنیادی مصالحہ مٹی ہے اور مٹی اپنی شکلیں بدل رہی ہے۔ یہی مٹی کے ذرات کہیں آدمی بن جاتے ہیں، کہیں سائیکل بن جاتے ہیں، کہیں موٹر سائیکل بن جاتے ہیں اور کہیں ہوائی جہاز کا روپ دھار لیتے ہیں۔ یہی مٹی کے ذرات خوبصورت درخت بن جاتے ہیں،

پرندے بن جاتے ہیں، ایک چھوٹے سے چھوٹا ذرہ کبھی وائرس بن جاتا ہے، کبھی چیونٹی بن جاتا ہے اور کبھی ہاتھی بن جاتا ہے۔ یہ ذرات اللہ تعالیٰ کی صناعی اور قدرت کی واضح نشانیاں ہیں۔ اس صناعی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ہماری نشانیوں میں غور کرو اور وہ لوگ قابل ستائش ہیں، منزل رسیدہ ہیں، پسندیدہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں غور کرتے ہیں۔

مٹی کو گوندھ کر اس سے ہر شکل بنتی ہے۔ مٹی کے گارے سے آپ چڑیا بھی بنا سکتے ہیں مٹی کے گارے سے آپ عمارت بھی کھڑی کر سکتے ہیں، مٹی کے گارے سے آپ انسانی پتلا بھی بنا سکتے ہیں اور مٹی سے آپ بڑی سے بڑی تخلیق بھی عمل میں لا سکتے ہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ مٹی کے اندر اللہ تعالیٰ کی جاری و ساری صفات کا علم حاصل ہو جائے۔

علم کی طرزیں

سوال: علم کی کتنی طرزیں ہیں اور وہ کون کون سی ہیں؟ مہربانی فرما کر بتائیں۔

جواب: علم حاصل کرنے کی دو طرزیں ہیں۔ایک طرز یہ ہے کہ آپ زمان و مکاں میں بند ہو کر وسائل کا کھوج لگائیں، وسائل میں تفکر کریں۔ جتنا گہرا تفکر ہوتا ہے اسی مناسبت سے وسائل کی صلاحیتیں آدمی کے اوپر آشکار ہو جاتی ہیں۔ آپ یہ نہ سمجھئے کہ ایٹم مٹی کا ذرہ نہیں ہے۔ایٹم بھی مٹی کا ذرہ ہے، جب سائنس دانوں نے تفکر کے ساتھ جدوجہد کی تو مٹی کا وہ ذرہ جس کا نام ایٹم ہے، بول اٹھا کہ میرے اندر عظیم طاقت چھپی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے۔ ''اور ہم نے لوہا تخلیق کیا اور اس میں لوگوں کے لئے بے شمار فائدے رکھ دیئے۔'' آپ ذرا غور کریں آج کی سائنس میں وہ کون سی ایجاد ہے جس کے اندر کسی نہ کسی طبقہ سے لوہے کا عمل دخل نہیں ہے۔ المیہ یہ ہے کہ قرآن ہمارا ہے، حضور ہمارے ہیں، حضور کے بتائے ہوئے قرآنی ارشادات ہمارا ورثہ ہیں، ہم ہاتھوں پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور دوسری قومیں تفکر کے اسرار سے آگاہ ہو کر فائدے اٹھا رہی ہیں۔ قرآن نے جب یہ ارشاد فرمایا کہ ہم نے لوہا تخلیق کیا اور اس میں لوگوں کے لئے بے شمار فائدے رکھ دیئے تو وہاں اللہ تعالیٰ کا اشارہ پوری نوع انسانی سے ہے اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ ہم نے لوہا تخلیق کیا مسلمانوں کے لئے۔۔۔۔۔ قانون اپنی جگہ اٹل ہے جو بھی اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق اللہ کی نشانیوں میں تفکر کرتا ہے، غور کرتا ہے گہرائی میں ڈوب کر وسائل کے اندر صلاحیتوں کا کھوج لگاتا ہے اس کے اوپر وسائل کی صلاحیتیں کھل جاتی ہیں۔ روحانی نقطہ نظر سے صلاحیتوں کا کھوج، لگاتا ہے اس کے اوپر وسائل کی صلاحیتیں کھل جاتی ہیں۔ روحانی نقطہ نظر سے صلاحیتوں کا کھوج لگانے کے لئے پہلا سبق مراقبہ ہے۔ مراقبہ انسان کو لاشعور سے قریب کر دیتا ہے اور لاشعوری صلاحیتوں سے آگاہی کا نام ہی دراصل تفکر ہے۔ ظاہر آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے بالآخر اس کا تانا بانا اور اس کا مصالحہ وہ اجزاء ہیں جن اجزاء سے آنکھ بنی ہوئی ہے۔ آنکھ کا دیکھنا بھی ایک ایسی صفت ہے کہ جس صفت کو جتنا زیادہ اجاگر، صاف اور شفاف کر لیا جائے اسی مناسبت سے آنکھ کسی چیز کو زیادہ واضح، زیادہ روشن اور زیادہ وسعت میں دیکھتی ہے۔ صحت مند آنکھ جتنے عکس قبول کرتی ہے وہ زیادہ واضح اور ان کے خدوخال زیادہ روشن ہوتے ہیں۔ بیمار آنکھ جتنے عکس قبول کرکے دماغ کی سکرین پر پھینکتی ہے، آنکھ کی بیماری اور کمزوری کے مطابق یہ عکس اسی قدر دھندلا اور غیر واضح ہوتا ہے۔ آنکھ کی بیماری کا ایک درجہ

یہ ہے کہ آنکھ کے اندر لگا ہوا لینز جس لینز کے اوپر عکس کو قبول کرنے کا دارومدار ہے اگر ناکارہ ہو جائے تو آنکھ عکس قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ کیمرہ کتنا ہی اچھا اور قیمتی کیوں نہ ہو اگر اس کے اندر لگا ہوا لینز خراب ہے تو تصویر کبھی اچھی نہیں آئے گی۔

جسمِ مثالی

سوال: یہ اور Aura سے کیا مراد ہے اور کیا کیا کام کرتا ہے؟ اس کی وضاحت فرمادیں۔

جواب: انسانی جسم دو ہیں یہ بات کئی مثالیں دے کر بیان کی جاچکی ہے۔ انسان کا ایک جسم ایسا ہے جس میں جگہ جگہ خراشیں پڑی ہوئی ہیں، جس کا ہر ہر عضو ٹوٹا ہوا ہے، جس کے ہر جوڑ پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ ایسا جسم ناکارہ بد صورت اور بد ہیت کہلاتا ہے۔

اس جسم کی طرح انسان کے اوپر ایک اور جسم ہے جو گوشت پوست کے جسم سے تقریباً 9 انچ اوپر ہمہ وقت موجود رہتا ہے۔ موجودہ سائنس نے اس جسم کی تلاش میں کافی جدوجہد کی ہے۔ اس جسم کے مختلف نام پڑھے لکھے لوگوں کے سامنے آچکے ہیں، بے شمار ناموں میں دو نام بہت زیادہ معروف ہیں۔ ایک جسم مثالی اور دوسرا نام Aura۔ انسانی گوشت پوست کے جسم کا دار و مدار اس Aura کے اوپر ہے۔ Aura کے اندر صحت مندی موجود ہے تو گوشت پوست کا جسم بھی صحت مند ہے۔ یوں کہیئے کہ جس طرح گوشت پوست کے جسم کے اوپر اللہ تعالیٰ نے دو لینز فٹ کر دیئے ہیں جن کے ذریعے مادی دنیا میں موجود تمام چیزوں کا عکس دماغ کی سکرین پر منتقل ہو کر ڈسپلے ہوتا ہے اسی طرح جسم مثالی کے اندر جو کچھ موجود ہے اس کا پورا پورا اثر گوشت پوست کے جسم پر مرتب ہوتا ہے۔ روشنیوں کا بنا ہوا یہ جسم صرف انسان کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ زمین کے اوپر جتنی مخلوق موجود ہے، روشنیوں کے جسم سے Feed ہوتی ہے۔ اس بات کو ذرا تفصیل سے اگر بیان کیا جائے تو یوں کہا جائے گا کہ انسانی زندگی کے اندر جتنے تقاضے موجود ہیں وہ تقاضے گوشت پوست کے جسم میں پیدا نہیں ہوتے۔ جسم مثالی میں پیدا ہوتے ہیں اور وہاں سے منتقل ہو کر گوشت پوست کے جسم کے اوپر ظاہر ہوتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی اس بات کی خواہش کرتا ہے کہ اس کو روٹی کھانی ہے تو بظاہر ہمیں یہ بات نظر آتی ہے کہ گوشت پوست کا بنا ہوا جسم روٹی کھا رہا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے جبکہ جسم مثالی کے اندر بھوک کا تقاضا پیدا نہیں ہو گا اور جسم مثالی یا Aura گوشت پوست کے جسم کو بھوک یا پیاس کا عکس منتقل نہیں کرے گا آدمی کھانا نہیں کھا سکتا۔ یہ کوئی کہانی نہیں ہے اور کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے جو اچنبھے کی ہو یہ کوئی ایسا دقیق مسئلہ بھی نہیں ہے جو سمجھ میں نہ آسکے۔ جسم مثالی کے بہت سے پرت ہوت ہیں ہم جو خواب کی حالت میں دنیا بھر کی سیر کرتے ہیں اور تمام وہی اعمال و حرکات ہم سے سرزد ہوتی ہیں جو ہم گوشت پوست کے جسم کے ساتھ کرتے ہیں وہ دراصل جسم مثالی کی ایک ایسی حرکت ہے جو وہ گوشت پوست کے جسم کو میڈیم

بنائے بغیر کرتا ہے۔ ہم یہ بات بتا چکے ہیں کہ خواب کوئی خیالی بات نہیں ہے۔ اسی طرح حقیقت ہے جس طرح ہم مفروضہ حواس میں رہتے۔ سوائے بے دلی کی زندگی کو حقیقی قرار دیتے۔ بیان کی ہوئی مثال کو دوبارہ دھرانا ضروری ہے ہم نے کسی سبق میں وضاحت کے ساتھ اس بات کو بیان کیا ہے کہ آدمی کے اوپر ایک ایسی کیفیت یا حالت طاری ہوتی ہے کہ اسے صبح بیدار ہونے کے بعد غسل کرنے کی حاجت ہوتی ہے۔ جس طرح بیداری میں اس عمل کے تاثرات قائم ہوتے ہیں اور وہ نہانے دھونے اور کپڑوں کی پاکی اور صفائی کی طرف متوجہ ہوتا ہے اسی طرح خواب میں کئے ہوئے اس عمل کے بعد بھی وہ پاکی، صفائی اور نہانے دھونے پر مجبور ہے جس طرح وہ بیداری میں اس عمل کو کرنے کے بعد بھی نہانے دھونے اور پاک صاف ہوئے بغیر نماز قائم نہیں کر سکتا۔

یہ ایک ایسی بنیادی مثال ہے جس سے دنیا کا ایک فرد بھی منکر نہیں ہو سکتا۔ ہر وہ شخص جو صحت مند ہے اور جوانی کو پہنچا ہے وہ ایک دو چار دس بیس مرتبہ اس عمل سے ضرور گزرتا ہے یہ کہنا کہ Aura یا جسم مثالی کی حرکات و سکنات محض واہمہ ہیں، اس لئے صحیح نہیں ہے کہ عمل کے بعد تاثرات ایک جیسے قائم ہوتے ہیں۔ یہ ہماری روزمرہ زندگی میں پیش آنے والی ایک مثال ہے، اس کے علاوہ تمام آسمانی صحائف میں خوابوں کا ایک مسئلہ موجود ہے اور تمام آسمانی صحائف نے خوابوں کو مستقبل بینی کا ایک روشن ذریعہ قرار دیا ہے۔ مستقبل سے مراد زمان و مکاں سے ماوراء اس عالم میں دیکھ لینا ہے جو عالم ظاہری آنکھ نہیں دیکھتی۔ اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہوا کہ انسان دراصل گوشت پوست کا بنا ہوا نہیں ہے، اس کے اجزائے ترکیبی میں جہاں مٹی کے ذرات کام کر رہے ہیں وہاں مٹی کے ذرات کے اوپر روشنی کا ایک ہالہ مستقل اور مسلسل اس کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ روشنی کا ہالہ جسم مثالی Aura اگر مٹی کے ذرات سے اپنا رشتہ منقطع کر لے تو یہ ذرات فنا ہو جاتے ہیں۔ اس بات کو ہم اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ آدمی جب مرتا ہے تو جسم مثالی یا Aura اس سے اپنا رشتہ منقطع کر لیتا ہے، یہ مرنا یا فنا ہونے کا طریقہ انسان کے لئے ہی مخصوص نہیں ہے، جو چیز ایک وقت معین پر مر جاتی ہے۔ ایک وقت آئے گا، اس زمین کے اوپر محیط روشنیوں کا ہالہ بھی زمین کے گلوب سے اپنا رشتہ منقطع کر لے گا۔

روشنیوں کا ہالہ

سوال: آپ نے فرمایا ہے کہ اجسام روشنیوں کے ایک ہالے میں مقید ہوتے ہیں جبکہ اجسام کا تعلق تو روح سے ہے۔اس کی وضاحت فرمادیں؟

جواب: روح کیا ہے؟ قرآن پاک کے ارشاد کے مطابق اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا۔ ''یہ لوگ آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں آپ کہہ دیجئے روح میرے رب کے امر سے ہے اور جو کچھ تمہیں علم دیا گیا ہے وہ قلیل ہے۔'' بات بالکل واضح ہے علم تو دیا گیا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلہ میں اس کی حیثیت قلیل سی ہے یہاں ایک نکتہ زیر بحث ہے۔اللہ تعالیٰ خود ماوراء ہیں،اللہ تعالیٰ کا علم لا محدود، لا متناہی اور ماوراء ہے۔لا متناہی علم کا قلیل سے قلیل جزو لا متناہیت کے دائرے میں آتا ہے۔ قلیل کو بھی لا متناہی علم کہا جائے گا اس آیت مبارکہ کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ روح کا علم نہیں دیا گیا۔جیسا کہ مذہبی دانشور کہتے ہیں حضور ﷺ سے حضور ﷺ کے نائب اولیاء اللہ کو بھی یہ علم منتقل ہوا ہے۔یہ علم کتنا، کیسے اور کس قدر منتقل ہوا ہے اس کے بارے میں اس لئے کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ یہ علم بہر حال لا متناہی ہے اور علم کا ایک حصہ ہے۔اس بات کو ایک بار پھر سمجھ لیجئے کہ لا متناہیت کا چھوٹے سے چھوٹا جزو بھی لا متناہی ہے۔ ہم نے اس بات کی نفی کی ہے کہ مرنے کے بعد یہ بات کہہ دینا کہ آدمی کے اندر سے روح نکل گئی، صحیح نہیں ہے۔یہ کہنا کہ مرا ہوا آدمی اپنے عزا اور اقربا کی ارواح سے جاملا، یہ بھی صحیح نہیں ہے۔روحانی نقطہ نظر سے اس بات کی تشریح کی جائے تو یہ کہا جائے گا کہ جسم مثالی نے مٹی کے ذرات سے بنائے ہوئے جسم کو نظر انداز کر کے اور قطع تعلق کر کے اپنا رشتہ اس سے منقطع کر لیا اور دوسرے عالم میں وہاں کی فضا کے مطابق ذرات یکجا کر کے اپنا نیا جسم اپنے لئے تخلیق کر لیا۔یہ جو عالم اعراف میں ایک وسیع دنیا آباد ہے آدم سے لے کر اب تک اور قیامت تک اس دنیا کی آبادی میں برابر لوگ منتقل ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے دراصل یہ اس عالم سے اس عالم میں آدمی منتقل ہو گیا۔یعنی جسم مثالی کی منتقلی ہے۔عربی زبان میں اسی لئے اس عالم میں جانے کا نام انتقال کرنا ہے یعنی اس عالم سے اس عالم میں آدمی منتقل ہو گیا۔

جسم مثالی زندگی میں ہمہ وقت متحرک اور سرگرم رہتا ہے۔اس کی اپنی صفات میں سے ایک مخصوص صفت یہ ہے کہ جب تک یہ اپنے لباس سے کلی طور پر قطع تعلق نہیں کر لیتا اس کی بھرپور حفاظت کرتا ہے۔اس کی مثال ہمیں خواب میں ملتی رہتی ہے ایک

آدمی سویا ہوا ہے نیند بہت گہری ہے۔ کراچی میں سویا ہوا آدمی امریکہ کے بازاروں میں گشت کر رہا ہے۔ اس کے سوئی چبھو دی جاتی ہے جسم مثالی امریکہ سے چل کر فوراً اپنے لباس کی پاسبانی کے لئے آموجود ہوتا ہے سوئی چبھونا، امریکہ سے جسم مثالی کا کراچی میں آ جانا اتنا قلیل وقفہ ہے کہ جس کی پیمائش کسی بھی طرح ممکن نہیں ہے اس پیمائش کو آپ لمحے کا کھربواں حصہ کہہ سکتے ہیں اور لمحے کا کھربواں حصہ کہنا پیمائش کے دائرے میں نہیں آتا۔ مقصد یہ ہے کہ جسم مثالی کے لئے Time and Space کوئی چیز نہیں ہے لیکن Time and Space میں بند ذرات سے جب یہ اپنے لئے ایک جسم اختراع کرتا ہے تو اس کو Time and Space کی حد بندیوں میں بند رکھنے کے لئے پوری پوری حفاظت کرتا ہے۔ اس عالم سے اس عالم میں منتقل ہونے کے بعد اس عالم کے اندر ہوا اور مٹی کے جن ذرات سے لباس بنتا ہے ان ذرات میں مٹی کے ذرات پر روشنیوں کا جو ہالہ موجود ہے وہ اس عالم میں ذرات پر موجود روشنیوں کے ہالے سے کم طاقتور ہے۔ یہ کم طاقت ہونا ہی دراصل کشش ثقل ہے۔ مرنے کے بعد جو عالم ہے اس کو عالم اعراف کہتے ہیں۔ عالم اعراف کے بعد ایک اور عالم ہے۔ اس عالم کا قانون بھی یہی ہے کہ جس طرح جسم مثالی عالم ناسوت سے اپنا رشتہ منقطع کر کے اور یہاں کا بنایا ہوا لباس چھوڑ کر عالم اعراف میں ایک نیا لباس بناتا ہے اسی طرح عالم اعراف سے نکل کر عالم حشر و نشر میں ایک نیا لباس بناتا ہے۔ عالم حشر و نشر کی جو فضا ہے وہ عالم ناسوت اور عالم اعراف سے یکسر مختلف ہے وہاں روشنیوں کا ہالہ اور زیادہ طاقتور ہے۔ عالم حشر و نشر میں ذہنی رفتار اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ جسم مثالی کی ریکارڈ کی ہوئی زندگی سامنے آ جاتی ہے یہ جو فرمایا گیا ہے کہ ہر آدمی کے ہاتھ میں اس کا نامہ اعمال ہو گا اسی بات کی طرف اشارہ ہے عالم حشر و نشر کے بعد یوم المیران ہے۔ یوم المیران میں اس روشنیوں کے بنے ہوئے جسم کے اوپر نور کا ایک ہالہ آ جاتا ہے، یہی وہ نور ہے جس نور سے کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کا دیدار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے ''کوئی آنکھ اللہ کا ادراک نہیں کر سکتی اللہ ادراک بن جاتا ہے۔'' اس آیت مقدسہ کی تفسیر یہ ہے کہ جب کوئی بندہ اللہ کے ادراک سے دیکھتا ہے تو اس کی پہلی نظر یوم المیران پر پڑتی ہے۔ یوم المیران کے بعد جنت یا دوزخ کے عالم ہیں۔ جنت کے بھی بہت سارے طبقات ہیں اور دوزخ کے بھی بہت سارے طبقات ہیں۔ ایک باریک نکتہ ہے جس پر بہت زیادہ فکر کی ضرورت ہے، جنت اور دوزخ کا تذکرہ اس بات کی علامت ہے کہ آدمی دوزخ میں عذاب محسوس کرے اور جنت میں آرام و آسائش سے لطف اندوز ہو۔ اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ لطف و آسائش اور آرام روح کو حاصل ہوتا ہے اور اس آرام سے روح فائدہ اٹھاتی ہے تو پھر یہ بھی کہنا پڑے گا کہ دوزخ کا عذاب بھی روح کے بعد ہوتا ہے۔ نعوذ باللہ یہ بات اس لئے نہیں کہی جا سکتی کہ روح فی الواقع اللہ تعالیٰ کا ایک حصہ ہے جزو ہے ایسا جزو جو لا متناہی ہے ایسا جزو جو ماورا الماورا ہے ایسا جزو جس کو اللہ تعالیٰ سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ کے جزو کو تکلیف سے کیا سروکار؟ دیکھئے بات وہی ہے کہ جس طرح اس عالم ناسوت میں جسم تکلیف محسوس کرتا ہے، راحت محسوس کرتا ہے، اسی طرح بندہ دوزخ میں تکلیف محسوس کرتا ہے اور جنت میں راحت محسوس کرتا ہے۔

باب پنجم

Time and Space

سوال: روحانی علوم کے ضمن میں آپ اگر Time and Space کی نفی ہونے کا تذکرہ فرماتے ہیں۔ اگر زمان و مکاں ہی نہ رہے تو کسی چیز کا وجود بھی زیر بحث نہیں آ سکتا۔ اس کی وضاحت فرمادیں کہ زمان و مکاں کی نفی ہونے سے کیا مراد لی جاتی ہے؟

جواب: زندگی عالم ناسوت کی ہو، عالم اعراف کی ہو، عالم حشر و نشر کی ہو یا جنت اور دوزخ کی ہو۔ اس زندگی کا دار و مدار تقاضوں کے اوپر ہے۔ یہ بات قانون ہے کہ تقاضوں کا مسالا یعنی تقاضوں کے اجزائے ترکیبی یا عناصر علم ہیں۔ جب تک کسی تقاضا کی تکمیل کے لئے علم موجود نہیں ہو گا۔ تقاضہ زیر بحث نہیں آئے گا۔ زندگی کا ایک بنیادی تقاضا بھوک اور پیاس ہے اگر بھوک کے بارے میں ہمیں یہ علم حاصل نہ ہو کہ بھوک زندگی گزارنے اور زندگی کو قائم رکھنے اور زندگی متحرک رکھنے کے لئے ایک عمل ہے تو ہم بھوک سے ناآشنا ہوں گے۔ ہمیں یہ بات معلوم ہے کہ زندگی کو آگے بڑھانے کے لئے اور جسمانی نشو و نما کے لئے کچھ کھانا ضروری ہے۔ کچھ کھانا دراصل ایک علم ہے اور اس علم کے اندر یہ بات موجود ہے کہ کن چیزوں کے کھانے سے جسمانی صحت بحال رہتی ہے اور کن چیزوں کے استعمال سے صحت کو نقصان پہنچتا ہے اس علم کا مجموعی نام تقاضا ہے۔ یہی صورت حال پیاس کی ہے، غیض و غضب کی ہے، رحمت و محبت کی ہے، نیند اور خواب کی ہے وغیرہ وغیرہ۔ کہنا یہ ہے کہ جب تک کسی چیز کا علم ہمیں حاصل نہیں ہوتا ہم اس چیز سے واقف نہیں ہوتے۔ علم کے لئے ضروری ہے کہ اس کا کوئی سورس ہو اور یہ بھی ضروری ہے کہ اس سورس سے حاصل شدہ علوم کے لئے کوئی ایسی ایجنسی موجود ہو جہاں علم آ کر ذخیرہ ہو۔ اس کے بعد یہ ضروری ہے کہ کوئی ایسی ایجنسی موجود ہو جو اس علم کے اندر معانی پہنا سکے اور آخری حد میں ایسی ایجنسی کا موجود ہونا لازم ہے جس پر علم کا مظاہرہ ہو سکے۔ آدمی کو بھوک لگی یعنی اس کو یہ اطلاع ملی ہے کہ اب جسم کو کچھ کھانے کی ضرورت ہے۔ جس ایجنسی نے یہ اطلاع قبول کی اس نے اس علم کے اندر معانی پہنائے۔ وہ یہ ہے کہ روٹی کھانی چاہئے، پھل کھانے چاہئیں اور اس اطلاع کو جسم مثالی نے قبول کر کے مظاہرہ کیا اور آدمی نے یہ محسوس کیا کہ اس نے روٹی کھالی ہے جہاں تک جسمانی تقاضے پورا کرنے کا تعلق ہے وہ عالم ناسوت ہو یا عالم اعراف ہو یا عالم دوزخ یا عالم جنت ہو ایک ہی صورت واقع ہو رہی ہے۔ جنت اس لئے جنت ہے کہ وہاں دودھ اور شہد کی نہریں ہیں۔ جنت میں پھل ہیں اور آدمی کی آسائش اور آرام کے لئے بے شمار وسائل ہیں۔ دوزخ اس لئے دوزخ ہے کہ وہاں ایسے وسائل میں آدمی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ بات وہی علم کی ہے کہ علم ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اگر کوئی بندہ چاہے تو وہ اتنا پابند اور مجبور ہے کہ وہ ایک گھنٹہ میں تین میل

کا سفر طے کرتا ہے اور اگر کوئی آدمی چاہے تو وہ اتنا آزاد اور خود مختار ہے کہ وہ ایک قدم اٹھا کر جب دوسرا قدم رکھتا ہے تو یہ سفر ساتویں آسمانوں پر محیط ہوتا ہے یعنی آدمی نے بیٹھے ہوئے یہ ارادہ کیا کہ عرش معلیٰ پر اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہوں اور ارادہ ساتھ ہی اس کے سامنے یہ بات مشاہدہ بن جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات حمیدہ کے ساتھ عرش پر موجود ہیں اور بندہ ان کے سامنے سر بسجود ہے یہ کہنا کہ انسان روحانی طور پر آسمانوں کی سیر نہیں کر سکتا یا اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز نہیں ہو سکتا یا یہ کہنا کہ کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتا اتنی بڑی جہالت اور اتنا بڑا ظلم ہے کہ جس کے سامنے کوئی بڑی جہالت اور کوئی بڑا ظلم نہیں آسکتا۔ کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ ایک انسان روشنیوں کے دوش پر امریکہ سے کراچی منتقل ہو جاتا ہے۔ بلا کسی فاصلہ کے بلا کسی وقفہ کے وہ بات امریکہ میں کرتا ہے ہم ٹی وی پر اسے دیکھتے ہیں، سنتے ہیں۔ یہ تذکرہ ہے وسائل محدود رہتے ہوئے ترقی کا۔ کوئی بندہ اگر اپنے اندر اس صلاحیت سے واقف ہو جائے جس صلاحیت نے ٹی وی ایجاد کر دیا تو اس کے لئے یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ وہ دنیا کے اس کونے سے اس کونے میں یا اس عالم سے اس عالم میں اپنے ارادہ اور اختیار سے منتقل ہو جائے پہلے جو باتیں جادو اور طلسمات کے نام سے مشہور تھیں اور جن کو ہم مضحکہ خیز کہانی قرار دیتے تھے آج وہی سب چیزیں ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں آدمی کس قدر عجیب ہے۔ ایک طرف اتنا بے بس اور مجبور ہے کہ سو قدم کی آواز نہیں سن سکتا اور دوسری طرف اتنا آزاد ہے کہ اپنی ہی ایجادات کے ذریعے ہزاروں میل کی آواز سن لیتا ہے۔

جن وسائل کی علمی حیثیت تکلیف ہے۔ قرآن پاک میں تفکر کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ کھانا جنت میں بھی میسر ہے اور کھانا دوزخ میں بھی میسر ہے۔ جنت کا کھانا دودھ، شہد، پھل فروٹ ہے اور دوزخ کا کھانا زقوم، تھور اور ایسی غذائیں ہیں جن سے آدمی کے اندر کراہت پیدا ہوتی ہے۔ بتانا یہ ہے کہ کھانے کا علم دونوں جگہ موجود ہے کھانے کے اسباب اور سامان بھی دونوں جگہ موجود ہیں۔ لیکن دونوں کی معنویت الگ الگ ہے۔ جنت کا کھانا اس لئے اچھا ہے کہ اس میں معنویت اچھی ہے بھوک کا جو علم ہے اس علم کے اندر جو مفہوم ہے وہ آرام و آسائش کا ہے۔ علیٰ ہذاالقیاس دوزخ کے اندر بھوک کا جو علم ہے اس کے اندر کراہت پشیمانی، تکلیف اور آہ وبکا ہے۔ مختصر طور پر اس بات کو اس طرح کہا جائے گا کہ یہ ساری کائنات دراصل ایک علم ہے۔ علم کی طرزیں یہ ہیں کہ اس میں معانی پہنائے جاتے ہیں۔ جسم مثالی ایک ایسی ایجنسی ہے جو علم میں معانی پہناتی ہے۔ جب آدمی عالم ارواح سے نزول کر کے اس دنیا میں وارد ہوتا ہے تو جسم مثالی اس عالم کے اندر ایسے معانی اور مفہوم اخذ کرتا ہے جس میں آدمی قید ہے بند ہے گرفتار ہے ہر ہر قدم قید و بند میں بندھا ہوا ہے جسم مثالی جب عالم ناسوت سے باالفاظ دیگر اس گوشت پوست کے جسم سے اپنا رشتہ منقطع کر کے دوسرے عالم میں جاتا ہے اور وہاں کی فضا اور ماحول سے اپنے لئے ایک نیا لباس بناتا ہے تو اس کے معانی اور مفہوم بدل جاتے ہیں۔ اس علم کے معانی اور مفہوم Time and Space اتنا مختصر ہو جاتا ہے کہ تقریباً اس کی نفی ہو جاتی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے Time and Space کلیتاً ختم ہو جاتا ہے، ایسا نہیں ہے۔ ایسا اس لئے نہیں ہے کہ عالم ناسوت کی طرح عالم اعراف میں

بھی زمین ہے اور عالم ناسوت کی طرح عالم اعراف میں بھی گھر ہیں وہاں آدمی کھاتا بھی ہے پیتا بھی ہے چلتا پھرتا بھی ہے اپنے عزیز اور اقربا سے ملاقات بھی کرتا ہے خوش بھی ہوتا ہے اور روتا بھی ہے یہ خوش ہونا یا غمگیں ہونا یا گھروں میں رہنا زمین کے اوپر چلنا پھرنا دھوپ کی تپش محسوس کرنا اور موسم کے ردوبدل میں زندگی گزارنا Time and Space کی حدود کی نفی نہیں کرتے البتہ انسانی زندگی کے اختیار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ آدمی جب پیدل چلتا ہے تو اس کے اوپر گرم و سرد کا اثر ہوتا ہے۔ بھوک پیاس کا تقاضا اس کے اندر موجود رہتا ہے تکلیف اور راحت کے احساسات بھی اس کے اندر موجود رہتے ہیں اب یہی آدمی جو زمین پر تین میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرتا ہے جب ہوائی جہاز میں بیٹھ جاتا ہے تو ایک گھنٹہ میں ہزاروں میل کی مسافت طے کر لیتا ہے۔ ان ہزاروں میل کی مسافت طے کرنے میں بھی اسے سرد و گرم کا احساس رہتا ہے اسے بھوک بھی لگتی ہے اور دوسری ضروریات بھی اس کے ساتھ وابستہ رہتی ہیں حالانکہ Time and Space کا یہ قانون جو آدمی کو ایک گھنٹہ میں تین میل چلاتا ہے، ٹوٹ گیا ہے۔ اب ایک ایسا ذریعہ اختیار کر لیا گیا ہے جس سے کہ ہزاروں میل کا سفر ایک گھنٹہ میں طے کر لیتا ہے مثال ناقص ہے لیکن تقریباً یہی صورت حال عالم اعراف میں ہے ایک آدمی کراچی میں مر گیا۔ اس کے عزیز و اقرباء دہلی میں ہیں عالم اعراف میں رہنے والا کوئی بندہ اپنے عزیز سے ملنے کے لئے دہلی جائے گا تو Time and Space مختصر ہو کر دو قدم کا راستہ بن جائے گا مگر قدم موجود ہے، زمین موجود ہے، لہٰذا زمان و مکاں Time and Space بھی موجود ہے۔ جیسے جیسے آدمی اس عالم میں اور اس عالم سے اس عالم میں منتقل ہوتا رہتا ہے اس کی رفتار بڑھتی رہتی ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اس کا ایک قدم عالم ناسوت میں ہوتا ہے اور دوسرا قدم عرش پر۔

حقیقت پسندانہ طرز فکر

سوال: روحانی علوم کے حصول میں طرز فکر کو کیا اہمیت حاصل ہے؟

جواب: کائنات کی تخلیق اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر جب ہم غور کرتے ہیں جس ارشاد کی بنا پر کائنات اپنے تمام تخلیقی اجزاء اور عناصر کے ساتھ موجود ہوگئی تو ہم اس کے علاوہ دوسری کوئی بات نہیں کہہ سکتے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم کائنات کی صورت میں وجود پذیر ہوگیا۔ جس حکم کی بنا پر وسیع و عریض اور لامتناہی کائنات، کھربوں کہکشانی نظام، سنکھوں کی تعداد میں سیارگان اور کروڑوں کی تعداد میں ستارے یا (Stars) وجود میں آنے کا سبب صرف اللہ تعالیٰ کا ایک حکم ہے اور وہ حکم کیا ہے، ''کن'' کن کا مطلب ہے ''ہو جا'' جب ہم اس ''ہو جا'' کے اوپر غور کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہو جا کہنے والی ہستی کے ذہن میں کوئی ایسا پروگرام ہے جس پروگرام کے تحت وہ کسی چیز کو نہ صرف یہ کہ وجود میں لانا چاہتا ہے بلکہ اسے قائم رکھنے کے لئے وسائل بھی فراہم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ کیا ہو جا، صرف یہ فرمایا ''کن'' یعنی ہو جا۔ کیا ہو جا؟ یہ اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ذہن اللہ تعالیٰ کا علم ہے اور اللہ تعالیٰ کا تمام کا تمام علم اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب کن فرمایا تو کائنات موجود ہونے کے ساتھ ساتھ کائنات کے اندر وہ تمام صفات بھی موجود ہوگئیں۔ جن صفات کے اوپر اللہ تعالیٰ نے کائنات کو تخلیق کیا ہے۔ پھر اس تخلیق میں ایک نئی بات پیدا ہوئی۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بنائی ہوئی تخلیق کو نظر عطا کی اور نظر فعال اور متحرک بنانے کے لئے ارشاد فرمایا۔ الست بربکم میں ہوں، میں تمہارا رب۔ بہت زیادہ تفکر طلب ہے۔ اس کی تشریح کو آئندہ کے لئے محفوظ کر کے ہم اصل معاملے کی طرف آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب یہ فرمایا کہ میں تمہارا رب ہوں تو کائنات میں موجود تمام تخلیقات، بشمول فرشتے، انسان اور جنات، سب نے برملا یہ کہا۔ ''جی ہاں! ہم یہ بات جانتے ہیں کہ آپ ہمارے رب ہیں۔'' اللہ تعالیٰ کے یہ فرمانے سے پہلے کہ میں تمہارا رب ہوں کائنات کی حیثیت ایک گونگی، بہری شے کی تھی۔ اس کو اپنا ادراک تو تھا لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ میں کیا ہوں، کیوں ہوں، کون ہوں اور میرا بنانے والا کون ہے۔ یہ نہ جانا کہ میں کون ہوں، کیوں ہوں اور میرا بنانے والا کون ہے۔ اس بات کی علامت ہے کہ کائنات کو ابھی نظر نہیں ملی تھی اس کائنات میں چونکہ بنیادی حیثیت انسان کی ہے اس لئے ہم کائنات کی بجائے انسان کا تذکرہ کرینگے۔ کسی جگہ بے شمار انسان موجود ہیں لیکن وہ یہ جانتے کہ ہم کون ہیں؟ کیا ہیں، کیوں ہیں اور ہمارا بنانے والا کون ہے؟ اس لاعلمی کو علم سے بدلنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات اقدس کو کائنات کے سامنے پیش

کیااور باآواز بلند فرمایا۔ ’’میں تمہارا رب ہوں۔‘‘ کائنات یاانسان اس آواز کی طرف متوجہ ہوااور اس نے اللہ تعالیٰ کو دیکھااور اللہ تعالیٰ کی خالقیت کااعتراف کیا۔اب اس بات کواس طرح کہا جائے گا کہ نظر کا پہلا ٹارگٹ یا مرکزیت اللہ ہوا۔اللہ کو دیکھنے کے بعد اللہ کا عکس دماغ کے اوپر منتقل ہوا۔یہی نظر کا قانون ہے یعنی آنکھ کسی عکس کو قبول کر کے دماغ کی سکرین پر منتقل کرتی ہے۔یہ منتقلی 15 سیکنڈ ہلکی گہری قائم رہ کر تبدیل ہو جاتی ہے۔اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے پیش نظر ہم یہ جانتے ہیں کہ نظر اس وقت کام کرتی ہے۔جب نظر کے لئے کوئی مرکزیت ہو،انسان کے نظر کی پہلی مرکزیت اللہ ہے۔اس دنیا میں آنے کے بعد مرکزیت میں تبدیلی واقع ہوئی۔ہم علم حضوری سے ہٹ کر ہم علم حصولی کے جال میں بند ہو گئے۔نتیجے میں ہماری نگاہ کی مرکزیت مفروضہ اور فکشن حواس بن گئے۔لیکن قانون اپنی جگہ بحال رہا جس طرح حقیقت دماغ کی سکرین پر منتقل ہوتی ہے اسی طرح فکشن حواس بھی دماغ کی سکرین پر منتقل ہوتے ہیں۔بات صرف اتنی سی ہے وہ فکشن حواس کی منتقلی ہمیں پابند حواس میں قید رکھتی ہے اور غیر فکشن حواس کی منتقلی ہمیں آزاد شنیا سے روشناس کراتی ہے۔روحانی سلسلوں،اسباق، قواعد وضوابط،اعمال واشغال، تفکر، مراقبہ، تصور شیخ ان تمام باتوں کو بہ نظر غائر دیکھا جائے تو ایک ہی بات سامنے آتی ہے کہ کسی ہستی کو مرکزیت بنا کر بار بار دماغ کی سکرین پر منتقل کیا جائے۔ جتنا زیادہ ایک خیال یا ایک مرکزیت دماغ کی سکرین پر منعکس ہوتی ہے اسی مناسبت سے دماغ ایک پیٹرن (Pattern) بن جاتا ہے اور یہی پیٹرن تصوف کی اصطلاح میں طرز فکر ہے۔ہم جب استاد، پیرو مرشد یا شیخ کا تصور کرتے ہیں تو ازلی قانون کے مطابق شیخ کے اندر کام کرنے والی اللہ تعالیٰ کی صفات کا علم بار بار ہمارے دماغ کے اوپر وارد ہوتا ہے اور جیسے جیسے شیخ کے اندر کام کرنے والی روشنیاں سالک کے اندر منتقل ہوتی ہیں۔اسی مناسبت سے سالک کا ذہن شیخ کی روشنیوں کو قبول کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ شیخ اور مرید کا ذہن ایک نقطہ پر قائم ہو جاتا ہے۔

اسی کو تصوف کی اصطلاح میں نسبت قرار دیا گیا ہے۔روحانیت میں نسبت حاصل کرنے کا اہم ذریعہ اپنے مرشد سے قربت کا حاصل ہونا ہے۔جوں جوں اس قربت میں اضافہ ہوتا ہے مرید میں محبت و عشق کی لہریں موجزن ہوتی ہیں اسی مناسبت سے شیخ کا ذہن منتقل ہوتا رہتا ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ شیخ کے اندر کام کرنے والی روشنیاں اور انوار بلکہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات بھی سالک کو حاصل ہو جاتی ہیں یا سالک ان انوار اور تجلیات سے متعارف ہو جاتا ہے۔

اس صورت کا نام تصوف میں ’’فنافی الشیخ‘‘ ہے۔شیخ کی روشنیاں اور شیخ کے اندر کام کرنے والے انوار اور تجلیات بھی شیخ کا اپنا ذاتی وصف نہیں ہیں۔جس طرح ایک سالک نے اپنی تمام تر توجہ اور ذہنی ارتکاز کے ساتھ شیخ کے علم اور شیخ کی صفات کو اپنے اندر منتقل کیا ہے اسی طرح شیخ نے اپنی تمام تر توجہ کے ساتھ سیدنا حضورﷺ کے علم اور صفات کو اپنے اندر منتقل کیا ہے۔فنافی الشیخ کے بعد شیخ کے اندر کام کرنے والی وہ صلاحیتیں سالک کے اندر بیدار اور متحرک ہو جاتی ہیں جن صلاحیتوں کی بنیاد پر شیخ نے سیدنا حضورﷺ کی نسبت حاصل کی ہے۔اس مقام کو تصوف میں۔۔۔۔۔فنافی الرسول کہا جاتا ہے۔حضورﷺ کا ارشاد ہے کہ

میں تمہاری طرح بشر ہوں۔ اتنی بات ضرور ہے کہ میرے اوپر وحی آتی ہے۔ بشیرت کے دائرے سے باہر ہو کر دیکھا جائے تو حضور ختم المرسلین ﷺ کی فضیلت یہ ہے کہ ان کے اوپر وحی نازل ہوتی ہے اور وحی خدا کی طرف سے نازل ہوتی ہے یعنی سیدنا حضور ﷺ کے ذہن مبارک پر اللہ تعالیٰ کے علوم، اللہ تعالیٰ کے انوار اور اللہ تعالیٰ کی تجلیات منعکس ہوتی ہیں۔ فنافی الرسول کے بعد کوئی سالک قدم بقدم محبت و عشق اور گداز کے ساتھ حضور ﷺ کے علوم کا عارف ہوتا رہتا ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ حضور ﷺ کے علوم سالک کو اس کی استطاعت کے مطابق حاصل ہو جاتے ہیں۔ جتنی استطاعت کسی سالک کے اندر موجود ہے اور جس مناسبت سے حضور ﷺ کے علوم اسے منتقل ہوئے اسی مناسبت سے وہ حضور ﷺ کی نسبت سے فائز ہوا۔ تصوف میں اس نسبت کو نسبت محمدی ﷺ کہا جاتا ہے۔ نسبت محمدی ﷺ حاصل ہونے کے بعد سالک کا ذہن اللہ تعالیٰ کی صفات کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور بالآخر وہ حضور ﷺ کی نسبت اور ہمت کے وسیلے سے اس مقام پہ جا ٹھہرتا ہے جس مقام پہ رہتے ہوئے اس نے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ جی ہاں! آپ ہمارے رب ہیں۔ اس نسبت کو تصوف میں نسبت وحدت کہا جاتا ہے اس کے بعد اگر اللہ تعالیٰ فضل فرمائیں تو وہ مقامات کھلتے ہیں جن کے بارے میں لکھنا یا بتانا، شعوری سکت سے باہر ہے۔ مقصد اس تمام گفتگو کا یہ ہے کہ انسان کے اندر دماغ ایک ایسی سکرین ہے جس پہ عکس مسلسل اور متواتر بغیر وقفہ کے منتقل ہوتا رہتا ہے یہ الگ بات ہے کہ عکس کی معنویت جدا جدا ہے اگر عکس کی یہ منتقلی علم حصولی کے دائرہ کار میں ہے تو اس علم کی تمام معنویت مفروضہ اور فکشن ہے اور اگر اس عکس کی منتقلی علم حضوری کے دائرہ کار میں ہے تو عکس کے اندر موجود تمام علوم حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں لیکن قانون تو اپنی جگہ قانون ہے۔ جب تک ذہن انسانی پر کوئی عکس منتقل نہیں ہوتا۔ انسان کی نظر کام نہیں کرتی۔ یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ آدمی اندھا ہے، اس کی آنکھیں نہیں ہیں۔ وہ بھی دوسری چیزوں کو محسوس کرتا ہے سمجھتا ہے، ان کی علمی حیثیت کو جانتا ہے۔ ہم یہ بتا چکے ہیں کہ دیکھنے کا عمل ڈیلوں کی حرکت اور پلک جھپکنے پر قائم ہے۔

اس ساری گفتگو کا لب لباب یہ ہوا کہ روحانی علوم حاصل کرنے کے لئے نسبت حاصل ہونا ضروری ہے۔ نسبت سے مراد دراصل اس استاد یا پیر و مرشد کی طرز فکر ہے جس سے روحانی علوم منتقل ہوتے ہیں۔ روحانی علوم منتقل ہونے سے مراد ہے کہ یہ ایک قسم کا ایسا ورثہ ہے جو شیخ کی روحانی اولاد کو منتقل ہوتا ہے۔ جس طرح ایک باپ کی دنیاوی دولت اولاد میں تقسیم ہوتی ہے۔ نسبت یا طرز فکر کے دو رخ ہیں ایک رخ یہ کہ ایسے بندے کی طرز فکر منتقل ہو جس کے ذہن میں دنیاوی جاہ و جال، عزت و شہرت کی اہمیت ہو۔

دوسری نسبت یہ ہے کہ استاد کی طرز فکر منتقل ہو جس کی طرز فکر میں اور جس کے ذہن میں دنیاوی جاہ و جلال کی کوئی خاص وقعت نہ ہو۔ اس حد تک وہ دنیا سے متعلق ہو کہ اس کی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ ضروریات کے سلسلے میں بھی اس کی طرز فکر میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بنیادی طور پر دنیاوی ضروریات کم سے کم ہونی چاہئیں وہ طرز فکر جس میں دنیا کی محبت ہے اور دنیاوی آرام و آسائش کی اس کے نزدیک بہت زیادہ اہمیت ہے، میں بھی روحانی قدریں موجود ہیں۔ اس طرز فکر سے بندے کے اندر بھی روحانی

استعداد موجود ہوتی ہے اور ایسے استاد یا گرو سے جو علم منتقل ہوتا ہے اس کو بھی روحانی علوم سے باہر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ایسے علوم جو روحانیت کے دائرہ کار میں آتے ہیں اور طرز فکر بنیادی طور پر دنیاوی ہو تصوف کی اصطلاح میں استدراج کہلاتے ہیں۔ استدراج سے مراد یہ ہے کہ ایسے علوم جن کے ڈانڈے شیطان سے ملتے ہوں یعنی بنیادی طور پر شیطنت اس کے اندر موجود ہو۔ ہم اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ ابلیس جن علوم سے فیض یاب ہے اور جو علوم اسے حاصل ہیں یا اس کی ذریات کو حاصل ہیں وہ بھی ایک درجہ میں روحانی علوم ہیں۔ اس کے برعکس وہ روحانی علوم جو ایسے استاد سے منتقل ہوتے ہیں جن کی طرز فکر میں دنیا محض ایک فریب ہے اور فکشن ہے ان کو علم حضوری کہا جاتا ہے۔ روحانی علوم کی دو طرزیں ہیں ایک استدراج اور ایک علم حضوری۔ استدراج سے مراد وہ تمام شیطانی علوم ہیں جو آدمی اپنی روحانی صلاحیتوں کو بیدار کر کے حاصل کر لیتا ہے۔ یہ بات بہت زیادہ غور طلب ہے کہ استدراجی علوم بھی بطور ورثہ کے منتقل ہوتے ہیں اس بات کو اس طرح کہا جائے گا کہ استاد کی شیطانی طرز فکر مرید کے اندر منتقل ہو گئی۔ استدراج کو حاصل کرنے کے لئے بھی ذکر و اشغال موجود ہیں۔ اس علم کو حاصل کرنے کے لئے بھی محنت و مشقت اٹھانی پڑتی ہے اور بڑی بڑی ریاضتیں کرنی پڑتی ہیں۔ اسی طرح علم حضوری حاصل کرنے کے لئے بھی بڑی بڑے مجاہدے اور ریاضتیں کرنی پڑتی ہیں۔ جس طرح ایک روحانی آدمی سے کوئی کرامت صادر ہوتی ہے اسی طرح ایک ایسے آدمی سے بھی خرق عادت صادر ہوتی ہے جو استدراج کا یا شیطانی علوم کا وارث ہے۔ یہ بات کہ استدراج اور شیطانی علوم سے خرق عادت کا صادر ہونا یا علم حضوری یا انبیاء کے علوم کے تحت کسی کرامت یا خرق عادت کا صادر ہونا قرآن پاک سے ثابت ہے۔ حضرت موسیٰ کے واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کو بالوضاحت بیان فرمایا ہے۔ فرعون نے اپنے ملک کے تمام ماہر جادو گروں کو طلب کیا اور ایک مقررہ دن جو حضرت موسیٰ سے مقابلے کے لئے مقرر ہوا۔ ایک بڑے میدان میں وہ تمام ماہرین علم استدراج اور جادو گر جمع ہو گئے۔ اس میدان میں حضرت موسیٰ بھی موجود ہیں سوال کیا گیا کہ اے موسیٰ! پہل آپ کی طرف سے ہو گی یا ہماری طرف سے؟ جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰ نے ارشاد فرمایا۔ اے جادو گر! پہل تم کرو۔ جادو گروں نے رسیاں پھینکیں جو سانپ بن گئیں اور بانس پھینکے جو اژدھے بن گئے۔ حضرت موسیٰ اس ہیبت کو دیکھ کر گھبرا گئے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ ''اے موسیٰ ڈرو مت اپنے عصا کو پھینک دو۔'' حضرت موسیٰ کا عصاء یا لاٹھی ایک بڑا اژدھا بن گیا اور اس نے میدان میں موجود تمام سانپوں اور اژدھوں کو نگل لیا اور اس طرح علم استدراج یا جادو کے علوم پر علم حضوری کو فتح حاصل ہوئی لیکن یہ بات محل نظر رہے کہ جادو گروں نے رسی پھینکی تو سانپ بن گئی اور بانس پھینکے تو اژدھے بنے اور موسیٰ نے لاٹھی پھینکی تو وہ بھی ایک اژدھا بن گئی۔ فرق اگر کچھ ہے تو یہ کہ موسیٰ کی ایک لاٹھی اتنا بڑا اژدھا بن گئی کہ اس نے میدان میں موجود بے شمار سانپوں اور اژدھوں کو نگل لیا لیکن جہاں تک جادو گروں کی خرق عادت یا جادو کا تعلق ہے ان کی رسیاں بھی سانپ بنتی ہیں اور جہاں تک موسیٰ کے معجزہ کا تعلق ہے ان کی لاٹھی بھی اژدھے کی صورت اختیار کرتی ہے البتہ ایک بات ہمیں نمایاں نظر آتی ہے وہ

یہ ہے کہ موسیٰ کا بنایا ہوا اژدھا بہت زیادہ طاقتور تھا۔ یعنی جادو اور علم حق دونوں علوم کا وجود تو ہے مگر علم حق ہمیشہ شیطانی علوم یا استدراج پر غالب آتا ہے اس بات کو ذرا آسان الفاظ میں بیان کیا جائے تو اس طرح کہا جائے گا کہ علم کا تعین دو درجوں میں ہوتا ہے۔ ایک درجہ یہ ہے کہ اس علم کی بنیاد زر پرستی، جاہ طلبی اور دنیاوی عزت و وقار ہوتا ہے اور علم حق کی تعریف یہ ہے کہ علم حق میں ماسوا اللہ کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ علم حق والا بندہ جو کچھ کرتا ہے، جو کچھ دیکھتا ہے، جو کچھ سنتا ہے وہ حق کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس کے پیش نظر کوئی ناموری نہیں ہوتی۔ اس کے پیش نظر زر پرستی نہیں ہوتی۔ اس کے پیش نظر کوئی دنیاوی لالچ نہیں ہوتا۔ اس کے ذہن میں کبھی یہ بات نہیں آتی کہ مجھ سے کوئی ایسی خرق عادت صادر ہو جس کی وجہ سے لوگ مرعوب ہوں اور میری عزت کریں۔ اس کے برخلاف علم استدراج والوں کا ذہن ہوتا ہے کہ وہ اپنے کارنامے دکھا کر دنیا حاصل کریں اور دنیا کی نظر میں سرخرو ہوں اس کی سند بھی قرآن پاک سے ملتی ہے۔ فرعون مصر نے جادوگروں کو طلب کر کے کہا کہ اگر تم نے موسیٰ کو زیر کر دیا تو میں تم کو مالا مال کر دوں گا اور تمہیں اپنا مصاحب بنالوں گا۔۔۔۔۔۔ اس بات سے واضح ہوتا ہے کہ جادوگروں نے اپنے جادو کے زور پر جو کارنامے انجام دیئے اس کے پیچھے ان کے خیالات اغراض و مقاصد اور دنیا پرستی تھی۔ جب کہ موسیٰ نے میدان میں آنے سے پہلے اس قسم کی کسی بات کا خیال تک نہیں کیا۔ محض حق کے غلبہ کے لئے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت و جبروت کو ظاہر کرنے کے لئے اور یہ بتانے کے لئے کہ شیطانی علوم علم حق کے سامنے باطل ہیں، کمزور ہیں، جھوٹے ہیں، میدان میں تشریف لے آئے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ ''ڈر مت اپنی لاٹھی پھینک دے'' یہ ثابت کرتا ہے کہ موسیٰ کے ساتھ میدان میں جو کچھ پیش آیا وہ اس کے لئے تیار نہیں تھے۔ محض اللہ کے بھروسہ پر ان بڑے بڑے طاقت ور جادوگروں کے سامنے اللہ کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اس واقعہ میں دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ جادوگروں نے جو رسیاں پھینکی تھیں اور ان کے سانپ بن گئے تھے اور جو بانس پھینکے تھے ان کے اژدھے بن گئے تھے یہ سب فریب دھوکا اور فکشن تھا اس لئے کہ جب موسیٰ کے عصا نے ان کو نگل لیا تو ان کا کوئی وجود قائم نہیں رہا جب کہ موسیٰ نے اپنی لاٹھی پر دوبارہ ہاتھ ڈالا تو ان کی لاٹھی موجود تھی۔ معجزہ اور جادو میں یہ فرق بہت نمایاں ہے جادو کے زور سے کوئی چیز قائم کی جائے یا کسی کے اندر تصرف کیا جائے چونکہ وہ اس ذہن کی پیداوار نہیں ہے جو ذہن حقیقت سے آشنا ہے اس لئے جادو کی تخلیق یا جادو کا یہ مظاہرہ عارضی ہوتا ہے۔ قانون یہ ہے کہ حقیقت اولتی بدلتی نہیں ہے حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے اور حقیقت رہتی ہے جادو کے زور سے بنے ہوئے سانپ اور جادو کے زور سے بنے ہوئے اژدھے سب نیست و نابود ہو گئے اور موسیٰ کی لاٹھی اپنی جگہ موجود رہی۔ اس واقعہ سے روحانیت میں چلنے والے شاگردوں کے لئے یہ راز ظاہر ہوتا ہے کہ طرز فکر اگر غیر حقیقی ہو تو وہ عارضی ہوتی ہے اور اس سے آدمی ذہنی طور پر فرار حاصل کر لیتا ہے طرز فکر اگر حقیقی ہو تو حقیقت آشنا، طرز فکر جہاں بھی منتقل ہو جائے۔ حقیقت آشنا رہتی ہے اور حقیقت میں رد و بدل نہیں ہوتا۔ ایک استاد یا گرو اپنے چیلے کو جب استدراجی علوم سکھاتا ہے اور یہ علوم سکھانے کے لئے چیلے کے اندر اپنی طرز فکر منتقل کرتا ہے تو وہ چیلا گرو تو بن جاتا ہے لیکن یہ گرو کسی بھی وقت اس طرز فکر سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے یا کر سکتا ہے اور ایک ایسا بندہ جو سیدنا حضور ﷺ یا پیغمبران اکرام کی طرز فکر سے آشنا ہے یا اولیاء اللہ کی

طرز فکر اسے فی الواقع منتقل ہو گئی ہے تو یہ بندہ اس طرز فکر سے کبھی آزاد نہیں ہوتا اور اس طرز فکر میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ حقیقت، حقیقت سے گلے مل لیتی ہے۔ تاریخ میں ایسی ایک مثال موجود نہیں ہے کہ کسی ایسے بندے نے جو حقیقی طرز فکر کا حامل تھا۔ علم استدراج کی طرف رجوع کیا ہو اور ایسی ہزارہا مثالیں موجود ہیں کہ علم استدراج کے بڑے بڑے ماہر اور دانش وروں نے اسلام کی حقانیت کو قبول کر کے شیطانی علوم سے اپنا دامن صاف کر لیا۔ پیر و مرشد دراصل ایک استاد یا گرو کی طرح ہے بات صرف اتنی سی ہے کہ استاد کے اندر طرز فکر کون سی کام کر رہی ہے؟ اس طرز فکر کا تعلق شیطنت سے ہے یا اس طرز فکر کی رسائی حق تک ہے۔ جس طرز فکر کی رسائی حق تک ہے۔ وہی طرز فکر بندے کو اللہ سے متعارف کراتی ہے اور ایسا ہی بندہ راہ سلوک میں قدم قدم چل کر اللہ کا عرفان حاصل کرتا ہے۔

طرز فکر کے بارے میں جو کچھ عرض کیا گیا اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ دراصل انسان کا کردار اس کی طرز فکر سے تعمیر ہوتا ہے۔ طرز فکر میں اگر پیچ ہے تو کسی بندے کا کردار بھی پر پیچ بن جاتا ہے۔ طرز فکر سادہ ہے تو بندے کی زندگی میں سادگی کارفرما ہوتی ہے۔ طرز فکر اگر سطحی ہے تو ایسا بندہ ہر چیز کو بالکل سطحی طریقہ پر سوچتا ہے طرز فکر میں اگر گہرائی ہے تو بندہ ہر چیز کے اندر گہرائی تلاش کرنے کے لئے تفکر کرتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے اسی طرز فکر کی نشاندہی کی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے سورج کو دیکھا تو سمجھا کہ یہی خدا ہے لیکن جب اسے زوال پذیر ہوتے دیکھا تو طرز فکر کی گہرائی نے ان کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ گھٹنے والی چیز کبھی خدا نہیں ہو سکتی۔ حضرت ابراہیمؑ کے ماحول میں جتنے اور لوگ تھے ان کی سمجھ میں کبھی یہ بات نہیں آئی کہ بدلنے والی اور گھٹنے والی چیز کبھی خدا نہیں ہو سکتی۔ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کی موجودگی میں فرد واحد کی سوچ الگ ہے اور اس سوچ میں حقیقت پسندی اور گہرائی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ سے اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ بہت بڑے ماحول میں ایک خاص طرز فکر کے لوگوں میں رہتے ہوئے بھی طرز فکر الگ ہو سکتی ہے۔ یہ حقیقت پسندانہ طرز فکر کہاں سے منتقل ہوئی۔ جب کہ پورے ماحول میں یہ کہیں نظر نہیں آتی، اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ حقیقت پسندانہ طرز فکر ہر آدمی کے اندر موجود ہے لیکن ہر آدمی اسے استعمال نہیں کرتا۔ حضرت ابراہیمؑ نے بتوں کو توڑ ڈالا۔ لوگوں کے اندر اشتعال پیدا ہو گیا اور حضرت ابراہیمؑ سے پوچھا کہ ان خداؤں کو کسی نے توڑا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اپنے ان خداؤں سے پوچھ لو۔ باوجود اس کے کہ ان لوگوں کے سامنے یہ بات آ گئی کہ بت اپنی مرضی اور منشاء کو استعمال نہیں کر سکتے اور انہیں توڑا پھوڑا جا سکتا ہے ان کے اندر حقیقت پسندی نے حرکت نہیں کی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آدمی دیکھتے اور سمجھتے ہوئے بھی غیر حقیقی باتوں کو اصل اور حقیقی سمجھتا ہے۔ تصوف میں سالک جب راہ سلوک اختیار کرتا ہے تو سب سے پہلے اس کی طرز فکر میں تبدیلی واقع ہوتی ہے اور اس طرز فکر کی داغ بیل اس طرح پڑتی ہے کہ روحانی استاد یا پیر و مرشد بتدریج اپنے شاگرد سے اس قسم کی باتیں کرتا ہے جو اس کے ماحول میں موجود نہیں ہوتیں یا ماحول میں بسنے والے لوگ ان کی

طرف اپنے اختیار سے توجہ نہیں دیتے۔ مثلاً اگر یہ کہ فی الواقع کوئی روحانی شخصیت ہے اس کی مجلس میں بیٹھ کر ایسی باتیں سننے میں آتی ہیں جو عام طور پر دوسری مجلسوں میں نہیں کہی جاتیں۔ بعض اوقات یہ باتیں اتنی دلچسپ اور عجیب ہوتی ہیں کہ ایسے لوگ بھی جن کی طرز فکر ناقص ہے اور یہ ناقص طرز فکر ان کے اندر مستحکم ہے وہ بھی ان باتوں کو سننے کے لئے اس مجلس میں شریک ہوتے ہیں سب سے پہلے پیر و مرشد جو کام سرانجام دیتا ہے وہ یہ ہے کہ مرید کے اندر اس بات کو راسخ کر دیتا ہے کہ اس دنیا کی زندگی مفروضہ فکشن اور عارضی ہے جو چیز مفروضہ فکشن اور عارضی ہے اس کو حقیقت نہیں کہا جاسکتا۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ باوجود یہ کہ آدمی خود کو بااختیار سمجھتا ہے زندگی کے شب و روز میں کہیں بھی اس کا اختیار زیر بحث نہیں آتا، وہ پیدائش کے بعد بالکل غیر اختیاری طور پر بڑھتا رہتا ہے۔ جوانی کے بعد یہ نہ چاہنے کے باوجود کہ وہ بوڑھا ہو بالآخر وہ بوڑھا ہو جاتا ہے۔ دنیا کا ایک فرد بھی یہ نہیں چاہتا کہ وہ مر جائے لیکن جو آدمی پیدا ہوتا ہے وہ ضرور مرتا ہے۔ آدمی کو اس بات پر تو اختیار حاصل ہے جیسا کہ وہ سمجھتا ہے کہ وہ غذائی ضروریات کو کم یا زیادہ کر لے لیکن اس بات پر اس کو بالکل دسترس حاصل نہیں کہ وہ ساری زندگی کھانا نہ کھائے یا ساری زندگی پانی نہ پیئے یا ہفتوں مہینوں بیدار رہے۔ یہ تمام باتیں ایسی ہیں جو ہر شخص کے ساتھ نہ صرف یہ کہ پیش آتی ہیں بلکہ اس کے ہر لمحہ کے ساتھ چپکی ہوئی ہیں۔ لمحات، وقت، گھنٹے، دن، مہینے اور سالوں کا یہ تغیر ایک ایسا تغیر ہے جس سے کوئی باہوش آدمی انکار نہیں کر سکتا۔ ان تمام تغیرات کی نشاندہی کر کے پیر و مرشد یہ بات بتاتا ہے کہ اس تغیر کے پیچھے یہ حقیقت چھپی ہوئی ہے کہ کوئی ذات ایسی ہے جس کے ہاتھ میں اس تغیر و تبدل کی ڈوریاں ہیں اور وہ ہاتھ سے ان ڈوریوں کو جس طرح حرکت دے رہا ہے زندگی تغیر پذیر ہو رہی ہے۔ جب سالک کے ذہن میں یہ دن رات کا ایسا مشاہدہ جس کے اوپر عوام الناس نے پردہ ڈالا ہوا ہے سامنے آتا ہے تو اس کا ذہن خود بخود اس ہستی مطلق کی طرف رجوع کر جاتا ہے جس ہستی کے ہاتھ میں تغیر و تبدل کی ڈوریاں حرکت کر رہی ہیں یہ طرز فکر کا پہلا بیج ہے جو کسی مرید یا سالک کے دماغ میں بو دیا جاتا ہے پھر اس بیج کو پروان چڑھانے کے لئے پیر و مرشد مزید جدوجہد اور کوشش کرتا ہے اور وہ ایسے برگزیدہ حضرات کو سامنے لاتا ہے جن کی طرز فکر میں حقیقت پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔

مثلاً یہ کہ وہ اپنے روحانی تصرف سے مرید کو خواب کی ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جس دنیا سے اولیاء اللہ اور پیغمبروں کی زیارت اسے نصیب ہوتی ہے۔ مسلسل اور متواتر خواب کا مشاہدہ کے بعد اولیاء اللہ اور پیغمبروں کی طرز فکر پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی طرز فکر پر ایک ایسا رنگ چڑھ جاتا ہے جو رنگ اولیاء اور پیغمبروں کے لئے مخصوص ہے اس کی باطنی آنکھ پر پیر و مرشد ایسی عینک لگا دیتا ہے کہ عینک کے اندر لگے ہوئے شیشے اسے وہی کچھ دکھاتے ہیں جو پیر و مرشد کی طرز فکر ہے۔ عام مثال سے اسے بہت آسانی کے ساتھ اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ عینک کے اندر جس قسم کے شیشے لگے ہوئے ہیں آدمی کو چیزیں اسی رنگ کی نظر آتی ہیں۔ عینک کے شیشے اگر سرخ ہیں تو اسے ہر چیز سرخ نظر آتی ہے۔ عینک کے شیشے اگر پیلے ہیں تو اسے ہر چیز پیلی نظر آتی ہے۔ عینک کے شیشے اگر صاف و شفاف ہو اور مجلے ہیں تو اسے ہر چیز صاف و شفاف اور مجلے نظر آتی ہے۔ عینک کے شیشے اگر دھندلے ہیں تو ہر چیز دھندلی نظر

آتی ہے اور اگر عینک کے شیشے اندھے ہیں تو عینک آنکھ پر لگانے کے باوجود آنکھ اندھی رہتی ہے حالانکہ عینک لگانے کے بعد آنکھ کھلی ہوئی ہے۔ عینک کا شیشہ دراصل طرز فکر ہے۔ عینک کے اندر جس قسم کی طرز فکر کا شیشہ فٹ کر دیا جاتا ہے۔ دنیا اسے اسی طرح نظر آتی ہے عینک کے اندر فٹ ہوا لینز اتنا صاف اور مجلے بھی ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے کہ آدمی میلوں پرے کی چیز دیکھ لیتا ہے اور عینک کے اندر لگا ہوا شیشہ اتنا اندھا بھی ہوتا ہے کہ عینک لگانے کے بعد آدمی کو اتنا بھی نظر نہیں آتا جتنا وہ عینک لگائے بغیر دیکھ لیتا ہے۔ یہ دیکھنا، سمجھنا، چیزوں کی ماہیت کو معلوم کرنا، تفکر کرنا ہر آدمی کے اندر موجود ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ ان صلاحیتوں کا اسے استعمال نہیں آتا۔ پیر و مرشد چونکہ تفکر کی صلاحیتوں کے استعمال کو جانتا ہے اور اس کی تمام زندگی تفکر سے تعبیر ہے اس لئے جب مرید کے اندر پیر و مرشد کی صلاحیت منتقل ہوتی ہے تو تفکر کا بویا ہوا بیج آہستہ آہستہ تناور درخت بن جاتا ہے۔ اس بیج کو تناور درخت بننے میں جو چیز رکاوٹ بنتی ہے وہ آدمی کا اپنا ذاتی ارادہ اور عقل و شعور ہے۔ روحانیت میں کوئی بندہ جب اپنی ذات کو سامنے لے آتا ہے اور عقل و شعور کو سب کچھ سمجھ لیتا ہے تو اسے کبھی کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اس کے اندر جو عقل و شعور کام کر رہا ہے اس کا تعلق اس طرز فکر سے ہے جس طرز فکر میں گہرائی نہیں ہوتی۔ حقیقت پسندی نہیں ہے۔ جس طرز فکر کو ثبات نہیں ہے۔ اب ہم اس بات کو اس طرح کہیں گے کہ ایک پیر و مرشد ہے، روحانی استاد ہے اور ایک شاگرد ہے، پیر و مرشد کو ہم مراد اور روحانی شاگرد کو ہم مرید کا نام دیتے ہیں۔

ہمارا عام مشاہدہ ہے کہ بچہ وہی زبان بولتا ہے جو ماں باپ کی زبان ہے اور اس زبان کو سیکھنے کے لئے بچہ کے لئے کوئی درس و تدریس کا سلسلہ قائم کرنا نہیں پڑتا۔ بچہ جس طرح ماں باپ کو بولتے دیکھتا ہے وہی الفاظ اپنی زبان میں بولنا شروع کر دیتا ہے۔ عمر کی مناسبت سے الفاظ ٹوٹے پھوٹے ہوتے ہیں بالآخر وہ اپنی مادری زبان اس طرح بولتا ہے جیسے یہ ہمیشہ سے سیکھا سکھایا پیدا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ والدین جس طرح خورد و نوش کا انتظام کرتے ہیں بچہ بھی اسی طرح کھانا کھاتا ہے۔ جس طرح ماں باپ کھاتے ہیں اس کو یہ بتانا نہیں پڑتا کہ کھانا اس طرح کھایا جاتا ہے۔ والدین جس قسم کا لباس پہنتے ہیں بچہ بھی اسی قسم کا لباس زیب تن کرتا ہے۔ ماحول اگر پاکیزہ اور صاف ستھرا ہے تو بچے کا ذہن بھی پاکیزہ اور صاف ستھرا رہتا ہے۔ والدین اگر گالیاں بکتے ہیں تو گھر میں بچے کے لئے گالی دینا کوئی خلاف معمول یا بری بات نہیں ہوتی۔ مختصر یہ کہ بچے کے اوپر وہ تمام اثرات مرتب ہوتے ہیں جو اس کے ماحول میں موجود ہیں۔ گھر کی چار دیواری اور والدین کی آغوش سے نکل کر جب بچہ گھر سے باہر کے ماحول میں۔۔۔۔۔ قدم رکھتا ہے تو اس کے اوپر تقریباً وہ تمام اثرات مرتب ہوتے ہیں جو ماحول میں موجود ہیں۔ روحانی نقطہ نظر سے دنیا میں نیا آنے والا کوئی فرد ذہنی طور پر آدھا ماحول کے زیر اثر ہوتا ہے اور آدھا والدین کی ذہنی افتاد سے مطابق ہوتا ہے۔ اس غیر اختیاری تربیت کے بعد ایک دوسرا دور شروع ہوتا ہے وہ یہ کہ والدین اپنے لخت جگر کو کیا بنانا چاہتے ہیں؟ والدین اگر بچہ کے اندر خاندانی روایات اور خود نمائی کی عادات منتقل کر دیتے ہیں تو بچہ کے اندر خود نمائی کے اثرات غالب آجاتے ہیں۔ والدین اگر بچہ کو صحیح تربیت کے ساتھ ایسے علوم

سکھاتے ہیں جن علوم میں اخلاقیات کا زیادہ دخل ہوتا ہے تو بچہ بااخلاق ہوتا ہے اور شعور کی منزل میں داخل ہو کر ایک ایسا پیکر بن جاتا ہے جو معاشرے کے لئے عزت و توقیر کا باعث ہوتا ہے۔ والدین کی طرز فکر اگر دولت پرستی ہے تو اولاد کے اندر بھی دولت پرستی کے رجحانات زیادہ مستحکم ہو جاتے ہیں اس کا مفہوم یہ نکلا کہ تربیت کے دو طریقہ کار ہیں:

ایک غیر اختیاری اور ایک اختیاری۔ غیر اختیاری یہ کہ بچہ جو کچھ گھر کی چار دیواری اور اپنے ماحول میں دیکھتا ہے اسے قبول کر لیتا ہے۔ اختیاری صورت یہ ہے کہ والدین اسے ایک مخصوص تربیت کے ساتھ معاشرہ میں روشناس کراتے ہیں اور جب یہ نابالغ فرد بالغ ہو جاتا ہے اس کی ایک شخصیت بن جاتی ہے اور وہ اپنی شخصیت کو سامنے رکھ کر والدین اور ماحول سے ملے ہوئے اثرات کو سامنے رکھتے ہوئے ایک کردار متعین کرتا ہے اور یہ کردار اس کا اپنا تشخص بن جاتا ہے۔ ان الفاظ کو مختصر الفاظ میں یوں کہا جاتا ہے کہ کسی بندے کے کردار کی تشکیل کے لئے ضروری ہے کہ اسے مخصوص طرز فکر حاصل کرنے کے لئے قربت حاصل ہو۔ جس طرح ایک عام فرد کے لئے ماحول والدین رشتہ دار اور تعلیمی درسگاہیں قربت کا ذریعہ بن کر اس کے کردار کی تشکیل کرتی ہیں اسی طرح روحانی آدمی کے کردار کی بھی تشکیل ہوتی ہے اور وہ اس طرح ہوتی ہے کہ اسے ایسے کسی بندے کی قربت حاصل ہو جائے جس کا کردار روحانی قدروں پر محیط ہے۔ پیر و مرشد یا مراد وہ شخصیت ہے جس کا کردار عوام الناس سے اور ان لوگوں سے جو روحانی حقیقتوں سے بے خبر ہیں ممتاز ہوتا ہے اس ممتاز شخصیت سے جس حد تک قربت ہوتی جاتی ہے اسی مناسبت سے مرید کے اندر روحانی اوصاف منتقل ہوتے رہتے ہیں اور مراد کی طرز فکر کا ایک ایک جزو مرید کے دماغ کی سکرین پر نقش ہو جاتا ہے یہی وہ طرز فکر ہے جس کا نام سلوک ہے یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر کوئی سالک اپنے اندر موجود روحانی قوتوں سے متعارف ہوتا ہے۔ یہی وہ شخص ہے جس کے اوپر اس بات کا دارومدار ہے کہ کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی ذات والا صفات سے کتنا متعارف ہے اور اسے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسبت کس حد تک حاصل ہے۔ قرآن پاک میں بیان کردہ پیغمبروں کے واقعات، پیغمبروں کی زندگی، پیغمبروں کے مشن اور اوصاف پر اگر غور کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ پیغمبروں نے ایک مخصوص طرز فکر کا پرچار کیا ہے اس مخصوص طرز فکر میں بہت گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ نظر آتا ہے کہ پیغمبرانہ وصف میں یہ بات شامل ہے کہ ہر بندہ برائی اور اچھائی میں تمیز کر سکے، یعنی پیغمبروں نے نوع انسانی کو اچھائی اور برائی کے تصور سے آشنا کیا ہے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ جہاں تک زندگی کے تقاضوں کا تعلق ہے تقاضوں کے اعتبار سے اللہ کی سب مخلوق یکساں حیثیت رکھتی ہے۔ دوسری مخلوق کے سامنے اگر انسان کی ممتاز حیثیت ہے تو وہ یہ ہے کہ انسان اچھائی اور برائی کے تصور سے واقف ہے اسے اس بات کا علم دیا گیا ہے کہ زندہ رہنے کے لئے مخصوص طرزیں انسان کو اچھا بناتی ہیں اور زندہ رہنے کے لئے مخصوص طرزیں۔۔۔۔۔ اچھائی سے دور کر دیتی ہیں۔ اچھائی کے تصور کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی انسان کا علم بن جاتی ہے کہ اچھا فرد وہ ہے جو اپنی اصل سے واقف ہو اور باخبر ہو۔ اصل باخبری اسے ایک ایسے علم سے روشناس کراتی ہے کہ جو علم اسے اپنے اندر کام کرنے والی مخفی صلاحیتوں سے واقف کراتا ہے اور یہ مخفی

صلاحیتیں دراصل روحانی قدریں ہیں جو بندہ جس مناسبت سے روحانی قدروں سے واقف ہے اتنا ہی وہ کردار کے اعتبار سے مصفا اور پاکیزہ ہے اور جو آدمی روحانی قدروں سے جس حد تک ناواقف ہے اسی مناسبت سے اس کا کردار غیر مصفا اور دھندلا ہے۔ ایک بکری اور انسان کی زندگی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ایک ہی بات کہنے پر آدمی مجبور ہے کہ بکری اور انسان میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ہے۔ انسان کو بکری سے ممتاز کرنے والی صلاحیت یہ ہے کہ انسان اپنے اندر روحانی قدروں سے واقف ہو جاتا ہے اور اگر کوئی انسان اپنے اندر روحانی قدروں سے ناواقف ہے یا اسے اپنی ذات کا عرفان حاصل نہیں ہے تو وہ ہرگز بکری یا کسی دوسرے جانور سے ممتاز نہیں ہے۔ روحانی اقدار حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسے اپنے ایسے باپ کی آغوش میسر ہو جس کے اندر روحانی قدروں کا دریا موجزن ہو اور اسے ایسا ماحول میسر ہو جس ماحول میں پاکیزگی موجود ہو۔ باپ سے مراد پیر و مرشد ہے اور ماحول سے مراد یہ ہے کہ اس پیر و مرشد کی ایسی اولاد جو اس سے روحانی رشتہ میں وابستہ ہے زمین پر پیدا ہونے والے بچے کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے ہم یہ بات سمجھ چکے ہیں کہ بچے کا شعور والدین کی گود، گھر کی چار دیواری اور ماحول سے بنتا ہے ماحول میں اگر کثافت ہے تعفن ہے، گھٹن ہے، گندگی ہے، بے سکونی ہے، اضطراب ہے تو بچہ بھی ذہنی طور پر ذہنی سکون سے ناآشنا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر گھر میں سکون ہے، آرام ہے، والدین کی آواز میں شیرینی اور مٹھاس ہے، لہجے میں پیار ہے اور دماغی اعتبار سے وہ پرسکون ہیں اس کا ماحول بھی پرسکون ہے بچہ بالکل غیر اختیاری طور پر سکون کردار کا حامل ہوتا ہے۔

یہ بات ہمارے مشاہدے میں ہے کہ چیخ کو بولنے والے ماں باپ کے بچے بھی چیخ کر بولتے ہیں۔ غصے اور نفرت سے بولنے والے والدین کے بچوں کے اندر بھی غصہ اور نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ ندیدے اور لالچی والدین کے بچے بھی ندیدے اور لالچی ہوتے ہیں۔ کبر و نخوت کے دلدادہ والدین کے بچوں کے اندر بھی کبر و نخوت کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ ضدی اور سرکش والدین کے بچے بھی ضدی اور سرکش ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس حلیم الطبع والدین کی اولاد بھی حلیم الطبع ہوتی ہے۔ پیغمبروں کی زندگی کا مشاہدہ کرنے کے بعد یہی نتیجہ سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخصوص کردار کے لوگوں کا ایک سلسلہ قائم کیا ہے اور جو لوگ اس سلسلے سے وابستہ ہو جاتے ہیں اور ان کی وابستگی قربت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے تو ان کے اندر وہی قدریں منتقل ہو جاتی ہیں جو اس مخصوص کردار کے بامقصد لوگوں کا حصہ ہیں۔ راہ سلوک میں چلنے والے سالک کو کسی شخص کا ہاتھ پکڑنا اس لئے ضروری ہے کہ اسے ایک روحانی باپ کی۔۔۔۔۔ شفقت میسر آئے اور اس روحانی باپ کی اولاد کا ایک ماحول میسر آجائے تاکہ اس ماحول میں رہ کر اس کی ذہنی تربیت ہو سکے۔

ذہنی تربیت کا تجزیہ کیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ تربیت کے مختلف پہلوؤں میں، تربیت کا ہر مختلف پہلو انسانی زندگی میں ایک مستقل کردار ادا کرتا ہے جس ماحول میں ہم لوگ رہتے ہیں اس ماحول کے مطابق کم یا زیادہ ذہن کا متاثر ہونا ضروری ہے مثلاً ایک آدمی ایسے ماحول میں رہتا ہے جس ماحول کے رہنے والے لوگ سب کے سب نمازی ہیں اور ان کی زندگی میں دین کا عمل دخل پوری

طرح موجود ہے اس ماحول سے متاثر ہو کر ہم بھی انہی قدروں کو اپنا لیتے ہیں جو قدریں ماحول میں رائج ہیں۔ایک آدمی طبعی طور پر کتنا ہی خشک کیوں نہ ہو جب وہ ایسے ماحول میں چلا جاتا ہے جہاں رنگ و روشنی کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں اور گانوں کے اونچے نیچے سروں سے فضا معمور ہوتی ہے تو بالآخر وہ بندہ گانے بجانے میں دلچسپی لینے لگتا ہے اور گانے بجانے کے قوائد وضوابط سے بھی آگاہی ہو جاتی ہے۔ایک آدمی ایسے ماحول میں رہتا ہے جس ماحول میں جوایااس قسم کے لہو ولعب کی دنیا آباد ہے وہ بندہ کتنا ہی صاف ستھرا ہو بالآخر اس ماحول کا رنگ آجاتا ہے۔بزرگوں کا کہنا ہے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔اگر ایک بچے کی ایسے ماحول میں پرورش کی جائے جس ماحول میں گالی دینا معیوب بات نہ ہو تو بچہ اختیاری اور غیر اختیاری طور پر گالیاں بکتا رہتا ہے۔اگر پرورش ایسے ماحول میں کی جائے جس ماحول میں ظلم سختی اور درندگی ہو تو بچے کا ذہن بھی سختی اور درندگی کی طرف ہو جاتا ہے۔ایسے ماحول میں پرورش کی جائے جس ماحول میں خود غرضی کے علاوہ اور کوئی بات موجود نہ ہو ہر کام اس لئے کیا جاتا ہو کہ اس کے ساتھ کوئی غرض وابستہ ہو۔ذہنی طور پر ماحول میں سارے بندے کاروباری ذہن رکھتے ہوں تو بچہ بھی کاروباری ذہن پر اٹھتا ہے۔ماحول میں سخاوت کی بجائے بخیلی اور کنجوسی ہو تو بچوں کا دل بھی کھلا ہوا نہیں ہوتا۔ان روزمرہ مشاہدات کے پیش نظر یہ بات مسلمہ امر بن گئی کہ دنیا میں جتنے گروہ آباد ہیں ان کا تعلق اپنی اپنی طرز فکر سے ہے اور اس طرز فکر کی بنیاد پر ہی کسی گروہ کا کسی ذات کا کسی برادری کا کسی کردار کا کسی تشخص کا تعین کیا جاتا ہے۔ہمارے سامنے پیغمبروں کا بھی کردار ہے۔

دنیا کی تاریخ میں ان لوگوں کا کردار بھی ثابت ہے جن لوگوں نے پیغمبروں کی مخالفت کی اور پیغمبروں کو قتل کیا۔تاریخ کے صفحات میں ایسے لوگوں کا کردار بھی موجود ہے جس کردار میں سخاوت عام ہے اور ایسے کردار بھی موجود ہیں جن میں کنجوسی اور بخیلی اپنی معراج کو پہنچی ہوئی ہے اس بات کو مزید تشریح کے ساتھ اس طرح کہا جائے گا کہ کنجوسی اور بخیلی کے کردار کا باوا آدم قارون ہے۔ جب تک دنیا قائم رہے گی قارون کی ذریت، قارون کی اولاد اور قارون کے کردار سے متاثر لوگ موجود رہیں گے۔ سخاوت کے بیان میں حاتم طائی کا نام لیا جاتا ہے۔جب تک دنیا موجود ہے حاتم طائی کے کردار کے لوگ یا حاتم طائی کے گروہ کے لوگ بھی موجود رہیں گے۔۔۔۔۔دنیا میں پیغمبروں کا کردار بھی موجود ہے۔پیغمبروں کے کردار کو جب ہم خوردبینی نظر سے دیکھتے ہیں تو ہمیں وہاں اچھائی کے علاوہ کوئی دوسری چیز نظر نہیں آتی۔یعنی وہ ایسے کردار سے متصف ہیں کہ جس کردار میں لطافت حلاوت کے علاوہ کوئی دوسری چیز شامل نہیں ہو سکتی۔کردار کے تعین کو اگر مختصر کر کے بیان کیا جائے تو زندگی کی دو قدریں قائم ہوتی ہیں ایک قدر وہ ہے جس میں آدمی شیطانیت سے قریب ہو کر شیطان بن جاتا ہے اور دوسری انبیاء کی طرز ہے جس کے اندر داخل ہو کر آدمی سراپا رحمت بن جاتا ہے اور اللہ تعالی کی بادشاہی میں شریک ہو جاتا ہے۔وہ تمام طرزیں جو بندے کو اللہ تعالی سے دور کرتی ہیں شیطانی طرزیں ہیں اور وہ تمام طرزیں جو بندے کو اللہ تعالٰی سے قریب کرتی ہیں پیغمبرانہ طرزیں ہیں۔پیغمبرانہ طرزوں اور شیطانی طرزوں کا تجزیہ کرنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ جو بندہ رحمانی طرزوں میں داخل ہو جاتا ہے۔اس کے اندر

پیغمبروں کے اوصاف منتقل ہو جاتے ہیں یہ بات کہنا بے جانہ ہوگا کہ پیغمبروں کے اوصاف اللہ تعالیٰ کے اوصاف ہیں یعنی جب کوئی بندہ پیغمبرانہ زندگی میں سفر کرتا ہے تو دراصل وہ ان صفات میں سفر کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی اپنی ذاتی صفات ہیں اور جب کوئی بندہ ان پیغمبرانہ صفات سے منہ موڑ لیتا ہے تو وہ ان طرزوں میں اور شہوت میں زندگی گزارتا ہے جو دراصل تاریک کثیف جہالت سے معمور شیطانی طرزیں ہیں شیطانی طرز یہ ہے کہ آدمی کے اوپر خوف وہراس مسلط رہتا ہے۔ایساخوف وہراس جو زندگی کے ہر مقام کو ناقابل شکست وریخت زنجیروں سے جکڑے ہوئے ہے اس کا دن ہو یا رات وہ ایک خوف میں بسر ہوتا ہے کبھی اسے زندگی ضائع ہونے کا خوف ہوتا ہے کبھی وہ معاشی ضروریات کے پورا نہ ہونے کے خوف میں مبتلا ہے کبھی اس پر بیماریاں حملہ آور ہوتی ہیں اور کبھی وہ مسائل کے انبار میں اس طرح دب جاتا ہے کہ اسے اس انبار سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔موت جس کو بہر حال آنا ہے اس کے اوپر خوفناک شئے بن کر مسلط ہو جاتی ہے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ موت سے کسی بھی طرح دستگاری حاصل نہیں ہو سکتی اس کے باوجود اس اٹل حقیقت سے گھبراتا رہتا ہے، بھاگتا رہتا ہے۔شیطانی طرزوں میں ایک بڑی قباحت یہ ہے کہ آدمی ذہنی اور نظری طور پر اندھا ہوتا ہے وہ چند سو گز سے زیادہ کی چیز نہیں دیکھ سکتا اور یہی چیزیں اس کو دردناک عذاب میں مبتلا رکھتی ہیں اس کے برعکس پیغمبرانہ طرزوں میں آدمی کے اوپر خوف اور غم مسلط نہیں ہوتا وہ عدم تحفظ کے احساس سے دور رہتا ہے۔موت چونکہ ایک اٹل حقیقت ہے اس لئے وہ مرنے کے لئے تیار رہتا ہے اور جب وہ مرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے تو موت اس کے لئے دنیا کی سب سے زیادہ خوشنما چیز بن جاتی ہے۔اسے اس بات کا سراغ مل جاتا ہے کہ موت کوئی بھیانک شئے نہیں ہے بلکہ موت ایک عالم سے دوسرے عالم میں منتقل ہونے کا نام ہے جس طرح اس رنگ و بو کی دنیا میں وہ زندگی کے تمام تقاضے پورے کرتا ہے اسی طرح مرنے کے بعد دوسرے عالم میں وہ کھاتا پیتا ہے، جاگتا ہے، سوتا ہے، روحانی اور جسمانی تمام ضروریات پوری کرتا ہے اور یہ بات محض اس کے قیاس میں داخل نہیں ہوتی بلکہ وہ اس شگفتہ زندگی کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔بات وہی ہے کہ ایک طرز فکر کے آدمی دوسری طرز فکر کے آدمیوں سے ممتاز رہتے ہیں۔شیطانی طرز فکر میں زندگی گزارنے والا بندہ انبیاء کے گروہ میں داخل نہیں ہو سکتا اور انبیاء کی طرز فکر سے آشنا بندہ شیطانی گروہ میں کبھی داخل نہیں ہوتا۔شیطانی طرز فکر میں ایک بڑی خراب اور لایعنی بات یہ ہے کہ بندہ ہر عمل اس لئے کرتا کہ اس عمل کے پیچھے کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے یعنی وہ عمل کرنے کا صلہ چاہتا ہے اور اس صلے کا نام اس نے ثواب رکھا ہے۔تصوف ایسے عمل کو جس عمل کے پیچھے کاروبار ہو جس عمل کے پیچھے کوئی ذاتی غرض وابستہ ہو ناقص قرار دیتا ہے اور یہی انبیاء کی بھی طرز فکر ہے۔۔۔۔۔جہاں تک قرآن پاک میں اس بات کا تعلق ہے۔اللہ تعالیٰ کا انعام ہے لیکن اس بات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کوئی بندہ نیک عمل اس لئے کرے کہ اسے اس کا اجر ملے گا اور اسے اس اجر میں زر و جواہرات کے محلات ملیں گے۔

انعام یافتہ

سوال: سورہ فاتحہ میں آتا ہے کہ اے اللہ ہمیں ان لوگوں کی راہ پر چلا جو ترے انعام یافتہ ہیں۔ یہ انعام یافتہ لوگ کون ہوتے ہیں جبکہ بظاہر نافرمان اس دنیا میں مزے کی زندگی گزارتے ہیں؟ اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب: اس بات کی پوری طرح کوشش کی جاتی ہے کہ تصوف اور روحانیت کی راہوں میں چلنے والے مبتدی کے ذہن میں یہ بات واضح ہو جائے کہ زندگی کی بنیاد یا بساط ایک طرز فکر کے اوپر قائم ہے اگر وہ طرز فکر ایسی ہے جو بندے کو اللہ تعالیٰ سے دور کرتی ہے تو اس کا نام شیطنت ہے اور وہ طرز فکر جو اللہ تعالیٰ سے بندے کو قریب کرتی ہے اس کا نام رحمت ہے یعنی اس کائنات میں دو گروہ ہیں جن میں ایک گروہ انعام یافتہ ہے اور دوسرا گروہ باغی اور ناشکرا ہے۔ قرآن پاک کی تمام تعلیمات کا اگر خلاصہ بیان کیا جائے تو مختصر الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اس پوری کائنات میں دو طرزیں کام کر رہی ہیں ایک وہ طرز ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے پسندیدہ ہے اور دوسری طرز وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے ناپسندیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ طرزوں میں زندگی گزارنے والے دوست اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے بہرہ ور ہیں اور اس طرز فکر سے جس کو اللہ تعالیٰ نے ناپسند کہا ہے۔ حق آشنا لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے باغی ہیں، سرکش ہیں اور جن کی صفات میں شیطنت بھری ہوئی ہے وہ نعمتوں سے معمور خزانوں کے مالک ہیں۔ اس کے برعکس وہ لوگ جو شیطانی طرزوں سے دور ہیں نعمتوں سے محروم ہیں یہ ان نعمتوں کا تذکرہ ہے جس کو ہم دنیاوی زندگی کی آسائش کہتے ہیں۔ دوسری بات جو بالکل سامنے کی ہے یہ ہے کہ زندگی کی آسائش سے متعلق وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی ناپسندیدہ طرزوں میں زندگی گزارتے ہیں اور وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ طرز فکر سے ہم آہنگ ہیں دونوں شریک ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ذریت شیطان بھی کھانا کھاتی ہے، وہ بھی لباس پہنتی ہے، اس کے لئے اچھے سے اچھا گھر موجود ہے اور جو لوگ ذریت ابلیس سے کوئی تعلق نہیں رکھتے وہ بھی کھانا کھاتے ہیں، گھر میں رہتے ہیں، لباس پہنتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی ضروریات بھی پوری کرتا ہے۔ جواہرات کے انبار سے ضروریات پورے ہونے کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایک آدمی کے پاس اگر ایک کروڑ روپیہ موجود ہے تو وہ وہی روٹی کھائے گا۔ دوسرے آدمی کے پاس اگر محل موجود ہے اور اس محل میں 50 کمرے ہیں تو سونے کے لئے اسے ایک چارپائی کی جگہ کی ضرورت پیش آتی ہے ایسا کبھی نہیں ہوا، نہ ہوگا کہ پچاس کمروں کا مالک کوئی بندہ جب سونے کے لئے لیٹے تو اس کا جسم دراز اور اتنا پھیل جائے کہ وہ دس چارپائیوں کی جگہ گھیر لے۔ سونے کے لئے اسے ایک ہی چارپائی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس یہی حال پوری زندگی کے اعمال و حرکات کا ہے۔ اس مختصر تشریح

سے یہ ثابت ہوا کہ دنیاوی طرز فکر میں ذریت ابلیس اور اس کے خلاف دوسرے لوگ مادی زندگی کے وسائل میں مشترک قدریں رکھتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ انعام کیا ہے کہ جس انعام کے مستحق وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ طرزوں میں زندگی گزارتے ہیں اور جن کو اللہ تعالیٰ نے انعام یافتہ کہا ہے اور جن بندوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ ہمارے دوست ہیں۔ دوستوں کی تعریف یہ بیان فرماتے ہیں کہ جو بندہ ہمارا دوست بن جاتا ہے ہم اس کے اوپر سے خوف اور غم اٹھا لیتے ہیں۔ خوف اور غم جس آدمی کی زندگی سے نکل جاتا ہے تو خوشی اور سرور کے علاوہ کچھ نہیں رہتا۔ یہ وہ انعام ہے جو ہمیں ظاہرہ آنکھ سے نظر نہیں آتا یہ وہی انعام ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو لوگ ہماری ناپسندیدہ طرزوں میں زندگی گزارتے ہیں ہم نے ان کے دلوں پہ مہر لگادی ہے اور ہم نے ان کے کانوں پر مہر لگادی اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے ہیں۔ ایسا بندہ جس کے دل پر کانوں پر مہر لگی ہوئی ہے اور آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے وہ اس دنیا میں سوچتا بھی ہے، سنتا بھی ہے، دیکھتا بھی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ مہر اور آنکھوں پر پردہ ڈالنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دنیاوی طور پر اندھا ہو گیا ہے یا اس کی عقل سلب ہو گئی ہے یا اس کے کانوں میں سیسہ ڈال دیا گیا ہے یا وہ بہرہ ہو گیا ہے۔ عقل پر مہر لگانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اندر سے ان صفات کو نکال لیا گیا ہے جن صفات سے آدمی اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ کرتا ہے اس کی سماعت میں سے وہ صفت نکال لی گئی ہے جس کے ذریعے سے غیب کی آوازیں سنتا ہے۔ فرشتوں سے ہم کلام ہوتا ہے اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا گیا ہے جن آنکھوں سے وہ، اگر ان آنکھوں پر پردہ نہ پڑا ہوا ہو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دربار اقدس میں حاضر ہو کر کھلی آنکھوں سے حضور ﷺ کی ذات اقدس کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔ اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں اگر تفکر کیا جائے تو یہ کہے بغیر چارہ نہیں ہے کہ جن لوگوں کے قلب میں اتنی سکت نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ کر سکیں۔ ان کے اندر اتنی سکت نہیں ہے کہ فرشتوں کی آواز سن سکیں۔ ان کی آنکھوں میں اتنی چمک نہیں ہے کہ وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دیدار کر سکیں۔ وہ سب لوگ ذریت ابلیس میں آتے ہیں۔ بات بہت زیادہ سخت ہے لیکن امر واقعہ یہی ہے کہ ارکان اسلام کی ماہیت اور حقیقت میں اگر فکر کیا جائے تو ہر رکن اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ اس کا تعلق روحانی طرزوں، روحانی صفات اور روحانی صلاحیتوں سے ہے۔ اسلام میں بنیادی رکن حضور ﷺ پر ایمان لانا ہے۔ ایمان لانے کے بعد حضور ﷺ کی رسالت کی شہادت دینا ہے لیکن دنیا کا کوئی قانون اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ بغیر دیکھے شہادت معتبر ہو سکتی ہے۔ کلمہ شہادت ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اگر انسان شیطانیت سے آزاد ہو کر فی الواقع ایمان کے دائرے میں قدم رکھ دیتا ہے تو سیدنا حضور ﷺ اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں اور وہ برملا حضور ﷺ کی رسالت کی شہادت دیتا ہے۔ قانون شہادت یہ ہے کہ شہادت بغیر دیکھے معتبر نہیں ہوتی۔ مسلمان ہونے کے بعد حق باتوں پر یقین ضروری ہے' جو ایمان کی شرائط میں داخل ہیں ان میں پہلی بات غیب پر یقین ہے۔ ہم غیب پر یقین رکھتے ہیں۔ قانون یہ ہے کہ جب تک کوئی بات مشاہدے میں نہیں آتی۔ یقین متزلزل رہتا ہے اس کے بعد ملائکہ کا تذکرہ آتا ہے پھر ان کتابوں کا تذکرہ آتا ہے جو حضور ﷺ سے پہلے انبیاء پر نازل ہوئیں پھر یوم آخرت کا تذکرہ آتا ہے یہ تمام تذکرے اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں کہ انسان کے اندر کوئی ایسی آنکھ موجود ہے جو پردوں کے

پیچھے دیکھتی ہے۔انسان کے اندر ایسے کان موجود ہیں جو ماورائی آوازیں سن کر ان کے معانی اور مفہوم کو سمجھتے ہیں۔ایسی آنکھیں موجود ہیں جو آنکھیں زمان و مکاں کی تمام حد بندیوں کو توڑ کر عرش پر اللہ تعالٰی کا دیدار کرتی ہیں۔ایسا قلب موجود ہے جو محسوس کرتا ہے۔ قلب اللہ کا گھر ہے اور اس گھر میں مکین کو دیکھتا ہے۔ روحانیت اور تصوف سالکان طریقت کو اسی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ آدمی ظاہرہ حواس سے ہٹ کر ان حواس کا کھوج لگائے جن حواس میں لطافت ہے، نرمی ہے، رحمت ہے، محبت ہے، حلاوت ہے، نور ہے، روشنی ہے۔ جن حواس سے بندہ اپنے آقا رسول اللہ ﷺ کے قدموں میں سرنگوں ہوتا ہے جہاں تک دنیا زندگی گزارنے کے لئے مفروضہ حواس کا تعلق ہے ان حواس میں آدم، بکری اور کتا برابر کے شریک ہیں۔کتا بھی عقل رکھتا ہے، آدمی بھی عقل رکھتا ہے۔ بعض حالات میں کتا انسان سے زیادہ عقل مند ہے۔دوسری بات جو زیر بحث آتی ہے وہ ساخت کی ہے۔اللہ تعالٰی نے انسان کو جس ساخت پر تخلیق کیا ہے وہ ساخت اس قسم کی ہے کہ اس ساخت کی وجہ سے وہ عقل سے زیادہ سے زیادہ کام لے سکتا ہے اگر بلی کی ساخت انسانوں کی طرح ہوتی اور جس طرح انسان دو پیروں پر چلتا ہے اسی طرح بلی بھی پیروں پر چلتی تو کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ بلی کار ڈرائیو نہ کرسکتی۔دنیاوی عقل کا تعلق جہاں تک ہے اللہ کی سب مخلوق عقل رکھتی ہے۔ جہاں تک عقل میں کمی بیشی کا تعلق ہے وہاں ہم روزانہ دیکھتے ہیں کہ آدمی بھی سب عقل مند نہیں ہوتے۔ ہزاروں لاکھوں میں چند دانش ور نکلتے ہیں اور اس دانش وری کے اندر غوطہ لگا کر جب کوئی گوہر نایاب تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہاں بھی بے عقلی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

انسان روزانہ ترقی کے نعرے لگاتا ہے روزانہ ایجادات کے لئے نئے فارمولے زیر بحث آتے ہیں کچھ دن ان فارمولوں کا چرچا رہتا ہے پھر خود ہی ان فارمولوں کی نفی ہو جاتی ہے۔آج کا دانشور جو کہتا ہے آنے والی کل کا دانشور اسی بات کی نفی کردیتا ہے جبکہ عقل سلیم یہ جانتی ہے کہ حقیقت میں تغیر و تبدل اور تعطل واقع نہیں ہوتا۔ حقیقت اپنی جگہ اٹل رہتی ہے اربوں کھربوں سال سے چاند چاند ہے، سورج سورج ہے، زمین زمین ہے۔اربوں کھربوں سال سے چاند کی گردش کے جو فارمولے قدرت نے متعین کردیئے ہیں ان میں تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔سورج کے اندر روشنی پیدا کرنے کے جو فارمولے قدرت نے بنادیئے ہیں ان میں کبھی تغیر و تبدل واقع نہیں ہوگا۔

اس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ جس بات میں تغیر، تبدل، تعطل واقع ہو سکتا ہے وہ حقیقی نہیں ہے اس کی بنیاد فکشن (FICTION) اور مفروضہ حواس پر ہے۔ تصوف اور روحانیت مفروضہ فکشن حواس کی نفی کرکے آدمی کو حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

تصور شیخ

سوال: تصوف میں تصور شیخ کے مراقبہ کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے۔ تصور شیخ کرنے والے بندے کو اس عمل سے کیا روحانی فائدہ پہنچتا ہے؟ تصوف کے آئینے میں اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب: ہم جب اپنے شیخ کا تصور کرتے ہیں تو ہوتا یہ ہے کہ شیخ کے اندر کام کرنے والی لہریں ہمارے دماغ کے اوپر منتقل ہونا شروع ہو جاتی ہیں اور جیسے جیسے تصور میں انہماک بڑھتا ہے اسی مناسبت سے لہروں کی منتقلی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ایک بات یہاں بہت زیادہ غور طلب ہے کہ جب ہم شیخ کا تصور کرتے ہیں تو ہماری نیت یہ ہوتی ہے کہ ہمیں شیخ کا وہ علم حاصل ہو جائے جس علم سے اللہ تعالیٰ کا عرفان نصیب ہوتا ہے۔نیت کے اوپر ہر عمل کا دارومدار ہے جب ہم اس نیت کے ساتھ تصور کرتے ہیں کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کا وہ علم حاصل ہو جائے جو ہمارے شیخ کو حاصل ہے تو نتیجہ میں شیخ کے اندر کام کرنے والی وہ لہریں جن سے اس نے اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل کیا ہے ہمارے اندر منتقل ہو جاتی ہیں۔شروع شروع میں لہروں کی منتقلی سے ہمارے دماغ کی صفائی ہوتی ہے۔صفائی ہونے کے بعد وہ علوم جن کا دارومدار بے یقینی اور شک پر ہے ذہن سے نکلتے ہیں اور بالآخر ذہن پاک صاف اور آئینہ کی طرح شفاف ہو جاتا ہے۔اب وہ علم منتقل ہونا شروع ہوتا ہے کہ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔"تم ہماری بصارت سے دیکھتے ہو، ہماری سماعت سے سنتے ہو اور ہمارے فواد سے سوچتے ہو۔"

مراقبہ کرنے سے پہلے جن چیزوں کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ یہ ہیں۔ذہن منتشر خیالات سے آزاد ہو۔نشست ایسی ہو کہ جس میں جسم اور اعصاب کے اوپر بوجھ اور وزن محسوس نہ ہو۔ماحول ایسا ہو جیسا کہ سونے کے لئے موزوں ہوتا ہے یعنی اندھیرا ہو اور شوروغل نہ ہو۔اس مخصوص ماحول میں آرام سے بیٹھنے کے بعد آہستہ آہستہ اور گہرے سانس لینے کے بعد سینے میں روکے بغیر منہ کے راستے آہستہ آہستہ خارج کرنے چاہئیں۔اس طرح گہرائی میں سانس لینے سے ذہن بڑی حد تک یکسو ہو جاتا ہے جب ذہن یکسو ہو جائے تو تصور شیخ کیا جائے۔تصور شیخ سے مراد یہ ہر گز نہیں ہے کہ آنکھیں بند کر کے یہ دیکھا جائے کہ شیخ ہمارے سامنے بیٹھا ہے اور شیخ کی شکل وصورت ایسی ہے۔تصور سے مراد یہ ہے کہ ذہن کو شیخ کی طرف متوجہ کر دیا جائے۔اگر ذہن میں یہ بات ہے کہ شیخ کی صورت ایسی ہے، ناک ایسی ہے، آنکھیں ایسی ہیں وغیرہ وغیرہ تو ذہن چونکہ دیکھنے میں مصروف ہو گیا اس لئے یکسو نہیں ہوا۔آدمی جیسے بے خیال ہو جاتا ہے اس طرح ذہنی طور پر بے خیال ہو جائے۔

اللہ کی مہر

سوال: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایسے لوگوں کے دلوں پر مہر لگادی گئی ہے اور یہ کہ ایسے لوگوں کے لئے عذاب الیم ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مہر لگادی تو پھر اس بندے کے غلط کاموں پر عذاب کیوں ہوا؟ دینی نقطہ نگاہ سے اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب: اگر کوئی بندہ باوجود اس کے کہ روشن راستہ اس کے سامنے ہے باوجود اس کے کہ اس کو روشن راستے پر چلنے کی ترغیب دی جا رہی ہے اور باوجود اس کے کہ روشن راستے پر انعامات واکرامات کی جو بارش برس رہی ہے اس کی بھی اطلاع اس کو دی جارہی ہے وہ پھر بھی اس روشن راستے کو قبول نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ اس کا تاریک راستے پر چلنا قبول کر لیتے ہیں۔۔۔۔۔ اور اللہ تعالیٰ کسی بندے کا تاریک راستے پر چلنا اس لئے قبول کر لیتے ہیں کہ وہ شیطان کی طرح نافرمانی اور بغاوت پر آمادہ ہے تو اس کے اوپر روشن راستے کے دروازے بند ہو جاتے ہیں یعنی دلوں اور کانوں پر مہر لگانے کا مطلب یہ ہوا کہ آدمی نے ازخود وہ راستہ اختیار کر لیا جس راستے پر چل کر آدمی عقل سلیم سے بے بہرہ ہو جاتا ہے، سماعت سے محروم ہو جاتا اور بینائی پس پردہ چلی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے اس بات سے منع نہیں کرتے کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کا یہ عمل قبول کر لیتے ہیں چنانچہ وہ اب کبھی روشن راستے پر گامزن نہیں ہو سکتا۔ یہ اس آیت مبارکہ کی علمی توجیہہ بیان ہوئی۔ اب ہم اسی آیت کی تفسیر روحانی نقطۂ نظر سے بیان کرتے ہیں روحانیت سے تعلق رکھنے والے حضرات کم و بیش اس بات سے واقف ہیں کہ مخلوق کے اندر ایسے نقطے موجود ہیں جن نقطوں میں زندگی میں کام آنے والی روشنی ذخیرہ ہوتی رہتی ہے۔ یہ نقطے فرشتوں میں بھی ہوتے ہیں، جنات میں بھی ہوتے ہیں، سیاروں میں بھی ہوتے ہیں، درختوں میں بھی ہوتے ہیں۔ یوں کہیئے کہ نباتات، جمادات، حیوانات سب میں ہوتے ہیں۔ یہ نقطے ایک ہاتھی کی زندگی کو بھی فیڈ کرتے ہیں اور ایک چیونٹی کے اندر بھی رہ کر اس کی زندگی کو جاری وساری رکھتے ہیں۔ یہ بات طویل ہو جائے گی کہ چیونٹی کے اندر کتنے نقطے کام کرتے ہیں، جنات کتنے نقطوں سے مرکب ہیں، فرشتے کتنے نقطوں کی مخلوق ہیں، پہاڑ کے اندر یہ نقطے کس فارمولے کے تحت کام کرتے ہیں اور گھاس کے اندر یہ نقطے کس فارمولے پر متحرک ہیں۔۔۔۔۔ انشاء اللہ آئندہ ہم اس کی واضح طور پر تشریح بیان کرینگے۔

اس وقت ہمارے پیش نظر آدم زاد ہے اس لئے کہ یہ آیت مبارکہ ختم اللہ علی قلوبھم و علی سمعھم و علی ابصارھم غشاوۃ ولھم عذاب عظیم۔ نوع انسانی کے لئے نازل ہوئی ہے۔ تصوف اور روحانیت سے دلچسپی رکھنے والے حضرات ان نقطوں سے واقفیت رکھتے ہیں اور ان نقطوں کو چھ لطیفوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ روحانیت میں ان کا اصطلاحی نام لطائف ستہ ہے یعنی ایک آدم زاد انفرادی طور پر یا

اجتماعی اعتبار سے چھ نقطوں کے اندر سفر کرتا ہے ان چھ نقطوں کو قرآن پاک کے قانون کے مطابق تین دائروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دائرہ جس کے اندر دو نقطے موجود ہیں آدمی کے اوپر دو راہیں کھولتا ہے ایک وہ راستہ جو شیطنت ہے اور دوسرا وہ راستہ جو رحمت ہے۔ دوسرا دائرہ رحمت کی طرف سفر کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور تیسرا دائرہ منزل ہے یعنی اس دائرے میں بندے کو اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل ہوتا ہے یہ تینوں دائرے ہمہ وقت چار نورانی نہروں سے فیڈ ہوتے رہتے ہیں۔ دائرے تین ہیں نہریں چار ہیں۔ ان نہروں کا سورس کیا ہے؟ یہ نہریں کہاں سے نکلتی ہیں اور کیوں نکلتی ہیں؟ ان نہروں میں کس قسم کے انوار کا نزول یا صعود ہوتا ہے؟ نہروں کے اندر نازل ہونے والے انوار یا روشنیاں کس طرح وہم، خیال، تصور، ادراک اور احساس میں تبدیل ہوتی ہیں۔ یہ ایک لمبا بیان ہے مختصر یہ کہ ان چار نہروں میں سے ایک نہر تیسرے دائرے کو جس میں شیطنت اور رحمت کے راستے متعین ہیں، سیراب کرتی ہے۔ اگر آدمی باوجود ترغیب کے باوجود تلقین کے، باوجود سمجھانے بجھانے کے ضد بحث اور نافرمانی کا مرتکب ہو کر صراط مستقیم سے ہٹ کر تاریکی کا راستہ اختیار کرلیتا ہے تو تیسرے دائرے کا پہلا نقطہ زہریلا ہو جاتا ہے اور یہ زہر اس کو ایک متعفن پھوڑا بنادیتا ہے۔ اس نقطے کے اندر ایسی سڑاند اور بدبو پیدا ہو جاتی ہے کہ اوپر کے دو دائرے اسے زندہ رکھنے کے لئے فیڈ تو کرتے ہیں لیکن ان کا ذہنی رابطہ یا ہمدردی تیسرے نقطے کے ساتھ نہیں رہتی۔ دوسری طرف کیونکہ اوپر کے دو دائرے سراپا نور اور روشنی ہیں، لطافت اور خوشبو ہیں اس لئے یہ متعفن پھوڑا یا نقطہ ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ جب متوجہ ہی نہیں ہوتا تو وہ راستہ بھی نظر نہیں آتا۔ جس راستے پر چل کر آدمی آسمانوں کی سیر کرتا ہے، فرشتوں سے ملاقات کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل کرتا ہے اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے ختم اللہ علی قلوبھم و علی سمعھم و علی ابصارھم غشاوۃ ولھم عذاب عظیم۔ کہہ کر نوع انسانی کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے۔

یہ بات ہمارے روزمرہ کے مشاہدے میں ہے کہ اگر آنکھ کی پتلی میں چھوٹے سے باریک تل کے نیچے کوئی رطوبت جمع ہو جائے تو دیکھی ہوئی چیز کا عکس دماغ کی سکرین پر نہیں پڑتا اور نتیجہ میں وہ چیز نظر نہیں آتی جو بظاہر آنکھوں کے سامنے ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ آنکھ اپنی صورت و شکل اور خدوخال کے لحاظ سے موجود ہے۔ آنکھ کے پپوٹوں اور آنکھ کے اندر عضلات میں دوران خون بھی ہے دوسرے دیکھنے والے آدمی کو یہ بھی نظر آرہا ہے کہ آنکھ پوری طرح صحت مند ہے لیکن اگر آنکھ کے باریک ترین ریشوں میں رطوبت، جسم کو ہم گندگی یا سڑاند بھی کہہ سکتے ہیں، جمع ہو جائے تو آنکھ کے دیکھنے کا عمل ساکت ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک فالج زدہ ہاتھ کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے فالج زدہ ہاتھ بظاہر بالکل ٹھیک اور صحیح نظر آتا ہے لیکن اس کے اندر حرکت نہیں ہوتی۔ حرکت نہ ہونے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دماغ کے وہ خلیے جو ہاتھ کو کنٹرول کرتے ہیں اور ہاتھ کو متحرک رکھتے ہیں ان خلیوں اور ہاتھ کے درمیان ایک ایسی رطوبت آجاتی ہے جس کی بناء پر ہاتھ دماغ کی دی ہوئی اطلاع کو قبول نہیں کرتا۔ نتیجے میں ہاتھ کی حرکت ختم ہو جاتی ہے۔ مزید یہ ہے کہ اگر دماغی خلیوں سے ہاتھ کا تعلق منقطع ہو جائے تو ہاتھ مڑ جاتا ہے، ٹیڑھا ہو جاتا ہے اور سوکھ جاتا ہے۔

یہی حال انسانی زندگی میں کام آنے والے تمام تقاضوں کے ساتھ ہے۔ دماغ اگر ہمیں اطلاع نہ دے کہ اس وقت ہمیں کھانا کھانے کی ضرورت ہے تو ہمیں بھوک نہیں لگتی۔ دماغ کے اندر وہ خلیے جو انسانی جسم کو سکون پہنچانے کا ذریعہ ہیں۔ اگر ان کا اور انسانی جسم کا رابطہ ٹوٹ جائے یا کم ہو جائے تو انسان کو نیند نہیں آتی۔ ان چند مثالوں سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ایک لا متناہی سلسلہ ہے جو اطلاعات پر مبنی ہے۔ جیسی جیسی اطلاعات انسان یا آدم کو ملتی ہیں اسی مناسبت سے اس کی زندگی بنتی یا بگڑتی چلی جاتی ہے وہ نقطہ جس کو ہم نے متعفن پھوڑے کا نام دیا ہے جسم انسانی میں ناف کے مقام پر ہوتا ہے اور عرف عام میں اس کو نفس کہا جاتا ہے۔ ہم یہ پوری طرح واضح کر چکے ہیں کہ زندگی کی ہر حرکت کا ہر عمل، زندگی کا ہر تصور، ہر خیال، ہر ادراک اور احساس دو رخوں پر کام کرتا ہے ایک وہ رخ ہے جس کا تعلق شیطنت سے ہے اور ایک وہ رخ ہے جس کا تعلق رحمانیت سے ہے۔ اسی طرح نفس کا تعلق بھی دو طرزوں میں ہمہ وقت قائم رہتا ہے ایک طرز شیطنت ہے اور دوسری طرز وہ حکمت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پاک کی صورت میں نوع انسان کو عطا کی ہے۔ جب کوئی آدمی اپنے اوپر ان خیالات کو مسلط کر لیتا ہے اور خود کو دروبست اس راہ کا مسافر بنالیتا ہے جو راستہ شیطان تک لے جاتا ہے تو نفس میں اسی راستے کی تمام خوبیاں یا برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو راستہ بندہ اپنے ارادے سے متعین کرتا ہے۔ ایک آدمی اگر اپنے ارادے اور اختیار سے مسلسل شیطانی راستے پر چل رہا ہے تو ظاہر ہے اس کے اوپر اس راستے میں پیش آنے والے تمام حالات و واقعات، احساسات اور تاثرات قائم ہوں گے۔ ایک آدمی ایسے راستے کا انتخاب کرتا ہے جس راستے میں درخت ہیں، پھول ہیں، راستے میں سبزہ زار ہے، آبشاریں ہیں تو وہ آدمی اس راستے کے تمام مناظر سے لطف اندوز ہوگا۔ اس کو درختوں کا سایہ بھی ملے گا اس کا دماغ راستے میں موجود پھولوں کی خوشبوؤں سے معطر بھی ہوگا، سبزہ زار سے اس کی آنکھوں کو ٹھنڈک بھی ملے گی، آبشار کا صاف، شفاف اور موتی جیسا پانی بھی اسے پینے کو ملے گا اور اس کے اوپر ایک سرور اور وجدان کی کیفیت طاری رہے گی۔ اس کے برعکس دوسرا بندہ ایسا راستہ اختیار کرتا ہے جس راستے پر ایسے درخت ہیں جو خشک ہیں، کانٹے دار ہیں، ایسے مناظر ہیں جن میں خشکی ہے، راستے میں ایسی جھیلیں ہیں جن میں تعفن ہے، بدبو ہے تو وہ آدمی ان تمام چیزوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے گا اور اگر وہ اس راستے کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوگا اور دوسرا راستہ جس پر سرشاری، شادابی، شگفتگی اور آسائش و آرام ہے، اختیار نہیں کرے گا تو کبھی وہ تعفن کی دنیا سے آزاد نہیں ہوگا اور اس کے اوپر خوشبو اور سائے کی ٹھنڈک کبھی ظاہر نہیں ہوگی۔ یہی صورت حال نفس یا اس نقطے کی ہے جس نقطے کو ہم نے تعفن پھوڑا کہا ہے یہ نقطہ دو رخوں پر قائم ہے۔

ایک رخ شیطنت ہے اور دوسرا رخ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں پر انعام ہے وہ رخ جو اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے انسان کے اندر دوسرا نقطہ ہے اس نقطہ کو عرف عام میں قلب کہا جاتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب آدمی زندگی کو صرف اور صرف دنیاوی عیش و نشاط کی زندگی قرار دے لیتا ہے اور زندگی کا سارے کا سارا مقصد دنیا بن جاتی ہے تو اس کا رشتہ اللہ تعالیٰ سے کمزور ہوتا چلا جاتا ہے اور جیسے جیسے یہ رشتہ کمزور ہوتا ہے نفس کا رابطہ قلب سے کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کو ہم آسان الفاظ میں اس

طرح کہہ سکتے ہیں کہ وہ بندہ جس کے نزدیک زندگی دنیااور صرف دنیا ہے یا دنیا کا عیش و نشاط ہے وہ اپنے خالق سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ قلب یا ضمیر اسے برابر اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ یہ راستہ جو اختیار کر لیا گیا ہے وہ راستہ ہے جو ان لوگوں کا راستہ نہیں ہے جو انعام یافتہ ہیں لیکن بندہ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے دنیاوی لذت کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتا جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قلب اور ضمیر اس کو اللہ کے راستے کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش ترک کر دیتے ہیں اور جب ایسا ہوتا ہے تو نفس صرف ایک رخ کی طرف سفر کرنا شروع کر دیتا ہے یعنی وہ اپنے ارادے اور اختیار سے اس زندگی کو قبول کر لیتا ہے جو زندگی شیطان کی زندگی ہے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ دین کے معاملے میں جبر نہیں فرماتے اور ہر بندے کو اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ دین اور دنیا دونوں راستوں میں سے وہ کسی ایک راستے کا انتخاب کرے۔ چنانچہ مسلسل ترغیب(Inspiration)اور بندے کو خیر کی آواز کو نظر انداز کرنے کے بعد جب یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کیا جاتا ہے کہ یہ بندہ کسی صورت بھی صراط مستقیم پر چلنے پر آمادہ نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ارادے اور اختیار کو قبول کر لیتے ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ ارادہ اور اختیار یعنی شیطنت قبول کرنے کا ارادہ قبول کر لیا ہے اس لئے اب صراط مستقیم پر چلنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اب اللہ کی طرف سے ان کے دلوں میں مہر لگ گئی ہے اس بات کو ہم اس طرح کہتے ہیں کہ دلوں پہ مہر اللہ نے نعوذ باللہ کسی دشمنی کی وجہ سے نہیں لگائی بلکہ اللہ تعالیٰ نے بندے کا ارادہ اور اختیار قبول کر لیا ہے کہ وہ اس راستے پر چلنا ہی نہیں چاہتا۔ اگر اللہ تعالیٰ اس کا یہ ارادہ اور اختیار قبول نہ کریں تو اختیار زیر بحث آجاتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ آدم اور جنات بااختیار ہیں اور انہیں نیکی یا بدی اختیار کرنے کی آزادی دی گئی ہے، صحیح نہیں ہوگا قانون قدرت میں سقم پڑ جائے گا۔ بااختیار ہونے سے مراد یہ ہے کہ بندہ خود اپنے لئے کوئی ایک راستہ اختیار کرے اللہ تعالیٰ اگر چاہیں تو دنیا میں چوری نہیں ہو سکتی اور اللہ تعالیٰ اگر چاہیں تو دنیا میں کوئی قتل نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ اگر چاہیں تو دنیا میں کوئی آدمی بے نمازی نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ اگر چاہیں تو شیطان کا وجود ختم ہو سکتا ہے لیکن بااختیار ہونے کا مسئلہ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔ ایک آدمی جب اپنی مرضی سے برائی نہیں کر سکتا۔ تو اپنی مرضی سے بھلائی کے راستے پر چلتا رہے اس لئے قلب اور ضمیر برابر اسے اس طرف متوجہ کرتے رہتے ہیں کہ راستہ جو اختیار کیا جا رہا ہے غلط ہے۔ لیکن ایک آدمی جانتے بوجھتے اور سمجھتے ہوئے کہ میں جس راستے پر چل رہا ہوں وہ راستہ صحیح نہیں ہے پھر بھی چلتا یہ تو اللہ تعالیٰ اس کا اس راستے پر چلنا قبول کر لیتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کا شیطنت پر چلنے کا عمل قبول کر لیتے ہیں تو پھر وہ بندہ شیطان سے انسان نہیں بن سکتا۔

قرآن پاک میں جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے اس میں جہاں تخلیق کا ذکر ہے وہاں ملائکہ کا ذکر ہے، جنات کا ذکر ہے، آدم زاد کا ذکر ہے، زمین کا ذکر ہے، سماوات کا ذکر ہے، پہاڑوں کا ذکر ہے، ہر اس مخلوق کا ذکر ہے جس مخلوق کے تخلیقی فارمولے بیان ہوئے ہیں۔ انسان اور جنات کے بیان میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ ان کو بااختیار بنایا گیا ہے۔ فرشتوں کے بارے میں یہ نہیں کہا گیا کہ وہ بااختیار ہیں یہی وجہ ہے کہ فرشتوں سے غلطی سرزد نہیں ہوتی اور نہ ہی ان کے اوپر محاسبہ ہے ان کے سپرد جو کام کر دیا گیا ہے وہ کر

رہے ہیں۔ متذکرہ بالا آیات کی تشریح اور تفسیر جو کچھ بیان کی گئی اس سے یہ بات ہمارے سامنے آگئی کہ دلوں پہ مہر لگ جانا یا آنکھوں پر پردہ پڑ جانا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس حد تک ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کے اس اختیار کو قبول کر لیا ہے کہ وہ بھلائی کا راستہ اختیار نہیں کرے گا بلکہ برائی کے راستے پر چلنے میں اپنی عافیت سمجھتا ہے۔ یہی حال قوموں کے عروج وزوال کا بھی ہے جب قومیں اپنے لئے ایسے راستے متعین کرتی ہیں جن راستوں پر چل کر عزت و سرفرازی حاصل ہوتی ہے تو قومیں سرفراز ہو جاتی ہیں اور جو قومیں اپنے لئے ایسے راستے منتخب کرتی ہیں جن راستوں پر چل کر ذلت، خواری اور مسکنت نصیب ہوتی ہے تو وہ قومیں ذلیل و خوار ہو جاتی ہیں ان سے بادشاہتیں چھین کر انہیں غلام بنایا جاتا ہے ایسی قومیں بھکاری بن جاتی ہیں، ایسی قومیں در در کی ٹھوکریں کھاتی ہیں اور زمین ان کے وجود کو قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔

ان کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ وہ قومیں جو سرفراز ہیں ان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ لیکن جب عزت، توقیر اقتدار اور حاکمیت زیر بحث آتی ہے تو یہ قومیں نہایت ابتر اور خستہ حال اور پریشان نظر آتی ہیں۔ آج کے دور میں اسرائیل اور مسلمانوں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اسرائیلی تیس لاکھ ہیں، مسلمان 90 کروڑ ہیں، 90 کروڑ اور 30 لاکھ کا حساب کچھ بلی چوہے کا سا نظر آتا ہے لیکن مسلمان کی حیثیت ایک زخم خوردہ چوہے سے زیادہ نہیں ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کا نفس متعفن پھوڑا بن گیا ہے اور یہی صورت ہے جس کو قرآن پاک نے قیامت کا نام دیا ہے۔

اللہ کے دوست

سوال: انسانی زندگی کا دارومدار اطلاع پر ہے۔ کیا موت کے بعد بھی اطلاعات کا سلسلہ جاری رہتا ہے؟ تصوف کے حوالے سے تشریح فرمائیں۔

جواب: یہ بات کئی بار پوری طرح واضح کی گئی ہے کہ انسانی زندگی کا دارومدار محض اور محض اطلاع یا خبر کے اوپر ہے۔ ہم جب زندگی میں کام کرنے والے تقاضوں کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمارے اوپر اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ دراصل زندگی میں کام آنے والا ہر جذبہ ایک خبر یا اطلاع ہے۔ یہ بات بھی بتائی جا چکی ہے کہ کھانا آدمی اس وقت کھاتا ہے جب اسے بھوک لگتی ہے۔ پانی آدمی اس وقت پیتا ہے جب اسے پیاس لگتی ہے۔ سونے کے لئے بستر پر اس وقت لیٹتا ہے جب اسے سونا ہوتا ہے۔ نیند سے اس وقت بیدار ہوتا ہے جب اسے دماغ اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ مزید سونا جسمانی اور دماغی صحت کے لئے مضر ہے۔ اپنے بچوں سے آدمی پیار اس بنیاد پر کرتا ہے کہ شعوری اور لاشعوری اعتبار سے یہ بات اس کے علم میں ہے کہ یہ اس کے بچے ہیں۔ اگرچہ وہ دوسرے بچوں سے بھی محبت کرتا ہے اور ان کے ساتھ شفقت سے پیش آتا ہے لیکن اپنی اولاد اور دوسرے کی اولاد میں بہر حال امتیاز برقرار رہتا ہے۔

بچے بحیثیت بچوں کے سب برابر ہیں۔ بھولے بھالے معصوم چہرے سب بچوں کے ہوتے ہیں۔ ان کی پیاری اور خوش کرنے والی باتیں بھی ایک سی ہوتی ہیں۔ بچوں کا مزاج بھی تقریباً یکساں ہوتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ اطلاع ہے کہ یہ بچے ہمارے ہیں اور وہ بچے فلاں کے ہیں۔ یہ اطلاع یا خبر محبت اور شفقت میں ایک حد فاصل پیدا کر دیتی ہے۔ عورت بحیثیت عورت کے عورت ہے۔ دنیا کی تمام عورتیں ایک سے خدوخال پر مشتمل ہیں لیکن جب رشتہ زیر بحث آتا ہے تو ہمیں اطلاع ملتی ہے کہ یہ عورت ہماری بہن ہے، یہ عورت ہماری ماں ہے، یہ عورت ہماری بیوی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اطلاع نے ایک ہی ہستی کے رشتے الگ الگ متعین کر دیئے۔ ایک آدمی رات دن محنت کر کے پسینہ بہا کر روزی حاصل کرتا ہے۔ اس روزی کے حصول کے دوران اس کے دماغ میں یہ بات موجود ہے کہ یہ روزی حلال ہے۔ دوسرا آدمی پہلے آدمی سے بہت زیادہ محنت کرتا ہے لیکن اس کے دماغ میں یہ اطلاع یا خبر یا یہ مفہوم موجود ہے کہ یہ روزی حلال نہیں ہے۔ دونوں آدمی آٹا خریدتے ہیں۔ آٹے سے روٹی پکتی ہے اور دونوں آدمی روٹی کھاتے ہیں۔ مگر اطلاع کی بنیاد پر ایک کھانا حلال قرار پاتا ہے اور دوسرا کھانا حرام قرار پاتا ہے۔ یہی حال ہماری جسمانی

صحت اور بیماری کا بھی ہے۔ بیمار ہونے سے پہلے ہر آدمی کے اوپر کم و بیش یہ کیفیت ضرور طاری ہوتی ہے کہ وہ بیمار ہے۔ نتیجہ میں وہ بیمار ہو جاتا ہے۔ ایک آدمی اچھا خاصا بیٹھا ہوا ہے۔ طبیعت میں اگر کسلمندی ہے، اعصاب میں ذرا سا کھچاوٹ ہے۔ وہ اس بات کا اظہار اس طرح کرتا ہے کہ میری طبیعت خراب ہے اور مجھے بخار ہونے والا ہے۔ نتیجہ میں اسے بخار ہو جاتا ہے۔ جب تک کوئی آدمی بیماری کی اطلاع قبول نہیں کر لیتا، وہ ہر گز بیمار نہیں ہوتا۔ یہ قانون ہے اور بیماری چھوٹی ہو یا بڑی اس کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ یہ بات بڑی عجیب ہے کہ کوئی آدمی اپنی مرضی سے بیمار ہوتا ہے لیکن قانون یہ ہے یا لوح محفوظ پر یہ لکھا ہوا ہے کہ جب تک کوئی آدمی بیماری کی اطلاع کو قبول نہیں کر لیتا، بیمار نہیں ہو سکتا۔ یہی حال موت کا بھی ہے۔ جب تک کوئی آدمی ذہنی یا شعوری طور پر لاشعور میں ذخیرہ موت کی اطلاع قبول نہیں کرتا، وہ ہر گز نہیں مرتا۔ یہ بھی بہت عجیب بات ہے کیونکہ آدمی اس دنیا میں ایسا پیدا نہیں ہوا جو خود اپنی مرضی سے مرنا چاہتا ہو۔ لیکن قانون اپنی جگہ اٹل ہے۔ اس لئے کہ نہ صرف زندگی بلکہ موت بھی ایک اطلاع ہے۔

یہاں ایک اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ صاحب! انفرادی طور پر بہ امر مجبوری اس قانون کو مان لیتے ہیں۔ لیکن یہ جو حادثاتی موتیں ہوتی ہیں یا جنگوں میں ہزاروں لاکھوں آدمی مر جاتے ہیں، یہ تو نہیں چاہتے کہ ہم مر جائیں۔ ایک دشمن نے حملہ کر کے ان کے اوپر موت مسلط کر دی حالانکہ وہ مرنا نہیں چاہتے تھے ایسا نہیں ہے، فی الواقع وہ سب مرنا چاہتے تھے اس لئے مر جاتے ہیں۔ زندگی کے طرز عمل کو اگر بہت غور سے دیکھا جائے، زندگی میں کام کرنے والی طرزوں کی چھان پھٹک کی جائے اور اس کے ساتھ ساتھ آسمانی صحائف کے بیان کردہ قوانین کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بہت آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ ایک دائرہ شعوری ہے اور دوسرا دائرہ لاشعوری۔ قدرت نے یہ بات متعین کر دی ہے کہ اس قسم کے اعمال و حرکات اور اس قسم کا طرز عمل قوموں کو تباہ کر دیتا ہے اور اس قسم کا طرز عمل قوم کی رگوں میں زندگی بن جاتا ہے۔ جو قومیں اپنی زندگی یعنی روح سے دور ہو جاتی ہیں وہ قومیں مر جاتی ہیں۔ اس لئے کہ مرنے کا مطلب یہ ہر گز نہیں ہے کہ آدمی کا وجود تحلیل ہو گیا۔ یا آدمی بنیادی طور پر ختم ہو گیا۔ موت کا مطلب یہ ہے کہ انسانی جسم یعنی گوشت پوست کے جسم کا رشتہ روح سے منقطع ہو گیا۔ انفرادی طور پر کوئی فرد واحد روح سے رشتہ منقطع کر لے وہ بھی مرنا ہے اور اجتماعی طور پر پوری قوم اپنی روح سے رشتہ منقطع کر لے وہ بھی مرنا ہے یعنی کسی فرد یا قوم نے اس اطلاع کو قبول کر لیا ہے جس اطلاع کا نام عرف عام میں موت رکھا جاتا ہے۔ مسلمان من حیث القوم جب تک اپنی روح کے ساتھ وابستہ رہے، دنیا میں عروج پاتے رہے۔ اور مسلمان من حیث القوم جب اپنی روح سے دور ہوئے، مر گئے۔ مرنے کی بہت ساری شکلیں ہیں۔ کوئی وبا آ کر کھا جائے۔ کوئی دشمن شب خون مار کر ہلاک کر دے، کوئی بڑی طاقت لقمہ تر سمجھ کر نگل لے۔ قانون اپنی جگہ قانون ہے کہ قوم نے اس لئے وہ اطلاع جو موت کا روپ دھارتی ہے انتخاب کر لیا۔ تمام انبیاء کا مشن، ان کی تعلیم اور تبلیغ یہ ہے کہ انسان کو یہ بتا دیا جائے کہ اس کا وجود صرف اور صرف اطلاع پر قائم ہے۔ روح اگر کہتی ہے کہ تو زندہ ہے تو وہ زندہ ہے۔ روح اگر کہتی ہے کہ تو مردہ ہے تو وہ مردہ۔ موت کی قسمیں ہیں، ایک موت طبعی موت کہلاتی ہے، ایک موت حادثاتی موت کہلاتی ہے۔

ایک موت اجتماعی موت کہلاتی ہے۔ کسی موت کا نام موت رکھا جاتا ہے اور کسی موت کا نام ہلاکت رکھا جاتا ہے اور کسی موت کا نام شہادت رکھا جاتا ہے۔ یہاں بھی قانون کی وہی دفعہ کام کر رہی ہے کہ موت کی اطلاع ہمیں کن معنوں میں موصول ہوئی۔ آیا ہم طبعی موت مر رہے ہیں یا ہم کتے بلی کی موت مر رہے ہیں۔ یا ہم شہادت حاصل کر رہے ہیں۔ ہم جب اس دنیا سے منتقل ہو رہے ہیں تو ہمارا ٹھکانہ جہنم ہے یا ہمارا ٹھکانہ جنت میں ہو گا۔ جس اطلاع میں آدمی مر جاتا ہے، مرنے کے بعد وہی اطلاع زندگی بن جاتی ہے۔

کوئی آدمی اس دنیا میں پریشان حال ہے۔ وہ پریشان خیالی اور خلفشار کے عذاب میں مر گیا تو وہ سیدھا دوزخ میں گیا۔ اس لئے دوزخ کی اطلاع انبیاء سے جو کچھ ہمیں ملی وہ پریشان حالی ہے، درماندگی ہے، منتشر خیالی ہے، تکلیف و اذیت ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس کے برعکس اگر کوئی بندہ سکون آشنا زندگی میں داخل ہو کر، راحت و سکون کے جذبات سے متاثر ہو کر اور عدم تحفظ اور ڈر اور خوف کے جذبات سے آزاد ہو کر مرتا ہے تو وہ سیدھا جنت میں جاتا ہے۔ اس لئے کہ انبیاء سے جنت کے بارے میں جو اطلاع ہمیں ملی وہ یہ ہے کہ راحت ہو گی، رات و سکون ہو گا، آرام ملے گا، طرح طرح کی نعمتیں دستر خوان پر ہمیں میسر ہوں گی، وغیرہ وغیرہ۔ یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ دوزخ جس طبقے یا جس علاقے یا جس آبادی یا جس کانٹوں بھرے میدان کا نام ہے وہاں وہ لوگ قیام کریں گے جو اللہ کے ناپسندیدہ ہیں، جنہوں نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ ہم اللہ کو پہچانیں، اللہ سے ہمارا تعلق اور رابطہ قائم ہو، ہمیں اللہ کا قرب نصیب ہو اور ہم اللہ کے دوست بن جائیں۔ دوسرا طبقہ جنت کا طبقہ ہے۔ اس طبقہ میں وہ لوگ رہیں گے جن لوگوں نے اللہ سے قربت حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کی، وہ لوگ رہیں گے جنہوں نے ان باتوں سے احتراز کیا جو اللہ اور اس کے رسول کو ناپسندیدہ ہیں۔ جنت میں وہ لوگ رہیں گے جنہوں نے قرآن کی تعلیمات کو اس طرح سمجھا جس طرح پیغمبروں نے سمجھا، اپنی عارضی زندگی میں اللہ کے دیئے ہوئے اختیار کو اس طرح استعمال کیا جس طرح پیغمبروں نے اپنے اختیارات استعمال کئے۔ جنت کے باسی وہ لوگ ہوں گے۔ جن کے سروں پر اللہ تعالیٰ نے دست شفقت رکھ دیا ہے۔ وہ اللہ کے دوست ہیں۔ الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ اللہ کے دوستوں کی تعریف یہ ہے کہ ان کی زندگی میں نہ خوف ہوتا ہے اور نہ حزن و ملال ہوتا ہے اور نہ غم ہوتا ہے۔ اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں اگر تفکر کیا جائے تو ایک ہی بات سامنے آتی ہے اور یہ بات ایسی ہے جس کو کوئی بڑے سے بڑا عالم دین، بڑے سے بڑا مسند نشین، گدی نشین، بڑے سے بڑا پیر رد نہیں کر سکتا، یہ کہ اللہ کے دوستوں کو نہ خوف ہوتا ہے اور نہ غم اور جن لوگوں کے اندر غم ہوتا ہے اور خوف ہوتا ہے وہ اللہ کے دوست نہیں ہو سکتے اور جو اللہ کے دوست نہیں ہوتے، جنت کی فضا انہیں قبول نہیں کرتی۔ وہ دوزخ کا ایندھن ہوتے ہیں۔ اگر کسی کے اندر غم اور خوف ہے تو اللہ کے بیان کردہ قانون کے مطابق وہ جنتی نہیں ہے۔ روحانی قدروں میں کسی شاگرد یا راہ سلوک پر چلنے والے مسافر کی تربیت اس طرح کی جاتی ہے کہ اس کے دل سے خوف اور غم نکل جائے۔ خوف اور غم اس وقت تک پیچھا نہیں چھوڑتے جب تک آدمی کے اندر قناعت اور استغناء موجود نہ ہو۔

قناعت اور استغناء کوئی لفظی معمہ نہیں ہے یا کوئی حساب کا ہیر پھیر نہیں ہے۔استغناء فی العمل ایک کیفیت ہے،ایک حقیقت ہے۔

ایسی حقیقت جو حقیقت مطلق کے متصل ہے جب تک کوئی بندہ حقیقت سے متعارف نہیں ہوتا،مشاہدہ نہیں کر لیتا اس وقت تک اس کے اندر استغناء پیدا نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو وہ اتنا ہوتا ہے کہ محض اس کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔جس آدمی کے اندر جس مناسبت سے قناعت اور استغناء موجود ہے اس آدمی کے اندر اسی مناسبت سے ڈر،خوف اور غم بھی کم ہوتا ہے۔

باب ششم

استغناء، توکل اور بھروسہ

سوال: استغناء کی اصطلاح کا اصول مفہوم کیا ہے۔ کیا یہ توکل اور اللہ پہ بھروسہ رکھنے کا ہی دوسرا نام ہیں؟ اس کی وضاحت کریں۔

جواب: صاحب مراقبہ جب پہلی سیڑھی سے قدم بڑھا کر دوسری سیڑھی پر قدم رکھتا ہے تو اس کے سامنے اس کا اصلی جسم جسم مثالی یا Aura آجاتا ہے۔ پہلی بات جو سالک کے ذہن میں وارد ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اسے اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ مٹی کے ذرات سے بنے ہوئے گوشت پوست کی حیثیت محض عارضی، فانی اور مفروضہ ہے۔ حقیقی حیثیت روشنیوں کا وہ جسم ہے جس نے گوشت پوست کے جسم کو سنبھالا ہوا ہے اس وقت کیونکہ تخلیقی فارمولوں کے تحت وہ قانون بیان ہو رہا ہے جس قانون کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیان کرنے کی اجازت ہے، اس لئے یہاں روح Aura اور جسم مثالی کا فرق بیان کرنا ضروری ہے۔ مرنے کی حالت کو عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ ۔۔۔۔۔روح نکل گئی۔ مرنے کے بعد جس عالم میں آدمی منتقل ہوتا ہے اس کے بارے یہ کہا جاتا ہے کہ مرنے والا اپنے دوستوں اور عزیزوں کی روحوں کے عالم اعراف میں چلا گیا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اعراف میں آدمی کھانا بھی کھاتا ہے، پانی بھی پیتا ہے، سوتا جاگتا بھی ہے، وہاں اپنے رشتہ داروں سے ملتا بھی ہے، دکھ درد، سکون، راحت اور اطمینان سے آشنا بھی ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مرنے والے آدمی کی روح نکل گئی ہے تو روح نکلنے سے مراد یہ ہوگی کہ اب آدمی نہ سن سکتا ہے نہ دیکھ سکتا ہے نہ محسوس کر سکتا ہے وغیرہ وغیرہ ہم جس کو مرنا کہتے ہیں دراصل وہ ایسی حالت ہے جس کو ہم روشنی کے ہالے کا مٹی کے جسم سے رشتہ منقطع کر لینے کا نام دے سکتے ہیں۔ حضور قلندر بابا صاحبؒ نے کتاب ''لوح و قلم'' میں اس بات کو بالوضاحت بیان کیا ہے، فرماتے ہیں۔ ''آدمی گرم و سرد سے محفوظ رہنے کے لئے اور اعضائے جسمانی کو تپش اور سرد لہروں سے بچانے کے لئے ایک لباس اختراع کرتا ہے، یہ لباس سوتی کپڑے کا ہوتا ہے، اونی کپڑے کا ہوتا ہے یا کسی بھی قسم کے بنے ہوئے دھاگوں کے تانے بانے سے مرکب یا بنا ہوا ہوتا ہے، جب تک یہ خود تخلیق کردہ لباس جسم کے اوپر محفوظ ہے۔ اس وقت تک اس لباس میں حرکت رہتی ہے جسم کے اوپر قمیض کی حرکت جسم کی حرکت کے تابع ہوتی ہے اگر قمیض جسم کے اوپر ہے تو آستین ہاتھ کی حرکت کے ساتھ ہلنے پر مجبور ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ہاتھ ہلے اور آستین نہ ہلے۔ اس طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ پہنی ہوئی قمیض کی آستین ہلے تو اس کے ساتھ ہاتھ بھی حرکت کرے ہمیشہ ہاتھ کی حرکت کے ساتھ قمیض کی آستین میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ اگر جسم پر پہنی ہوئی اسی قمیض کو اتار کر زمین پر یا چارپائی پر ڈال دیا جائے اور اس قمیض سے کہا جائے کہ وہ حرکت کرے چلے پھرے تو

اس کے اندر ہرگز کوئی حرکت پیدا نہیں ہوگی۔ باباصاحب قبلہ گوشت پوست کے جسم کو جسم مثالی کا لباس قرار دیتے ہیں۔ فرق اگر ہے تو صرف اتنا کہ کپڑے کی بنی ہوئی قمیض جسم کے اوپر ہوتی ہے اور جسم مثالی گوشت پوست کے اوپر ہوتا ہے۔ لباس اور گوشت پوست کے جسم کی حیثیت قائم کرکے ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مرے ہوئے آدمی کا جسم یا لاش جب زمین پر پڑی ہوئی ہوتی ہے تو قمیض کی طرح اس کے اندر اپنی کوئی حرکت نہیں ہوتی۔ آپ لاکھ کوشش کریں کہ یہ لاش اپنی مرضی اور اپنے اختیار سے حرکت کرے۔ یہ تمام کوشش بے کار اور بے سود ثابت ہوگی۔ اس لئے بے سود ثابت ہوتی ہے کہ جس جسم کا یہ لباس تھا اس جسم نے اسے اتار پھینکا ہے۔

عام حالات میں جب استغناء کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کس آدمی کو اللہ تعالیٰ کے اوپر کتنا توکل اور بھروسہ ہے توکل اور بھروسہ کم و بیش ہر آدمی کی زندگی میں داخل ہے۔ لیکن جب ہم توکل اور بھروسہ کی تعریف بیان کرتے ہیں تو ہمیں بجز اس کے کچھ نظر نہیں آتا کہ ہماری دوسری عبادات کی طرح بھروسہ اور توکل بھی دراصل لفظوں کا ایک خوش نما جال ہے۔ توکل اور بھروسہ سے مراد یہ ہے کہ بندہ اپنے تمام معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد کردے لیکن جب ہم فی العمل زندگی کے حالات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو یہ بات محض نعرہ اور غیر یقینی ہے اور یہ ایسی بات ہے کہ ہر آدمی کی زندگی میں اس کا عمل دخل جاری و ساری ہے۔ مثلاً ایک آدمی کسی فرم میں ملازمت کرتا ہے۔ اس کے پیش نظر یہ بات رہتی ہے کہ فرم کا مالک یا سیٹھ ساہوکار اگر مجھ سے ناراض ہوگیا تو ملازمت سے برخاست کردیا جاؤں گا۔ یا میری ترقی نہیں ہوگی یا ترقی تنزلی میں بدل جائے گی۔ ظاہر ہے یہ بات بھروسہ اور توکل کے سراسر خلاف ہے۔ اس کے برعکس ہم زندگی میں یہ بات بار بار دہراتے ہیں کہ اگر کوئی نہیں کریں گے تو کھائیں گے کہاں سے۔

یہ بات بھی ہمارے سامنے ہے کہ جب کسی کام کا نتیجہ اچھا مرتب ہوتا ہے تو ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ نتیجہ ہماری عقل اور ہماری فراست و فہم سے مرتب ہوا ہے۔ اس قسم کی بے شمار مثالیں ہیں جن سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ بندے کا اللہ تعالیٰ کے اوپر توکل اور بھروسہ محض مفروضہ ہے۔ جس بندے کے اندر توکل اور بھروسہ پیدا نہیں ہوتا اور اس کے اندر استغناء بھی نہیں ہوتا۔ استغناء سے مراد یہ ہے کہ ضروریات زندگی گزارنے میں بندے کا اپنا ذاتی ارادہ یا اختیار شامل نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ اگر مرغی کھلاتے ہیں اس میں خوش رہتا ہے، اللہ تعالیٰ اگر چٹنی سے روٹی دیتے ہیں اس میں بھی خوش رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر کھدر کے کپڑے پہناتا ہے اس میں بھی خوش رہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی میں پیش آنے والے ہر عمل اور حرکت کو اللہ کی طرف موڑ دیا جاتا ہے۔ پہلے بندے کے اندر توکل اور بھروسہ پیدا ہوتا ہے اور اس کے بعد وہ استغناء کے دائرے میں قدم رکھتا ہے۔ توکل اور بھروسہ دراصل ایک خاص تعلق ہے جو بندے اور اللہ کے درمیان براہ راست قائم ہے اور جس بندے کا اللہ کے ساتھ یہ رابطہ قائم ہو جاتا ہے اس بندے کے اندر سے دنیا کا تمام لالچ نکل جاتا ہے۔ ایسا بندہ دوسرے تمام بندوں کی امداد اور تعاون سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور اس بندے کی حیثیت ایسی ہو جاتی ہے کہ جس حیثیت کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے سورہ اخلاص کی 5 آیتوں میں کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ اخلاص میں پانچ حتمی

باتیں بیان فرمائی ہیں۔اس بات کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ اخلاص میں اپنی ذات پر سے پردہ اٹھادیا ہے اور یہ بھی بتادیا ہے کہ جو صفات اللہ تعالیٰ کے اندر موجود ہیں یا جو صفات اللہ تعالیٰ کی ہیں وہ صفات مخلوق کے اندر موجود نہیں ہیں۔سورہ اخلاص کی پانچ آیتیں ہمیں خالق اور مخلوق کا امتیاز سکھاتی ہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔''اے پیغمبر ﷺ ! آپ فرمادیجئے اللہ ایک ہے،اللہ بے نیاز ہے،کسی سے احتیاج نہیں رکھتا۔اللہ نہ کسی کا بیٹا ہے اور نہ اللہ کسی کا باپ،اللہ تعالیٰ کوئی خاندان بھی نہیں رکھتا۔'' ان صفات کی روشنی میں جب ہم مخلوق کا تجزیہ کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ مخلوق کبھی ایک نہیں ہوتی۔مخلوق ہمیشہ بکثرت ہوتی ہے۔مخلوق زندگی کے اعمال وحرکات پورے کرنے پر کسی نہ کسی احتیاج کی پابند ہے۔یہ بھی ضروری ہے کہ مخلوق کسی کی اولاد ہو۔مخلوق کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا کوئی خاندان ہو۔اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ ان پانچ صفات میں جب لاشعوری تفکر سے کام لیا جاتا ہے تو ہمیں ایک بات ایسی ملتی ہے کہ ہم ان صفات کو جو اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہیں ان میں سے ایک صفت اپنے ارادے اور اختیار سے اپنے اوپر وارد کر سکتے ہیں۔مخلوق کے لئے یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ وہ کثرت سے بے نیاز ہو۔مخلوق اس بات پر بھی مجبور ہے کہ اس کی کوئی اولاد ہو۔اسی طرح مخلوق کا خاندان ہونا بھی ضروری ہے۔مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ پانچ صفات میں سے چار صفات میں مخلوق اپنا اختیار استعمال کرنے کے لئے بے بس اور مجبور ہے۔صرف ایک ایجنسی ایسی ہے کہ مخلوق اللہ تعالیٰ کی صفت کو اپنے ارادے اور اختیار سے اپنے اوپر وارد کر سکتی ہے اور وہ ہے،اللہ احتیاج سے ماوراء ہے۔مخلوق کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ دنیاوی تمام وسائل سے اپنی ضروریات اور احتیاج کو توڑ کر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستہ کر لے۔یہی وابستگی توکل اور بھروسہ ہے۔اگر بندے کے اندر مخلوق کے ساتھ احتیاجی عوامل کام کر رہے ہیں تو وہ توکل اور بھروسہ کے اعمال سے دور ہے۔راہ سلوک کے مسافر کو سب سے پہلے اس بات کی مشق کرائی جاتی ہے کہ زندگی کے تمام تقاضے اور زندگی کی تمام حرکات وسکنات پیر ومرشد کے تابع ہیں۔زندگی کی حرکات وسکنات جب سالک پیر ومرشد کے سپرد کر دیتا ہے تو وہ اس کی تمام ضروریات کا کفیل بن جاتا ہے،بالکل اس طرح جس طرح ایک دودھ پیتے بچے کے کفیل اس کے والدین ہوتے ہیں۔ان بچوں کی کفالت زیر بحث آتی ہے جنہوں نے ابھی تک شعور کے دائرے میں قدم نہیں رکھا ہے۔جب تک بچہ شعور کے دائرے میں داخل نہیں ہوتا والدین چوبیس گھنٹے اس کی فکر میں مبتلا رہتے ہیں۔

لاتعداد ماورائی واقعات میں سے چند مزید واقعات کا دہرا دینا اس لئے ضروری ہے کہ راہ سلوک کے مسافروں کے سامنے وہ تمام مراحل آجائیں جن مراحل سے گزر کر کوئی سالک استغناء کے دائرے میں قدم رکھتا ہے اور اس کے ذہن میں استغناء اور بے نیازی کا ایسا پیٹرن Pattern ترتیب پا جاتا ہے جس کی بنیاد پر سالک غیر اختیاری طور پر بھی اپنے معاملات اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا ہے۔ابھی ہم نے یہ بتایا ہے کہ یقین پیدا ہونے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کو یقین کے عوامل سے اس طرح رد و بدل کر دیا جائے کہ یقین اس کی زندگی کا احاطہ کرے۔ایسا احاطہ کہ شعوری اختیار سے جاننے کے باوجود وہ اس احاطہ یا اس دائرے

سے قدم باہر نہ نکال سکے۔یقین کی تعریف میں ہم پچھلے اسباق میں بالوضاحت بتا چکے ہیں کہ پیدائش سے موت تک اور موت کے بعد کی زندگی میں اعراف حشر و نشر، حساب و کتاب، جنت دوزخ اور

اللہ تعالیٰ کی تجلی کا دیدار سب کا سب یقین کے اوپر قائم ہے۔بنیادی بات یہ ہے کہ آدمی کو سب سے پہلے اس بات کا یقین پیدا ہوتا ہے کہ وہ زندہ ہے وہ موجود ہے اس کے اندر عقل و شعور کام کرتا ہے وہ ایک حد تک بااختیار ہے اور بڑی حد تک اس کے اوپر غیر اختیاری کیفیات نازل ہوتی رہتی ہیں مثلاً کوئی آدمی اپنے ارادے اور اختیار سے اگر سانس لینا شروع کر دے تو چند منٹ میں وہ ہانپ جائے گا۔کوئی آدمی اپنے ارادے اور اختیار سے سانس نہ لینے کا عمل اختیار کرے تو بیمار ہو جائے گا۔یا اس کے دماغ میں خون جم جائے گا۔ اسی طرح کوئی آدمی زندگی کے بنیادی تقاضے بھوک میں اپنا ذاتی اختیار استعمال نہیں کرتا عام زندگی میں بھوک لگتی ہے وہ کچھ کھا لیتا ہے، پیاس لگتی ہے تو پانی پی لیتا ہے۔یہی حالت آدمی کے اندر اس مشین کی ہے جو مشین مسلسل متواتر ہر لمحہ اور ہر آن چل رہی ہے۔اس مشین کے کل پرزے اعضائے رئیسہ دل، پھیپھڑے، گردے، جگر، پتہ اور آنتوں کی حرکت مسلسل جاری ہے

ارب کی آبادی میں ایک آدمی ایسا نہیں ہے جو اپنے ارادے اور اختیار سے اپنے اندر فٹ کی ہوئی مشین کو چلاتا ہو۔ مشین بالکل غیر اختیاری طور پر چل رہی ہے۔اس مشین میں جو ایندھن استعمال ہوتا ہے اس پر بھی انسان کی کوئی دسترس نہیں ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب یہ مشین بند ہو جاتی ہے تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت یا ترقی اسے چلا نہیں سکتی۔ یہ مشین قدرتی نظام کے تحت بتدریج بھی بند ہو جاتی ہے اور اک دم بھی بند ہو جاتی ہے۔ بتدریج بند ہونے کا نام بیماری رکھا جاتا ہے اور مشین کے اک دم بند ہو جانے کو حرکت قلب بند ہو جانا یا ہارٹ فیل کہا جاتا ہے۔انسان یہ سمجھتا ہے کہ بیماری کا علاج اختیاری ہے۔اگر بیماریوں کا علاج اختیاری ہے تو دنیا میں کوئی آدمی مرتا نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس زندگی کے بنیادی عوامل اور وہ تمام محرکات جن پر زندگی رواں دواں ہے انسان کے اختیار میں نہیں ہیں۔اگر ہم بنیاد پر نظر ڈالیں تو زندگی اس وقت شروع ہوتی ہے جب آدمی پیدا ہوتا ہے اور پیدائش پر انسان کو کوئی اختیار نہیں ہے۔لاکھوں سال کے طویل عرصے میں ایک فرد بھی ایسا نہیں ہوا جو اپنے ارادے اور اختیار سے پیدا ہو گیا ہو۔پیدا ہونے والی ہر چیز پیدا ہونے والا ہر فرد ایک وقت متعینہ کے لئے اس دنیا میں آتا ہے اور جب وہ وقت پورا ہو جاتا ہے تو آدمی ایک سیکنڈ کے لئے بھی اس دنیا میں ٹھہر نہیں سکتا، مر جاتا ہے۔یہ ایسی باتیں ہیں جن کے بارے میں زیادہ سوچ بچار تفکر یا ذہنی گہرائی کی ضرورت نہیں ہے۔ہر لمحہ، ہر آن، ہر منٹ، ہر سیکنڈ یہ صورت حال واقع ہو رہی ہے۔ مختصر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مرضی سے پیدا کرتے ہیں، چاہتے ہیں تو آدمی صحت مند پیدا ہوتا ہے نہیں چاہتے تو آدمی کی نشو و نما میں ایسا سقم واقع ہو جاتا ہے کہ اس کے اعضاء صحیح ہوتے ہیں نہ اس کا دماغ صحیح ہوتا ہے۔اس کی نظر بھی صحیح کام نہیں کرتی۔ہاتھ پیروں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی چیز کو پکڑ نہیں سکتا اپنی مرضی سے چل پھر نہیں سکتا۔سائنس کتنی بھی ترقی کر لے پیدائشی اپاہج اور معذور بچوں کا علاج اس کے پاس نہیں ہے اور اس قسم کے معذور بچوں کو یہ کہہ کر رد کیا جاتا ہے کہ یہ پیدائشی مریض ہیں، یہاں بھی انسان کی بے بسی اور بے

اختیاری اظہر من الشمس ہے، سورج کی طرح عیاں ہے۔ قدرت جب بچوں کو پیدا کرتی ہے تو مختلف صورتوں میں پیدا کرتی ہے۔ قد کاٹھ مختلف ہوتا ہے، یہ نہیں دیکھا گیا کہ کوئی بنیادی طور پر کوتاہ آدمی 7 فٹ کا بن گیا ہو۔ ایسی بھی دنیا میں کوئی مثال نظر نہیں آتی کہ 7 فٹ کا آدمی گھٹ کر دو اڑھائی فٹ کا ہو گیا ہو۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ قد و قامت کے معاملے میں بھی آدمی بے اختیار ہے۔ اب مسئلہ ذہنی صلاحیت اور عقل و شعور کا آتا ہے۔ لوگوں میں جب ہم عقل و شعور کا موازنہ کرتے ہیں تو کوئی آدمی ہمیں زیادہ باصلاحیت ملتا ہے کوئی آدمی ہمیں کم صلاحیت والا ملتا ہے اور کوئی آدمی بالکل بے عقل ملتا ہے۔ سائنس خلاء میں چہل قدمی کا دعویٰ کر سکتی لیکن ایسی کوئی مثال سامنے نہیں آئی کہ بے عقل آدمی کے اندر اللہ تعالیٰ فکر و گہرائی عطا کرتے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے اندر اللہ تعالیٰ فکر اور گہرائی پیدا کر دیتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہماری اپنی چیز ہے لیکن جب وہی فکر اور شعور اور گہرائی ان سے چھین لی جاتی ہے اس وقت وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ زندگی کے تمام اجزائے ترکیبی کسی ایک طاقت کے پابند ہیں۔۔۔۔۔ وہ طاقت جس طرح چاہے چلاتی ہے اور جب چاہے ساکت کر دیتی ہے۔ مرشد کریم حضور قلندر بابا اولیاء نے ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ لوگ نادان ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہماری گرفت حالات کے اوپر ہے انسان اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق حالات میں رد و بدل کر سکتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ انسان ایک کھلونا ہے۔ حالات جس قسم کی چابی اس کھلونے میں بھر دیتے ہیں اسی طرح یہ کودتا ہے، ناچتا ہے، آوازیں نکالتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر فی الواقع حالات پر انسان کو دسترس حاصل ہوتی تو کوئی آدمی غریب نہ ہوتا۔

موت کے پنجے نے ان کی گردن مروڑ دی اور دنیا پر ان کا نام و نشان نہیں رہا۔ یہ شداد و نمرود اور فرعون کی مثالیں ایسی نہیں ہیں کہ جس کو ہم تاریخی باتیں کہہ کر گزر جائیں۔ تاریخ ہر زمانے میں خود کو دہراتی ہے۔ البتہ رنگ، روپ، نام اور شکل بدل جاتی ہے۔ ہمارے زمانے میں شہنشاہ ایران کی مثال سامنے ہے جس نے ڈھائی ہزار سال کی سالگرہ منائی، موت کے پنجے نے اس کو اس قدر بے بس اور ذلیل کر دیا کہ اس کے لئے اس کی سلطنت کی زمین بھی تنگ ہو گئی۔ وہ دیار غیر میں مر گیا اور کوئی اس کا پرسان حال نہیں۔ اگر حالات انسان کے بس میں ہیں تو اتنا بڑا بادشاہ غریب الدیار نہیں ہو سکتا۔ یہ اور اس قسم کی بے شمار باتیں ہمارے ساتھ ہر روز پیش آتی رہتی ہیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ ہم ان باتوں پر غور نہیں کرتے اور ان سب باتوں کو اتفاق کہہ کر گزار جاتے ہیں جبکہ کائنات میں اتفاق اور حادثہ کو ہرگز کوئی دخل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ایک نظام ہے جو مربوط ہے۔ ہر نظام کی دوسرے نظام کے ساتھ وابستگی ہے۔ اس نظام میں نہ کہیں اتفاق ہے، نہ کہیں حادثہ ہے، نہ کوئی قدرتی مجبوری ہے۔ اللہ کا ایک نظام ہے اور اس نظام کو چلانے والے کارندے اللہ کے حکم اور اللہ کی مشیئت کے مطابق اسے چلا رہے ہیں۔ آدمی کیا ہے؟ کٹھ پتلی ہے۔۔۔۔۔ جس طرح کائنات کا نظام چلانے والے کارکن ڈوریوں کو حرکت دیتے ہیں آدمی چلتا رہتا ہے۔ ڈوریاں ہلنا بند ہو جاتی ہیں۔ آدمی مر جاتا ہے۔ یہ باتیں اس لئے عرض کی گئی ہیں کہ میں بتانا یہ چاہتا ہوں کہ استغناء اس وقت تک کسی شخص کے اندر پیدا نہیں ہو سکتا جب تک اس

کے یقین میں یہ بات راسخ نہ ہو جائے کہ ہر چیز من جانب اللہ ہے۔ جب کسی بندے کے اندر یہ بات یقین بن جاتی ہے کہ اس نظام میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی حرکت اور بڑی سے بڑی شے اللہ کے بنائے ہوئے ایک مربوط نظام میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی حرکت اور بڑی سے بڑی شے اللہ کے بنائے ہوئے ایک مربوط نظام کے تحت قائم ہے تو اس کے اندر ایک ایسا Pattern بن جاتا ہے جس کا اصطلاحی نام استغناء ہے۔ اس Pattern کو جب تحریکات ملتی ہیں اور زندگی میں مختلف واقعات پیش آتے ہیں تو ان واقعات کی کڑیاں اس قدر مضبوط، مستحکم اور مربوط ہوتی ہیں کہ آدمی کی عقل یہ سوچنے اور ماننے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ وہی ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں۔

یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ کسی چیز کے اوپر یقین کا کامل ہو جانا اسی وقت ممکن ہے۔ جب وہ چیز یا عمل جس کے بارے میں ہم نہیں جانتے کہ یہ کس طرح واقع ہو گی بغیر کسی ارادے اور اختیار اور وسائل کے پوری ہوتی رہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں کمرے میں بیٹھا ہوا لوح و قلم کے صفحات دوبارہ لکھ رہا تھا۔ عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت تھا۔ لاہور سے کچھ مہمان آ گئے۔ عام حالات میں چونکہ تھوڑی دیر کے بعد کھانے کا وقت تھا اس لئے ذہن میں یہ بات آئی کہ ان مہمانوں کو کھانا کھلانا چاہئے۔ یہ اس دور کا واقعہ ہے جب میں حیرت کے مقام پر سفر کر رہا تھا اور نہ صرف یہ کہ کوئی کھانے پینے کا انتظام نہیں تھا لباس بھی مختصر ہو کر ایک لنگی اور ایک بنیان رہ گیا تھا۔ یہ ایک الگ داستان ہے کہ اس لباس میں گرمی سردی اور برسات کس طرح گزری جب اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں تو ہمت اور توفیق عطا کر دیتے ہیں تو بڑی سے بڑی مشکلات اور پریشانیاں پلک جھپکتے گزر جاتی ہیں۔ قصہ کوتاہ یہ کہ ذہن میں یہ بات آئی کہ پڑوس میں سے 5 روپے ادھار مانگ لئے جائیں اور ان روپوں سے خورد و نوش کا انتظام کیا جائے۔ خیال آیا کہ اگر 5 روپے دینے سے انکار کر دیا گیا تو بڑی شرمندگی ہو گی پھر خیال آیا کہ جھونپڑی والے ہوٹل سے کھانا ادھار لے لیا جائے۔ طبیعت نے اس بات کو بھی پسند نہیں کیا یہ سوچ کر خاموش ہو رہا کہ اللہ چاہے گا تو کھانے کا انتظام ہو جائے گا اور میں کمرے سے باہر آیا جیسے ہی دروازے سے قدم باہر نکالا چھت میں سے 5 روپے کا ایک نوٹ گرا۔ نوٹ اس قدر نیا تھا کہ زمین پر گرنے کی آواز آئی۔ فرش پر جب ایک نوٹ پڑا ہوا دیکھا تو نہ معلوم طریقے سے میرے اوپر دہشت طاری ہو گئی لیکن یکایک ذہن میں ایک آواز گونجی یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ وہ نوٹ اٹھا لیا گیا اور کھانے پینے کا بہ فراغت انتظام ہو گیا۔

وسائل کی فراہمی

سوال: انسان اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے اور اسی جذبے کے تحت جدوجہد کرتا ہے اور وسائل اکٹھے کرتا ہے۔ اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب: بنیادی ضروریات میں سب سے اہم ہوا، پانی، دھوپ، چاند کی چاندنی شامل ہیں اگر انسان اپنی ضروریات کا خود کفیل ہے تو اس کے پاس ایسی کونسی طاقت ہے ایسا کونسا علم ہے کہ وہ دھوپ کو حاصل کر سکے پانی کو حاصل کر سکے۔ زمین کے اندر اگر پانی کے سوتے خشک ہو جائیں تو انسان کے پاس ایسا کونسا علم ہے، طاقت ہے، عقل ہے کہ وہ زمین کے اندر پانی کی نہریں جاری کر دے۔ یہی حال ہوا کا ہے۔ ہوا اگر بند ہو جائے اللہ تعالیٰ کا نظام، وہ نظام جو ہوا کو تخلیق کرتا ہے اور ہوا کو گردش میں رکھتا ہے اس بات سے انکار کر دے کہ ہوا کو گردش نہیں تو زمین پر موجود اربوں کھربوں مخلوق ایک منٹ میں تباہ و برباد ہو جائے گی۔ یہ کیسی بے عقلی اور ستم ظریفی ہے کہ بنیادی ضروریات کا جب تذکرہ آتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ ہمارا اس پر کوئی اختیار نہیں ہے اور جب روٹی، کپڑے اور مکان کا تذکرہ آتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اگر ہم اپنا اختیار استعمال نہ کریں تو یہ چیزیں ہمیں کیسے فراہم ہوں گی؟ ان معروضات سے منشاء یہ ہرگز نہیں ہے کہ انسان یہ سمجھ کر کہ میں بے اختیار ہوں ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ رہے، اس کے اعضاء منجمد ہو جائیں۔ منشاء صرف یہ ہے کہ زندگی میں ہر عمل اور ہر حرکت کو من جانب اللہ سمجھا جائے۔ جدوجہد اور کوشش اس لئے ضروری ہے کہ اعضاء منجمد نہ ہو جائیں آدمی اپاہج نہ ہو جائے۔ آدمی جس مناسبت سے جدوجہد کرتا ہے جس مناسبت سے عملی اقدام کرتا ہے بے شک اسے وسائل بھی اسی مناسبت سے نصیب ہوتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ قانون قدرت پر اسے دسترس حاصل ہو گئی۔ قانون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے زمین آسمان اور زمین آسمان کے اندر جو کچھ ہے سب کا سب مسخر کر دیا ہے۔ مگر طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس تسخیر کو صرف اور صرف مادی حدود میں استعمال کیا جائے اور دوسرا احسن طریقہ یہ ہے کہ وسائل کو اس لئے استعمال کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ تمام وسائل انسان کے لئے پیدا کئے ہیں۔

وسائل کی تقسیم اور اللہ تعالیٰ کی رزاقیت کی تعریف میں غوث علی شاہ نے ایک واقعہ قلمبند کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک شہر میں کساد بازاری اس حد تک پہنچی کہ وہاں کے بازار ویران ہو گئے۔ جب کاروبار چلنے کی کوئی صورت سامنے نہیں آئی تو لوگوں نے اس شہر سے نقل مکانی کرنا شروع کر دی۔ اس کساد بازاری اور نقل مکانی کی وجہ سے شہر میں رہنے والے غریب مزدور نہایت پریشان اور بدحال ہونے لگے۔ ابھی اس مصیبت کا کوئی حل سامنے نہیں آیا تھا اور نہ ہی کوئی بات ایسی بن رہی تھی کہ بازار کی ویرانی ختم ہو کر

دوبارہ گہما گہمی اور ہماہمی پیدا ہو جائے۔ ایک روز دو سوداگر بازار میں وارد ہوئے اور ان دونوں نے خریداری شروع کر دی۔ حد یہ ہے کہ سوئی سے ہاتھی تک ہر چیز کے دام لگ گئے اور بازار میں چہل پہل اور رونق افزوں تر ہو گئی۔ اس خریداری کے نتیجے میں گھوڑے، خچر، بیل گاڑیاں، مزدور ہر شخص متحرک ہو گیا۔ ان دونوں سوداگروں نے اعلان کیا کہ ہم پورے ایک ہفتے تک خریداری کریں گے اور اپنی ضروریات کی فہرست کو اتنا طویل کر دیا کہ اس شہر کے سوداگروں نے رات دن کی کوشش کے بعد دوسرے شہروں سے سامان کی فراہمی کا انتظام اور بندوبست کیا۔ اس ایک ہفتے میں ایسا ماحول پیدا ہو گیا کہ یہ شہر ملک کی سب سے بڑی منڈی بن گیا۔ لوگ خوشحال ہو گئے ان کے چہروں پر تازگی آ گئی۔ جو لوگ نقل مکانی کر چکے تھے ان کو جب یہ خبر ملی تو وہ واپس آنے لگے اور جن لوگوں نے نقل مکانی کا ارادہ کر لیا تھا انہوں نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ مزدور خوشحال ہو گئے، اضطراب اور بے چینی، افلاس اور بھوک کا دور ختم ہو گیا۔ ایک ہفتے کی خریداری کے بعد مسئلہ سامان اٹھانے کا اور جہاز میں لوڈ کرنے کا پیش آیا۔ لوڈنگ ان لوڈنگ کے سلسلے میں بھی ایک مخلوق مصروف ہو گئی اور اس طرح اجڑتا ہوا شہر دوبارہ بس گیا۔ ان دونوں سوداگروں کے ساتھ بڑے میاں بھی تھے جو محنت مزدوری کے سلسلے میں ان کے ساتھ لگ گئے تھے۔ جب خریدا ہوا سارا سامان جہاز میں رکھ دیا گیا تو دونوں سوداگروں نے اس بزرگ مزدور سے کہا کہ اب ہمارا تمہارا ساتھ نہیں رہے گا۔ بوڑھے مزدور نے ان کے ساتھ چلنے پر اصرار کیا اور کہا میں تنہا ہوں میں آپ لوگوں کی خدمت کروں گا اور آپ کے ساتھ میری زندگی گزر جائے گی۔ سوداگر اور مزدور جہاز میں سوار ہو گئے اور جہاز چلتے چلتے جب سمندر بیچ پہنچا تو ان سوداگروں نے اس جہاز کو سمندر میں ڈبو دیا اور بوڑھے مزدور سے کہا کہ ہم دونوں فرشتے ہیں چونکہ ایک آباد بستی کاروبار نہ ہونے کی وجہ سے برباد ہو رہی تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے ہمارے ذریعے یہ انتظام کیا۔ تاکہ بستی دوبارہ آباد ہو جائے اور یہاں کے لوگوں کو ضرورت کے مطابق رزق ملتا رہے۔ یہ کہہ کر وہ دونوں فرشتے غائب ہو گئے اور بوڑھے مزدور کو سمندر کے کنارے پہنچا دیا۔ یہ واقعہ حضور قلندر بابا اولیاء کی خدمت میں سنا کر میں نے پوچھا کہ کیا صاحب تکوین یعنی اللہ تعالیٰ کے انتظام کو چلانے والے بندے اس قسم کے کام کرتے ہیں؟ حضور بابا صاحب نے فرمایا یہ کام ان لوگوں کے سپرد ہے جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فی الارض خلیفہ کہا ہے۔ زمین میں اللہ تعالیٰ کا نائب اور خلیفہ اللہ تعالیٰ کے کن اختیارات کو استعمال کر کے اپنے فرائض پورے کرتا ہے۔ یہ ایک الگ بات ہے جو انشاء اللہ کسی مناسب موقع پر تفصیل سے بتائی جائے گی۔ اس وقت ہمارے پیش نظر استغناء اور یقین کی تعریف ہے۔ استغناء اور یقین میں جو بنیادی باتیں ہیں وہ یہ ہیں کہ انسانی زندگی میں ایسے واقعات پے در پے صادر ہوتے ہیں جن واقعات کی وہ کوئی توجیہہ پیش نہ کر سکے اور نہ ہی ان واقعات کے صدور میں اس کی کوئی عملی جدوجہد اور کوشش شامل ہو۔ غوث علی شاہ نے جس واقعہ کا تذکرہ فرمایا ہے اس واقعہ میں بھی یہ حکمت پوشیدہ ہے کہ رزق کی فراہمی کا بندوبست درب ست اللہ کے ذمہ ہے۔ اب اللہ تعالیٰ رزق پہنچانے کا کوئی بھی طریقہ اختیار کریں۔ ہم ماں کے پیٹ میں بچے کی پرورش، بچے کی زندگی اور بچے کو مستقل طور پر غذا پہنچنے کی مثال پہلے دے چکے ہیں، غور طلب بات یہ کہ ماں کے پیٹ میں بچہ غذا حاصل کرتا ہے اور اس غذا سے مسلسل اور متواتر اعتدال کے ساتھ توازن کے ساتھ پرورش پاتا رہتا ہے یہاں یہ

بات بھی عجیب ہے کہ بچے کو غذا پہنچانے کا جو ذریعہ ہے یعنی ماں، اس ذریعے کو بھی غذا پہنچانے میں کوئی ذاتی اختیار حاصل نہیں ہے۔ایک ماں غذا کھاتی ہے۔اس غذا سے بالکل غیر اختیاری اور غیر ارادی طور پر خون بنتا ہے اور یہ خون شریانوں اور رگوں میں دوڑنے کی بجائے بچے کی غذا بنتا رہتا ہے۔ شریانوں اور رگوں کو خون کی جتنی ضرورت ہوتی ہے اس مقدار میں شریانوں اور وریدوں کو بھی خون فراہم ہوتا رہتا ہے۔ یہ سوال اپنی جگہ اہم ہے کہ ماں کے پیٹ میں بچے کی پرورش کس ارادے اور کس اختیار کے ساتھ ہو رہی ہے؟ بندے کا اس میں ذرا سا بھی عمل دخل نہیں ہے۔ بچے کی پیدائش کے بعد بچے کو غذا فراہم ہونے کا طریقہ یکسر بدل جاتا ہے۔ وہی خون جو بچے کو ماں کے پیٹ میں براہ راست منتقل ہو رہا ہے اب دوسرا اصاف شفاف طریقہ اختیار کرتا ہے اور یہی خون ماں کے سینے میں بہترین غذا دودھ بن جاتا ہے۔ یہ بات پھر اپنی جگہ اہم ہے کہ خون دودھ کیسے بنا، کس نے بنایا؟ اس میں آدمی کا کون سا اختیار کام کر رہا ہے؟ اور یہ بات کیا عجیب نہیں ہے کہ بچے کی پرورش جب مقصود نہیں ہوتی تو ماں کے سینے میں دودھ نہیں اترتا۔اس کے بعد بچہ دودھ کی منزل سے ذرا آگے بڑھتا ہے تو اسے دودھ کی مناسبت سے کچھ بھاری غذاؤں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ان بھاری غذاؤں کو چبانے اور پینے کیلئے قدرت دانت فراہم کرتی ہے۔ دنیا میں کون سا ایسا علم ہے۔ایسی کون سی سائنس، ایسا کون سا بندہ ہے جو اسے ارادے اور اختیار کے ساتھ ایسا کر سکے۔ جیسے جیسے بچے کی نشوونما بڑھتی ہے اور بچے کے جسمانی نظام کو بھاری اور قوت بخش غذاؤں کی ضرورت پیش آتی ہے اس کی آنتیں، معدہ اور دوسرے اعضاء اسی مناسبت سے کام کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ عقل و شعور کے پاس ایسا کونسا علم ہے جس علم کی بنیاد پر وہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی مشین کی نقالی کر سکے یعنی وہ آنتیں بنا دے، معدہ بنا دے، دل، پھیپھڑے تخلیق کر دے۔ چونکہ غذاؤں میں کثافت ہے اور یہ غذائیں وہ غذائیں نہیں ہیں جن غذاؤں کو اللہ تعالیٰ نے لطیف کہا ہے تو ان غذاؤں سے نکلی ہوئی کثافت کے اخراج کا بھی اہتمام ہے۔ آدمی اگر اپنے اندر خود مشین کا معائنہ کرے تو اس پر بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ انسانی زندگی میں انسانی اختیار کو اور انسانی علم کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اب مسئلہ یہ درپیش ہے کہ جب انسان کو زندگی گزارنے پر کوئی اختیار نہیں ہے تو پھر یہ جزا اور سزا کے معاملے میں اختیار کیا چیز ہے؟ سزا اور جزا کے معاملے میں اختیار یا بے اختیاری روحانیت کا ایک بہت بڑا باب ہے۔اس باب کو اگر اس وقت کھول دیا گیا تو استغناء والے باب کی پوری طرح وضاحت نہیں ہو سکے گی۔ ہم مسلسل اس باب پر بحث کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین اس وقت کامل ہوتا ہے جب آدمی کے اندر وہ قوت متحرک ہو جائے جس قوت کا نام تصوف نے شہود رکھا ہے۔

خرق عادت

سوال: خرق عادت صرف اولیاء اور انبیاء سے ہی تو ثابت ہیں' جادو گروں اور ساحروں نے بھی کئی بار خرق عادت کے مظاہرے کئے ہیں۔ان میں بنیادی فرق کی وضاحت فرمادیں؟

جواب: شہود کی تین قسمیں ہیں۔(۱) علم الیقین (۲) عین الیقین (۳) حق الیقین۔ علم الیقین کے دائرے میں داخل ہونے کے بعد انسان پر پہلی بات جو منکشف ہوتی ہے وہ یہ ہوتی ہے کہ ہمارا خالق اللہ ہے ایسا اللہ جس نے ہماری تمام ضروریات کی کفالت اپنے ذمہ لے لی ہے۔ ضروریات پورا ہونا اور مسلسل پورا ہونا اور بغیر کسی مادی قانون کے پورا ہونا آدمی کو بالآخر یہ سوچنے پر اور یقین کرنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ فی الواقع رازق اللہ ہے۔ فی الواقع رب اللہ ہے۔ فی الواقع زندگی دینے اور زندگی لینے والا اللہ ہے۔ اللہ ہی عزت دیتا ہے، اللہ ہی ذلت دیتا ہے، اللہ ہی ابتداء ہے، اللہ ہی انتہا ہے۔ اللہ ہی ظاہر اللہ ہی باطن ہے اور اللہ ہی ہر شئے کو محیط ہے۔اس منزل میں داخل ہوئے بغیر آدمی کے اندر کبھی استغناء پیدا نہیں ہوتا اور جس بندے کے اندر استغناء پیدا نہیں ہوتا وہ راہ سلوک کا بھٹکا ہوا مسافر ہوا ہے اس کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ دنیا میں ایسے بے شمار لوگ ہیں جنہوں نے اپنی باطنی قوتوں کو بیدار اور متحرک کر کے ایسے کمالات اور خرق عادات کا اظہار کیا ہے کہ لوگ حیران ہیں، پریشان ہیں۔ بعض باتیں ان سے اس قسم کی بھی سرزد ہوتی ہیں کہ بڑے بڑے صاحب علم لوگ ان کی اس روحانی قوت پر ایمان لے آتے ہیں اور راستہ بھٹک جاتے ہیں۔ میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ آدمی اپنی استطاعت اپنی صلاحیت اپنی استعداد اپنے ارادے سے خرق عادت کو پیدا کر سکتا ہے لیکن ایسے بندے کے اندر استغناء پیدا نہیں ہوتا۔ کیا آپ نے ایسے لوگ نہیں دیکھے کہ جو جادو ٹونے کا کام کرتے ہیں، لوگوں کو پریشان کرتے ہیں اور لوگوں کے بنے ہوئے کاموں کو خراب کر دیتے ہیں لیکن فیس لیتے ہیں کیا آپ نے ایسے عامل نہیں دیکھے کہ پیری کی گدی پر بیٹھے ہوئے ہیں صورت شکل فرشتوں جیسی بنائی ہوئی ہے قال اللہ اور قال رسول کا چرچا ہے لباس عین اسلام کے مطابق ہے جبے قبے میں ڈھکے ہوئے ہیں لیکن لوگوں سے پیسے وصول کر رہے ہیں۔ابھی پچھلے دنوں میرے پاس ایک خاتون تشریف لائیں۔

انہوں نے جو عامل صاحب کا نقشہ کھینچا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی بہت ہی عابد، زاہد، زندہ، شب بیدار ہے۔ مسائل اور مشکلات کا حل یہ بتایا کہ صدقہ کر دو۔ خاتون نے پوچھا کس چیز کا صدقہ کروں؟ پیر صاحب نے بتایا کہ اونٹ کا صدقہ کر دو اور 3000 روپے

لے لئے۔ میرے مرشد کریم حضور قلندر بابا اولیاءنے ایک سائل کے سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ پیر اور فقیر میں فرق ہوتا ہے۔ فقیر کی تعریف یہ ہے کہ اس کے اندر استغناء ملے گا،اس کے اندر دنیاوی لالچ نہیں ہوگا،وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ اس کا کفیل صرف اور صرف اللہ ہے۔اللہ اس کو اطلس و کمخواب پہنا دیتا ہے، وہ خوش ہو کر پہن لیتا ہے،اللہ اس کو کھدر پہنا دیتا ہے۔اس میں بھی وہ خوش رہتا ہے۔اللہ اس کو لنگوٹی پہنا دیتا ہے۔ وہ اس میں بھی خوش رہتا ہے۔اللہ اس سے لنگوٹی چھین لیتا ہے وہ اس میں بھی خوش رہتا ہے اور دوسری پہچان یہ فرمائی کہ جب تک بندہ فی الواقع کسی فقیر کی صحبت میں رہتا ہے اس کا ذہن صرف اللہ کی طرف متوجہ رہتا ہے شاذ و نادر ہی اسے دنیا کے کام کا خیال آتا ہے۔

خرق عادات کے ضمن میں آج کل سائنسی نقطہ نظر سے جو کوششیں کی جارہی ہیں ان سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انسان اپنی ذاتی کوششوں سے اور متعینہ مشقوں سے اپنے اندر ماورائی صلاحیتوں کو بیدار کرلیتا ہے۔ٹیلی پیتھی اور ہپناٹزم کے سلسلے میں یورپ اور بالخصوص روس میں جو پیش رفت ہوئی ہے اس کو دیکھتے ہوئے انسان اس بات کو یقین کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اگر ہم عبادات و ریاضت کو ماورائی علوم کے حصول کا ذریعہ سمجھیں تو یہ بات بظاہر کمزور نظر آتی ہے کیونکہ روس جس کا مذہب پر کوئی عقیدہ نہیں ہے،ماورائی علوم کے حصول میں قابل تذکرہ حد تک ترقی کرچکا ہے۔تصوف میں ایک تذکرہ آتا ہے تصرف کرنا یعنی شیخ اپنے مرید پر توجہ کرکے اس کے اندر کچھ تبدیلیاں پیدا کرتا ہے۔یہ تصرف آج کی دنیا میں ایک سائنس دان بھی کرلیتا ہے اور وہ ٹیلی پیتھی کے ذریعے اپنے حسب منشاء دوسرے آدمی کو متاثر کرکے اس کو وہ کام کرنے پر مجبور کردیتا ہے جو اس کے ذہن میں ہوتا ہے۔ تصوف میں دوسری بڑی اور اہم چیز اندر دیکھنا ہے یعنی آدمی کے اندر ایسی باطنی نظر کام کرنے لگتی ہے جس نظر سے وہ اس سیارے سے باہر کی دنیا کا مشاہدہ کرتا ہے۔آج کے دور میں یہ بات بھی ہمارے سامنے آچکی ہے کہ مراقبہ بھی ایک سائنس بن چکا ہے۔ یورپ میں لاکھوں کی تعداد میں ایسی کتابیں شائع ہوچکی ہیں جو مراقبہ اور مراقبے کی کیفیات پر سیر حاصل بحث کرتی ہیں۔تیسری چیز جو روحانیت، تصوف اور مذہب میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کے اندر ایسی صلاحیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جن صلاحیتوں کی بنیاد پر وہ ایسے علوم کا اظہار کرتا ہے جو علوم بظاہر کتابوں میں نہیں ملتے۔سائنس نے اس سلسلے میں بھی کافی پیش رفت کی ہے اور ایسے علوم کا اظہار ہو چکا ہے کہ جن پر شعور انسانی نے یقین بھی نہیں کیا اور بالآخر وہ چیزیں وجود میں آئیں اور انسان ان پر یقین کرنے پر مجبور ہو گیا۔ان حالات میں تصوف کی اصطلاحیں توجہ تصرف باطنی نگاہ کا کھلنا Time and Space یا زمان و مکاں سے آزادی ایک معمہ بن گئی ہے۔اب تک یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ ماورائی نظر کا متحرک ہونا صرف ذکر و فکر اور اشغال سے ممکن ہے۔ان حالات میں یہ سمجھنا بہت ضروری ہو گیا ہے کہ جب ایسے لوگ جو مذہب پر عقیدہ نہیں رکھتے تصرف کر سکتے ہیں۔

ان کے اندر باطنی نگاہ بیدار ہو سکتی ہے وہ نئے نئے علوم کی داغ بیل ڈال سکتے ہیں پھر یہ تصوف کیا ہے؟ تصوف کے ساتھ ساتھ مذہب کا تذکرہ بھی آتا ہے۔ مذہب کی بنیادیں بھی انہی اصولوں پر رکھی گئی ہیں کہ آدمی مذہبی فرائض پورے کرنے کے بعد اس

قابل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی زندگی یا دوسروں کی زندگی میں تصرف کر سکے۔ اس کی باطنی نگاہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا مشاہدہ کرنے لگے لیکن جب ہم مذہب کے پیروکاروں کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہزاروں لاکھوں میں ہمیں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملتا جس کی تصرف کی طاقت بحال ہو گئی ہو اور جس کے اندر باطنی نگاہ کام کرتی ہو۔ یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے کہ مذہبی لوگ ان علوم سے بے خبر ہیں جن علوم کی نشان دہی ایسے لوگوں نے کی ہے جو مذہب پر عقیدہ نہیں رکھتے یا مذہب کو ایک مجبوری سمجھتے ہیں۔ ان حالات میں ہر سنجیدہ آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہے تو پھر تصوف اور مذہب کیا ہے؟ اس بات کو ہم یہاں مختصر کر کے پھر اپنے اصل موضوع استغناء کی طرف لوٹتے ہیں۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے تذکرہ میں وضاحت کے ساتھ فرعون اور جادوگروں کا تذکرہ کیا ہے۔ فرعون نے جب یہ دیکھا کہ اس کی خدائی پر حرف آ رہا ہے اور حضرت موسیٰ اس کی تباہی اور بربادی کا ذریعہ بن رہے ہیں تو اس نے اپنی مملکت کے تمام جادوگروں کو دعوت دی کہ وہ آئیں اور حضرت موسیٰ سے مقابلہ کریں۔ اس دعوت میں جادوگروں کے لئے جو متوجہ کرنے کی سب سے بڑی چیز تھی وہ یہ تھی کہ اگر تم نے موسیٰ کو شکست دے دی تو تمہیں انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا جائے گا۔

ایک میدان اور تاریخ مقرر ہوئی۔ جادوگر جمع ہو گئے۔ موسیٰ بھی تشریف لائے۔ جادوگروں نے لاٹھیاں، بانس اور رسیاں میدان میں پھینکیں وہ سانپ بن گئے، اژدھے بن گئے۔ لگتا تھا کہ میدان بڑے بڑے سانپوں اور اژدھوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہر طرف چیخ و پکار اور سانپوں کی پھنکار تھی۔ صورت حال جب بہت نازک ہو گئی اتنی نازک کہ حضرت موسیٰ بھی گھبرا گئے۔ حضرت موسیٰ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اے موسیٰ ڈر مت! اپنا عصا پھینک۔ موسیٰ نے اپنا عصا زمین پر پھینک دیا۔ وہ عصا ایک بہت بڑا اژدھا بن کر میدان میں دوڑتے ہوئے تمام سانپوں اور اژدھوں کو نگل گیا اور اس طرح فرعون جس کو اپنی دنیاوی دولت اور مال و اسباب پر گھمنڈ تھا، ذلیل و خوار ہوا اور وہ جادوگر جو دولت اور انعام و اکرام کے لالچ میں دور دراز سے حضرت موسیٰ کو شکست دینے آئے تھے وہ بھی نامراد لوٹ گئے۔ اس واقعہ میں اگر تفکر کیا جائے تو بہت سادہ بات یہ ہے کہ جادوگروں نے جب بانس پھینکے تو ان سے خرق عادت کا ظہور ہوا اور وہ سانپ بن گئے۔ حضرت موسیٰ نے جب عصا پھینکا وہ بھی اژدھا بن گی اور تمام سانپوں کو نگل گیا۔ ابھی ہم نے عرض کیا ہے کہ آدمی اپنی کوششوں اور متعین طریقوں پر مشقیں کرنے کے بعد اس قابل بن جاتا ہے کہ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے خرق عادت کا اظہار کر سکے جیسا کہ جادوگروں نے اپنے ارادے اور اختیار سے خرق عادت کو ظاہر کیا کہ ایک مخلوق نے اس کا مشاہدہ کیا لیکن اس میں ایک بنیادی فرق ہے۔ جادوگر لاتعداد ہیں بانس اور رسیاں جو اژدھے اور سانپ بنے وہ بے شمار ہیں۔ جادوگروں کو ایک بہت بڑے بادشاہ کا تعاون بھی حاصل ہے۔ حضرت موسیٰ تنہا ہیں ان کا تکیہ، ان کا بھروسہ اللہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس بات کو اس طرح سمجھا جائے کہ جادوگروں کے دلوں میں چونکہ مال و دولت کی خواہش موجود ہے اس لئے ان میں استغناء نہیں تھا۔ حضرت موسیٰ کے اندر چونکہ استغناء تھا اس لئے استغناء کی قوت اور یقین نے

جادو گروں کے تمام جادو کو برباد اور ختم کر دیا۔ یہی صورت حال تصوف میں توجہ، تصرف اور باطنی نگاہ کی بھی ہے۔ اگر کسی بندے میں اللہ تعالیٰ کی ذات سے تعلق خاطر پیدا نہیں ہوا اور اس کے اندر استغناء کی قوتیں نہیں ابھریں تو اس سے جو کچھ خرق عادت صادر ہو گی وہ استدراج ہے، جادو ہے۔ مذہبی عبادت کا بھی یہی قانون ہے۔ مذہب نے جو عبادتیں فرض کر دی ہیں ان فرائض کی ادائیگی میں اگر بندے کا ذہن اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستہ ہے تو یہ عبادت ہے ورنہ یہ عبادت نہیں ہے؟ کلمہ، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ یہ سب ارکان اس بنیاد پر قائم ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس طرح چاہتے ہیں اس لئے ہم پر لازم ہے کہ ان فرائض کی ادائیگی میں ہم کوئی کوتاہی نہ کریں لیکن اگر فرض کی ادائیگی میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ یقین قائم نہ ہو تو یہ فرض کی ادائیگی ہو گی اور بندہ بالآخر نقصان اور خسارے میں ہو گا۔

زندگی میں دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ عید کا چاند دیکھنے کے بعد بچوں کی عیدی کے سلسلے میں فکر لاحق ہوئی اور میں اپنے ایک دوست کے پاس کچھ روپے ادھار لینے کے لئے چلا گیا۔ دوست نے مجھ سے کہا۔ یہ روپے تو میرے پاس موجود ہیں لیکن کسی کی امانت ہیں۔ طبیعت نے اس بات کو گوارہ نہ کیا کہ دوست کو امانت میں خیانت کرنے کا مجرم قرار دیا جائے۔ وہاں سے چلتا ہوا میں بازار میں آگیا۔

ہاں مجھے ایک دوست ملے۔ بہت اچھی طرح پیش آئے اور انہوں نے پیش کش کی کہ آپ کو عید کے سلسلے میں کچھ روپے پیسے کی ضرورت ہو تو لے لیں میرے پاس کافی رقم موجود ہے۔ نہ معلوم طریقے پر میں نے ان کی اس پیشکش کو نامنظور کر دیا۔ انہوں نے کہا، صاحب میں نے آپ سے کسی زمانے میں کچھ روپے ادھار لئے تھے وہ میں ادا کرنا چاہتا ہوں اور انہوں نے میری جیب میں ساٹھ روپے ڈال دیئے۔ میں گھر چلا آیا اور ان ساٹھ روپوں سے عید کی تمام ضروریات پوری ہو گئیں۔ اس واقعہ پر بہت زیادہ غور طلب بات یہ ہے کہ دوست سے میں 30 روپے ادھار لینے گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنے پیسے دلوا دیئے جو میری ضروریات کے لئے پورے تھے۔ ظاہر ہے کہ اگر 30 روپے قرض مل جاتے تو ضرورت پوری نہ ہوتی یہ پیسے اور روپے کے سلسلے میں دو واقعات میں نے گوش گزار کئے ہیں اس قسم کے بے شمار واقعات زندگی میں پیش آئے۔ ان بے شمار واقعات پیش آنے کے نتیجہ میں یہ یقین مستحکم اور پختہ ہو گیا اور ضروریات کے واحد کفیل اللہ تعالیٰ ہیں، اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ ہم رازق ہیں وہ بہر حال رزق پہنچاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے وہ کارندے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فی الارض خلیفہ کہا ہے اس بات پر کاربند ہیں کہ وہ مخلوق کو زندہ رکھنے کے لئے وسائل فراہم کریں۔ بہت عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مرضی سے پیدا کرتے ہیں۔ جب تک وہ چاہتے ہیں آدمی زندہ رہتا ہے اور جب وہ نہیں چاہتے تو آدمی سیکنڈ کے ہزارویں حصہ میں بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن آدمی یہ سمجھ رہا ہے کہ میں اپنے اختیار سے زندہ ہوں۔ معاشی سلسلہ میرے اپنے اختیار سے قائم ہے۔ اسی سلسلے میں ایک مرتبہ حضور قلندر بابا اولیاء نے فرمایا، کسان جب کھیتی کاٹتا ہے تو جھاڑو سے ایک ایک دانہ سمیٹ لیتا ہے اور جو دانے خراب ہوتے ہیں یا گھن کھائے ہوئے ہوتے ہیں ان کو بھی اکٹھا کر کے جانوروں کے آگے ڈال دیتا ہے جس زمین پر گیہوں بالیوں سے علیحدہ کر کے صاف کیا جاتا ہے وہاں اگر آپ تلاش

کریں تو مشکل سے چند دانے نظر آئیں گے۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق پرندے اربوں اور کھربوں کی تعداد میں دانہ چگتے ہیں ان کی غذا ہی دانہ ہے تو یہ معمہ حل نہیں ہوتا کہ کسان تو ایک دانہ نہیں چھوڑتا ان پرندوں کے لئے کوئی مخصوص کاشت نہیں ہوتی پھر یہ پرندے کہاں سے کھاتے ہیں؟ حضور قبلہ نے فرمایا کہ قانون یہ ہے کہ پرندوں کا غول جب زمین پر اس ارادے سے اترتا ہے کہ ہمیں یہاں دانہ چگنا ہے۔اس سے پہلے کہ ان کے پنجے زمین پر لگیں قدرت وہاں دانہ پیدا کر دیتی ہے۔اگر پرندوں کی غذا کا دارو مدار حضرت انسان یعنی کسان پر ہوتا تو سارے پرندے بھوک سے مر جاتے۔دوسری مثال حضور بابا صاحب نے یہ ارشاد فرمائی کہ چوپائے بہر حال انسانوں سے بہت بڑی تعداد میں زمین پر موجود ہیں۔بظاہر وہ زمین پر اگی ہوئی گھاس کھاتے ہیں درختوں کے پتے چرتے ہیں۔ لیکن جس مقدار میں گھاس اور درختوں کے پتے کھاتے ہیں۔زمین پر کوئی درخت نہیں رہنا چاہئے۔ قدرت ان کی غذا کی کفایت پوری کرنے کے لئے اتنی بھاری تعداد میں درخت اور گھاس پیدا کرتی ہے کہ چرندے سیر ہو کر کھاتے رہتے ہیں۔گھاس اور پتوں میں کمی واقع نہیں ہوتی۔یہ ان درختوں اور گھاس کا تذکرہ ہے جس میں انسان کا کوئی تصرف نہیں ہے قدرت اپنی مرضی سے پیدا کرتی ہے،اپنی مرضی سے درختوں کی پرورش کرتی ہے اور اپنی مرضی سے انہیں سر سبز و شاداب رکھتی ہے۔یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں جو زمین پر پھیلی ہوئی ہیں۔ہر انسان کی زندگی میں دو چار واقعات ایسے ضرور پیش آتے ہیں جن کی وہ کوئی علمی، عقلی، سائنسی توجیہہ پیش نہیں کر سکتا۔انہونی باتیں ہوتی رہتی ہیں آدمی اتفاق کہہ کر گزر تا رہتا ہے۔حالانکہ کائنات میں کسی اتفاق کسی حادثہ کو کوئی دخل نہیں ہے۔

صلاحیتوں کاذخیرہ

سوال: استغنا کیا ہے؟ عام طور پر خواہشات سے دست کشی کو استغناء کہا جاتا ہے۔ روحانیت کی روشنی میں اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب: سائنس کی موجودہ جتنی بھی ترقی اب تک سامنے آچکی ہے جب ہم اس کے افادی پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے پردے میں اس ترقی کا ماحصل دنیاوی لالچ ہے۔ جتنی بھی سائنس نے ترقی کی۔ اس ترقی سے نوع انسان مستفیض ہوئی لیکن جن لوگوں نے یہ ایجادات کیں ان کے پیش نظر مالی اور دنیاوی منفعت رہی۔ ہم طرز فکر کے بارے میں بہت واضح طور پر یہ بیان کر چکے ہیں کہ دنیا میں جو کچھ موجود ہے اس کا تعلق براہ راست طرز فکر سے ہے۔ ایک طرز فکر وہ ہے جس کا تعلق براہ راست اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے اور ایک طرز فکر وہ ہے جس طرز فکر کا رابطہ اللہ تعالیٰ سے قائم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرز فکر کا مشاہدہ ہر آن اور ہر گھڑی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود بھی قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے۔

''ہماری نشانیوں پر غور کرو، تفکر کرو اور عاقل، بالغ، باشعور، سمجھ دار اور فہیم لوگ وہ ہیں جو ہماری نشانیوں پر غور کرتے ہیں۔'' اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں ظاہر، حواس سے دیکھی جانے والی نشانیاں جن سے ہم ہر وقت مستفیض ہوتے رہتے ہیں وہ ہوا، پانی، دھوپ اور رنگ ہیں۔ زمین کے نشوونما اور نئی نئی چیزیں تخلیق کرنے کی صلاحیت ہے' اللہ تعالیٰ نے اس کی کوکھ سے ایسی ایسی چیزیں پیدا کیں جن چیزوں پر نہ صرف یہ کہ نوع انسانی بلکہ زمین کے اوپر جتنی بھی مخلوق موجود ہے اس کی زندگی کا دارومدار ہے۔ ہوا ایک ایسی نشانی ہے کہ جس سے زمین پر رہنے والا ایک متنفس بھی محروم نہیں ہے۔ پانی ایک ایسی نشانی ہے جو انسان کی زندگی کو فیڈ Feed نہ کرے تو زندگی ختم ہو جائے گی۔ نہ صرف یہ کہ انسانی زندگی ختم ہو جائے گی۔ پورا سیارہ زندگی سے محروم ہو جائے گا۔ یہی حال دھوپ کا ہے۔ یہی حال چاندنی کا ہے۔ یہی حال درختوں کے سرسبز و شاداب ہونے کا ہے اور یہی حال رنگ برنگے پھولوں کا ہے۔ یہ ساری چیزیں براہ راست اللہ تعالیٰ کی تخلیق کردہ ہیں۔ ان تخلیقات پر جب تفکر کیا جاتا ہے تو بجز اس کے کوئی بات سامنے نہیں آتی کہ ان تمام تخلیقات سے اللہ تعالیٰ کا منشاء اور مقصد یہ ہے کہ نوع انسانی کو فائدہ پہنچے ایسا فائدہ کہ جس فائدہ کے پیچھے کوئی غرض، کوئی صلہ، کوئی مقصد، کوئی لین دین اور کوئی کاروبار نہیں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ تمام چیزیں اس لئے پیدا کی ہیں کہ بندے اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی عبادت کریں تو پھر ہم یہ کیسے تسلیم کریں گے کہ جو لوگ اللہ کی ذات و

صفات کا انکار کرتے ہیں اور بر ملا کفر کی زندگی بسر کر رہے ہیں، ہوا ان کو بھی زندگی دے رہی ہے، پانی سے وہ بھی سیراب ہو رہے ہیں۔ دھوپ میں جو حیاتین اور توانائی موجود ہے ان سے بھی انہیں فائدہ پہنچ رہا ہے۔ نوع انسانی سے ہٹ کر سانپ، بچھو، کنکھجورے اور بے شمار حشرات الارض بھی اللہ تعالیٰ کے اس مفت انعام سے مالا مال ہیں۔ اس مختصر سی تمہید سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرز فکر یہ ہے کہ وہ جب انعام فرماتے ہیں تو مخلوق کو بلا تخصیص اس سے فائدہ پہنچتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو مخلوق کی طرف سے کسی صلہ یا ستائش کی غرض نہیں ہوتی۔ بس یہ ان کی شان کریمی ہے کہ انہوں نے مخلوق کو پیدا کیا اور اس مخلوق کو زندہ رکھنے کے لئے اتنے وسائل فراہم کر دیئے کہ فی الواقع مخلوق اس کا شمار بھی نہیں کر سکتی۔ اللہ تعالیٰ وسائل بے حد و حساب عطا فرماتے ہیں۔ اس کے برعکس جب ہم سائنسی ترقیات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں سائنس کی ہر ترقی میں ذاتی منفعت اور دنیاوی لالچ ملتا ہے۔ یہ وہ طرز فکر ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرز فکر کے متضاد ہے۔ ظاہر ہے جو چیز اللہ تعالیٰ کی طرز فکر کے مطابق نہیں ہے وہ اللہ تعالیٰ کے لئے پسندیدہ نہیں ہے۔ جتنا قرب اللہ تعالیٰ سے بندے کو ہوتا ہے اسی مناسبت سے بندے میں اللہ تعالیٰ کی طرز فکر منتقل ہوتی رہتی ہے اور اس سے ایسے اعمال سرزد ہوتے رہتے ہیں جن سے مخلوق کو فائدہ پہنچتا ہے لیکن اس بندے کا اپنا ذاتی فائدہ کچھ نہیں ہوتا۔ تمام اولیاء کرام کی زندگی اس بات کی شاہد ہے کہ انہوں نے نوع انسانی کی جو بھی خدمت کی اس خدمت کے پیچھے ان کا اپنا کوئی ذاتی فائدہ نہیں تھا اور اگر کسی بندے کا ذاتی فائدہ ہے تو وہ ہرگز اولیاء اللہ کی صف کا بندہ نہیں ہے۔ کوئی آدمی اپنی کوشش اپنی ریاضت سے اپنے اندر روحانی صلاحیتوں کو بیدار کر کے یقیناً خرق عادات کا اظہار کر سکتا ہے لیکن اگر اس کی طرز فکر اللہ تعالیٰ کی طرز فکر سے ہم آہنگ نہیں ہے تو یہ تصوف نہیں ہے۔ ایک سائنس ہے ایسی سائنس جو لا مذہب لوگ بھی اختیار کر سکتے ہیں اور جیسا کہ اس زمانے میں ہو رہا ہے۔ یورپ میں جو روحانیت کے اوپر ریسرچ ہو رہی ہے یا روحانی نقطہ نظر سے بقول ان کے جو ترقیاں ہمارے سامنے آ رہی ہیں ان ترقیوں میں ایک ہی بات لگتی ہے۔ وہ یہ کہ اس ترقی سے ہم نوع انسانی کو کس طرح تباہ کر سکتے ہیں۔ اس ترقی سے ہم اپنا اقتدار کس طرح مضبوط کر سکتے ہیں۔ اس ترقی سے ہم دوسرے لوگوں کو شکست خوردہ قوم کس طرح بنا سکتے ہیں یعنی آدمی اپنے خول کے اندر بند ایسی ایجادات کو جن ایجادات کا فائدہ براہ راست اللہ کی مخلوق کو نہیں پہنچتا اور اگر کسی تخلیق یا ایجاد کا فائدہ پہنچتا بھی ہے تو وہ بھی بہ امر مجبوری پہنچتا ہے۔ اب تک کے حالات شاہد ہیں کہ جن لوگوں نے سائنسی ترقی حاصل کی ہے اور جو قومیں دنیا میں سب سے آگے ہیں وہاں ایک ہی کشمکش ملتی ہے کہ ہم کس طرح دوسروں کو نیست و نابود کر کے غالب آ جائیں۔ یہ اس وقت ہے جب کوئی ترقی براہ راست ترقی نہیں ہے۔ جو بھی ترقی اب تک ہوئی ہے یا آئندہ ہو گی یا ہو چکی ہے اس کے مصالحہ پر غور کیا جائے تو اس مصالحہ کی تخلیق کوئی نہیں۔ بجلی اللہ تعالیٰ کی ایک تخلیق ہے بجلی کو دریافت کرنے کا سہرا بے شک آدمی کے سر پر بندھا ہوا ہے لیکن یہ کہ بجلی اس نے پیدا کر دی ہے، یہ بات صحیح نہیں ہے۔ بجلی اللہ تعالیٰ کا ایک انعام ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ زمین کے سوتے خشک کر دیں یا پہاڑوں سے آبشاریں گرنا بند ہو جائیں، بادل برسنا چھوڑ دیں، سارے سمندر خشکی بن جائیں اس وقت بجلی کہاں سے پیدا ہو گی۔ بجلی پیدا ہونا تو ایک جملہ مفروضہ ہے،

زندگی ہی ختم ہو جائے گی۔انبیاء کرام کی تعلیمات پر روحانی نقطہ نظر سے اور قلبی مشاہدے کے ساتھ غور کیا جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ انبیاء کی ساری تعلیمات کا نچوڑ یہ ہے کہ بندے کی زندگی کو اللہ تعالیٰ کی طرف موڑ دیا جائے یعنی اگر بندہ انفرادی طور پر زندہ رہتا ہے تو اس لئے زندہ نہ رہے کہ اس کو اس کی مرضی کے بغیر اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ وہ زندہ رہے اگر اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر صلاحیتوں کا ذخیرہ جمع کر دیا ہے تو جب اللہ تعالیٰ اسے توفیق دیں اور وہ ان صلاحیتوں کا استعمال کرے تو اس کے ذہن میں یہ بات رہے کہ میری صلاحیتوں کا اظہار اس لئے ہو رہا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو فائدہ پہنچے۔یہ کہنا کہ استغناء کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنی خواہشات کو ختم کر دے، ہر گز صحیح نہیں ہے۔یہ سراسر کوتاہ عقلی کی دلیل ہے اس لئے کہ زندگی بجائے خود خواہشات کا نام ہے۔زندگی سے خواہشات کو نکال دیا جائے تو زندگی روشنیوں میں تحلیل ہو جائے گی کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔کیا پانی پینا، بھوک لگنا، سونے اور جاگنے کا تقاضہ، بچوں کی خواہش پیدا ہونا، بچوں کی تربیت کرنا، اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکنے کا تقاضا پیدا ہونا خواہشات نہیں ہیں۔یہ سب خواہشات ہیں؟ مراد یہ ہے کہ تمام خواہشات پوری کی جائیں لیکن خواہشات کو پورا کرنے میں انسان کا ذہن یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ چونکہ یہ چاہتے ہیں لہٰذا ہم یہ کر رہے ہیں۔استغناء سے مراد یہ بھی نہیں ہے کہ آدمی ساری زندگی روزے رکھتا رہے۔استغناء سے مراد یہ بھی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ وسائل عطا فرمائیں اور آدمی سوکھی روٹی کھاتا رہے۔ استغناء سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ کرے اللہ کے لئے کرے۔اللہ تعالیٰ اطلس و کمخواب کے کپڑے پہناتا ہے تو وہ کپڑے اس لئے پہنے کہ اللہ تعالیٰ نے پہنائے ہیں، اللہ تعالیٰ اگر ٹاٹ کے کپڑے پہنائے تو آدمی اس سے بھی اتنا ہی خوش رہے جتنا وہ اطلس و کمخواب کے کپڑے پہن کر خوش ہوتا۔آدمی کو اللہ تعالیٰ مرغی کھلائے تو وہ مرغی کھائے۔لیکن اگر حالات کے تقاضے کے تحت آدمی کو چٹنی سے روٹی ملے یا ایک وقت روٹی ملے تو اس میں بھی اتنا ہی خوش رہے جتنا وہ مرغی کھا کر خوش ہوا تھا اور یہ صورت حال اس وقت پیدا ہوتی ہے جب آدمی کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو جائے کہ ہماری زندگی کی ہر حرکت پر عمل ہماری گفتار کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا ایک انعام ہے۔اللہ تعالیٰ نے ہمیں بولنے کی صلاحیت دی ہم بولتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ہمیں سننے کی صلاحیت عطا کی ہم سنتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ہمیں سوچنے سمجھنے اور تفکر کرنے کی صلاحیت دی ہے ہم سوچتے ہیں، تفکر کرتے ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں اس لئے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ایسا کیا جائے۔

اسی قسم اور اسی قبیل کے لوگوں کے لئے ارشاد خداوندی ہے "والراسخون فی العلم" اور وہ لوگ جو راسخ فی العلم ہیں کہتے ہیں کہ یہ بات یقین اور مشاہدے میں ہے کہ ہر بات ہر چیز من جانب اللہ ہے۔اس آیت کے مفہوم پر غور کیا جائے تو سوچنے اور سمجھنے کے کئی رخ متعین ہوتے ہیں۔تفصیل میں جانے کی بجائے ہم دو رخوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔"وہ لوگ علمی اعتبار سے مستحکم ذہن رکھتے ہیں یعنی ایسا ذہن جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ایسا ذہن جو شیطانی وسوسوں سے پاک ہے،

یسا ذہن جس کے اندر کثافت اور علمی آلودگیاں نہیں ہیں۔ علمی کثافت اور علمی آلودگی سے مراد یہ ہے کہ اس علم سے بندوں کو تکلیف پہنچے۔ جس کو عرف عام میں تخریب کا علم کہا جاتا ہے اور وہ لوگ جو علمی اعتبار سے ایسی مسند پر قیام فرما ہیں جس پر شکوک و شبہات کی چھاپ نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا یقین اور ایمان ہے کہ ہر چیز اس کی دنیا میں کوئی بھی حیثیت رکھتی ہو، چھوٹی ہو، بڑی ہو، راحت ہو، تکلیف ہو، ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے۔ اس آیت مبارکہ میں مختصر دو رخوں کا ذکر اس طرح ہے کہ کچھ لوگ ہیں جو راسخ العلم ہیں اور ان لوگوں کا کہنا یہ ہے یا ان لوگوں کی پہچان یہ ہے یا ان لوگوں کی طرز فکر یہ ہے کہ یہ بات ان کے مشاہدے میں ہوتی ہے کہ کائنات میں جو کچھ موجود ہے، جو کچھ ہو چکا ہے، ہو رہا ہے یا آئندہ ہونے والا ہے، اس کا براہ راست تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ کے ذہن میں ہے اسی طرح اس چیز کا یا اس عمل کا مظاہرہ ہو رہا ہے یا فلسفیانہ طرز فکر کو نظر انداز کرتے ہوئے عام سطح پر ہم اس بات کو چند مثالوں میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

طرز فکر کے بارے میں یہ بات واضح طور پر سامنے آچکی ہے کہ زندگی کا ہر عمل اپنی ایک حیثیت رکھتا ہے، اس حیثیت میں معانی پہنانا دراصل طرز فکر میں تبدیلی ہے۔ ہمارا یہ ایمان ہے کہ ہر چیز جس کا وجود اس دنیا میں ہے یا آئندہ ہوگا۔ وہ لوح محفوظ پر لکھی ہوئی ہے۔ یعنی دنیا میں کوئی چیز اس وقت تک موجود نہیں ہو سکتی جب تک کہ پہلے سے لوح محفوظ پر موجود نہ ہو۔ کوئی آدمی اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ وہ پیدا ہونے سے پہلے لوح محفوظ پر موجود ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز سے اس لئے گزرتا ہے کہ زندگی کے نشیب و فراز دن اور ماہ و سال کے وقفے لوح محفوظ پر موجود ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان وقفوں میں ٹائم کی حیثیت کیا ہے؟ ایک آدمی جب عاقل بالغ اور باشعور ہوتا ہے تو اس کو زندگی گزارنے کے لئے وسائل کی ضرورت پیش آتی ہے اور وسائل کو حاصل کرنے کیلئے روپیہ پیسہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ بات کچھ اس طرح ہے کہ ایک آدمی کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ روپے متعین کئے اور وہ ایک لاکھ روپے لوح محفوظ پر لکھے گئے۔ جس طرح ایک لاکھ روپیہ کسی بینک میں جمع کر دیا جاتا ہے اسی طرح ایک لاکھ روپیہ پہلے سے لوح محفوظ پر جمع ہے۔ وسائل کو استعمال کرنے کے لئے آدمی کوشش اور جدوجہد کرتا ہے۔ جیسے جیسے کوشش اور جدوجہد کے مراحل طے کرتا ہے اس کو روپیہ ملتا رہتا ہے اور ضروریات پوری ہوتی رہتی ہیں لیکن یہ بات اپنی جگہ اٹل ہے کہ اگر لوح محفوظ پر اس کے حصہ کا زر مبادلہ متعین نہ ہو تو اسے اس دنیا میں کچھ نہیں مل سکتا۔ ایک طرز فکر یہ ہے کہ آدمی باوجود اس کے کہ ضمیر ملامت کرتا ہے اپنی روزی کو حرام طریقے سے حاصل کرتا ہے۔ دوسرا آدمی اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ روزی حلال ہو۔ رزق حلال سے میں بھی وہ دو روٹی کھاتا ہے اور رزق حرام سے بھی وہ شکم سیری کرتا ہے لیکن یہ بات اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ اس دنیا میں اسے جو کچھ مل رہا ہے وہ لوح محفوظ سے مل رہا ہے اور لوح محفوظ میں وسائل اس کے لئے پہلے سے متعین ہیں۔ ایک آدمی محنت مزدوری کر کے ضمیر کی روشنی میں روپیہ حاصل کرتا ہے۔ دوسرا آدمی ضمیر کی پرواہ نہ کرتے ہوئے روپیہ حاصل کرتا ہے۔ دونوں صورتوں میں اسے اتنا ہی روپیہ مل رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے اس کے لئے جمع کر دیا ہے اس لئے کہ جب تک لوح محفوظ پر

کوئی چیز نقش نہیں ہوتی دنیا میں اس کا مظاہرہ نہیں ہوتا۔ یہ بڑی عجیب بات ہے اور انتہائی درجہ نادانی اور بے وقوفی ہے کہ آدمی اپنی ہی چیز کو حرام کر دیتا ہے اور اپنی ہی چیز کو حلال کر دیتا ہے۔ قانون یہ ہے کہ جو چیز لوح محفوظ پر نقش ہو گئی اس کا مظاہرہ لازم بن جاتا ہے۔ راسخ فی العلم لوگ اس بات کا مشاہدہ کر لیتے ہیں کہ ہر مظہر کا تعلق، ہر عمل کا تعلق، ہر حرکت کا تعلق لوح محفوظ سے ہے۔

اس لئے وہ برملا اس کا اعلان کرتے ہیں کہ ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے اور اس اعلان کے ساتھ ساتھ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اللہ نے ہمارے لئے جو کچھ متعین کر لیا وہ ضرور ملے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی نظروں کے سامنے یہ بات بھی آ جاتی ہے کہ ہمارے لئے لوح محفوظ پر اتنا سرمایہ یا اتنے وسائل مخصوص کر دیئے گئے ہیں بالکل اس طرح جیسے کسی آدمی کو یہ معلوم ہو کہ بینک میں میرے نام سے ایک کروڑ روپیہ جمع ہے۔ چونکہ مظاہراتی طور پر یہ بات اس کے یقین میں ہے کہ میرے نام سے ایک کروڑ روپیہ جمع ہے وہ اس بات سے مطمئن رہتا ہے راسخ فی العلم لوگ چونکہ لوح محفوظ کے نقوش کا مشاہدہ کر لیتے ہیں۔ اس لئے وہ کسی تکلیف کو یا کسی آرام کو عارضی تکلیف یا عارضی کمی سمجھتے ہیں اور اس مشاہدے کے بعد ان کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو جاتی ہے کہ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں مخصوص کر دی ہیں وہ ہمیں ہر حال میں میسر آئیں گی اور یہ یقین ان میں استغناء کی طاقت پیدا کر دیتا ہے۔ مرشد کریم حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے مجھ سے فرمایا کہ استغناء بغیر یقین کے پیدا نہیں ہوتا اور یقین بغیر مشاہدے کے تکمیل نہیں پاتا اور جس آدمی میں استغناء نہیں ہے اس آدمی کا تعلق اللہ تعالیٰ سے کم اور مادیت سے زیادہ رہتا ہے۔ تصوف اور روحانیت دراصل ایسے اسباق کی دستاویز ہے جن اسباق میں یہ بات وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ سکون کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر استغناء ہو۔ استغناء کے لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ پر توکل ہو۔ توکل کو مستحکم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر ایمان ہو اور ایمان کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر وہ نظر کام کرتی ہو جو نظر غیب میں دیکھتی ہے۔ بصورت دیگر کسی بندے کو کبھی سکون میسر نہیں آ سکتا۔ آج کی دنیا میں عجیب صورت حال ہے کہ ہر آدمی دنیا کے پیچھے بھاگ رہا ہے، ہر آدمی دولت کے انبار اپنے گرد جمع کرنا چاہتا ہے اور یہ شکایت کرتا ہے کہ سکون نہیں ہے، سکون نہیں ہے۔ سکون ہرگز کوئی عارضی چیز نہیں ہے۔ سکون ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جو یقینی ہے اور جس کے اوپر کبھی موت واقع نہیں ہوتی۔ ایسی چیزوں سے جو چیزیں عارضی ہیں، فانی ہیں اور جن پر ہماری ظاہرہ آنکھوں کے سامنے بھی موت وارد ہوتی رہتی ہے ان سے ہرگز سکون حاصل نہیں ہو سکتا۔

مراقبہ اس سلسلے میں ایک ایسی کوشش ہے جس کوشش پر یہ طرزیں متعین ہیں کہ آدمی فانی اور مادی چیزوں سے اپنے ذہن کو ہٹا کر حقیقی اور لافانی چیزوں میں تفکر کرے۔ یہ تفکر جب قدم قدم چلا کر غیب کی دنیا میں کسی بندے کو پہنچاتا ہے تو سب سے پہلے اس کے اندر یقین پیدا ہوتا ہے۔ جیسے ہی یقین کی کرن دماغ میں پھوٹتی ہے وہ نظر کام کرنے لگتی ہے جو نظر غیب کا مشاہدہ کرتی ہے۔ غیب میں مشاہدے کے بعد کسی بندے پر جب یہ راز منکشف ہو جاتا ہے کہ ساری کائنات کی باگ ڈور ایک واحد ہستی کے ہاتھ میں

ہے تو اس کا تمام تر ذہنی رجحان اس ذات پر مرکوز ہو جاتا ہے۔ اور اس مرکزیت کے بعد استغناء کا درخت آدمی کے اندر شاخ در شاخ پھیلتا رہتا ہے۔

راسخ العلم

سوال: راسخ العلم کسے کہتے ہیں۔ آدمی علم میں کس طرح راسخ ہو سکتا ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب: وہ لوگ جو علمی اعتبار سے مستحکم ذہن رکھتے ہیں یعنی ایسا ذہن جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے، ایسا ذہن جو شیطانی وسوسوں سے پاک ہے، ایسا ذہن جس کے اندر کثافت اور علمی آلودگیاں نہیں ہیں۔ علمی کثافت اور علمی آلودگی سے مراد یہ ہے کہ اس علم سے بندوں کو تکلیف پہنچے۔ جس کو عرف عام میں تخریب کا علم کہا جاتا ہے اور وہ لوگ جو علمی اعتبار سے ایسی مسند پر قیام فرما ہیں۔ جس پر شکوک و شبہات کی چھاپ نہیں ہے وہ کہتے ہیں کہ ہمارا یقین اور ایمان ہے کہ ہر چیز جس کی دنیا میں خواہ کوئی بھی حیثیت ہو، چھوٹی ہو، بڑی ہو، راحت ہو، تکلیف ہو ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے۔ اس آیت مبارکہ میں مختصراً دو روحوں کا تذکرہ اس طرح ہے کہ کچھ لوگ ہیں جو راسخ فی العلم ہیں اور ان لوگوں کا کہنا یہ ہے یا ان لوگوں کی پہچان یہ ہے یا ان لوگوں کی طرز فکر یہ ہے کہ یہ بات ان کے مشاہدے میں ہوتی ہے کہ کائنات میں جو کچھ موجود ہے، جو ہو چکا ہے، ہو رہا ہے یا آئندہ ہونے والا ہے اس کا براہ راست تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ کے ذہن میں ہے اسی طرح اس چیز کا اس عمل کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ فلسفیانہ طرز فکر کو نظر انداز کرتے ہوئے عامیانہ سطح پر ہم اس بات کو چند مثالوں میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

طرز فکر کے بارے میں یہ بات واضح طور پر سامنے آچکی ہے کہ زندگی کا ہر عمل اپنی ایک حیثیت رکھتا ہے۔ اس حیثیت میں معانی پہنانا در اصل طرز فکر میں تبدیلی ہے۔ ہمارا یہ ایمان ہے کہ ہر چیز جس کا وجود اس دنیا میں ہے یا آئندہ ہو گا وہ لوح محفوظ پر لکھی ہوئی ہے یعنی دنیا میں کوئی چیز اس وقت تک موجود نہیں ہو سکتی جب تک کہ پہلے سے لوح محفوظ پر موجود نہ ہو۔ کوئی آدمی اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ وہ پیدا ہونے سے پہلے لوح محفوظ پر موجود ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز سے اس لئے گزرتا ہے کہ زندگی کے نشیب و فراز دن اور ماہ و سال کے وقفے لوح محفوظ پر موجود ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان وقفوں میں ٹائم کی حیثیت کیا ہے؟ ایک آدمی جب عاقل بالغ اور باشعور ہوتا ہے تو اس کی زندگی گزارنے کے لئے وسائل کی ضرورت پیش آتی ہے اور وسائل کو حاصل کرنے کے لئے روپیہ پیسہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ بات کچھ اس طرح ہے کہ ایک آدمی کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ روپے متعین کئے اور وہ ایک لاکھ روپے لوح محفوظ پر لکھے گئے۔ جس طرح ایک لاکھ روپیہ کسی بینک میں جمع کر دیا جاتا ہے اسی طرح ایک لاکھ روپیہ پہلے

سے لوح محفوظ پر جمع ہے۔ وسائل کو استعمال کرنے کے لئے آدمی کوشش اور جدوجہد کرتا ہے جیسے جیسے کوشش اور جدوجہد کامیابی کے مراحل طے کرتی ہے۔ اس کو روپیہ ملتا رہتا ہے اور ضروریات پوری ہوتی رہتی ہیں لیکن یہ بات اپنی جگہ اٹل ہے کہ اگر لوح محفوظ پر اس کے حصہ کا زرمبادلہ متعین نہ ہو تو اسے اس دنیا میں کچھ نہیں مل سکتا۔ ایک طرز فکر یہ ہے کہ آدمی باوجود اس کے کہ ضمیر ملامت کرتا ہے اپنی روزی کو حرام طریقے سے حاصل کرتا ہے۔ دوسرا آدمی اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ روزی حلال ہو۔ رزق حلال میں بھی وہ دو روٹی کھاتا ہے اور رزق حرام سے بھی وہ شکم سیری کرتا ہے لیکن یہ بات اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ اس دنیا میں اسے جو کچھ مل رہا ہے وہ لوح محفوظ سے مل رہا ہے اور لوح محفوظ میں وسائل اس کے لئے پہلے سے متعین ہیں۔ ایک آدمی محنت مزدوری کر کے، ضمیر کی روشنی میں روپیہ حاصل کرتا ہے۔۔۔۔۔ دوسرا آدمی ضمیر کی ملامت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے روپیہ حاصل کرتا ہے۔ دونوں صورتوں میں اسے اتنا ہی روپیہ مل رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے اس کے لئے جمع کر دیا ہے۔ اس لئے کہ جب تک لوح محفوظ پر کوئی چیز نقش نہیں ہوتی دنیا میں اس کا مظاہرہ نہیں ہوتا۔ یہ بڑی عجیب بات ہے اور انتہائی درجہ نادانی اور بے وقوفی ہے کہ آدمی اپنی ہی چیز کو حرام کر دیتا ہے۔ قانون یہ ہے کہ جو چیز لوح محفوظ پر نقش ہو گئی اس کا مظاہرہ لازم بن جاتا ہے۔۔۔۔۔ راسخ العلم لوگ اس بات کا مشاہدہ کر لیتے ہیں کہ مظہر کا تعلق، ہر وجود کا تعلق، ہر عمل کا تعلق، ہر حرکت کا تعلق لوح محفوظ سے ہے۔ اس لئے وہ برملا اس کا اعلان کرتے ہیں کہ ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے اور اس اعلان کے ساتھ ساتھ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اللہ نے ہمارے لئے جو کچھ متعین کر دیا ہے وہ ضرور ملے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی نظروں کے سامنے یہ بات بھی آجاتی ہے کہ ہمارے لئے لوح محفوظ پر اتنا سرمایہ یا اتنے وسائل مخصوص کر دیئے گئے ہیں بالکل اس طرح جیسے کسی آدمی کو یہ معلوم ہو کہ بینک میں میرے نام ایک کروڑ روپیہ جمع ہے چونکہ مظاہراتی طور پر یہ بات اس کے یقین میں ہے کہ میرے نام سے ایک کروڑ روپیہ جمع ہے وہ اس بات سے مطمئن رہتا ہے۔ راسخ فی العلم لوگ چونکہ لوح محفوظ کے نقوش کا مشاہدہ کر لیتے ہیں اس لئے وہ کسی تکلیف کو یا کسی بے آرامی کو عارضی تکلیف یا عارضی کمی سمجھتے ہیں اور اس مشاہدے کے بعد ان کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو جاتی ہے کہ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں مخصوص کر دی ہیں وہ ہمیں ہر حال میں میسر آئیں گی اور یہ یقین ان کے اندر استغناء پیدا کر دیتا ہے۔ استغناء بغیر یقین کے پیدا نہیں ہوتا اور یقین بغیر مشاہدے کے تکمیل نہیں پاتا اور جس آدمی کے اندر استغناء نہیں ہے اس آدمی کا تعلق اللہ تعالیٰ سے کم اور مادیت سے زیادہ رہتا ہے۔ تصوف یا روحانیت دراصل ایسے اسباق کی دستاویز ہے جن اسباق میں یہ بات وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ سکون کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر استغناء ہو۔ استغناء کے لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اوپر توکل ہو۔ توکل کو مستحکم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر ایمان ہو اور ایمان کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر وہ نظر کام کرتی ہو جو نظر غیب میں دیکھتی ہے بصورت دیگر کسی بندے کو کبھی سکون میسر نہیں آ سکتا۔ آج کی دنیا میں عجیب صورتحال ہے کہ ہر آدمی دنیا کے پیچھے بھاگ رہا ہے، ہر آدمی دولت کے انبار اپنے گرد جمع کرنا چاہتا ہے اور یہ شکایت کرتا ہے کہ سکون نہیں ہے، سکون نہیں ہے۔ سکون ہرگز کوئی عارضی چیز نہیں ہے۔ سکون ایک ایسی کیفیت کا نام

ہے جو یقینی ہے اور جس کے اوپر کبھی موت وارد نہیں ہوتی۔ایسی چیزوں سے جو چیزیں عارضی ہیں، فانی ہیں اور جن کے اوپر ہماری ظاہرہ آنکھوں کے سامنے بھی موت وارد ہوتی رہتی ہے ان سے ہر گز سکون حاصل نہیں ہو سکتا۔ مراقبہ اس سلسلے میں ایک ایسی کوشش ہے جس کوشش کے اوپر یہ طرزیں متعین ہیں کہ آدمی فانی اور مادی چیزوں سے اپنے ذہن کو ہٹا کر حقیقی اور لافانی چیزوں میں تفکر کرے۔ یہ تفکر جب قدم قدم چلا کر غیب کی دنیا میں کسی بندے کو پہنچاتا ہے تو سب سے پہلے اس کے اندر یقین پیدا ہوتا ہے۔ جیسے ہی یقین کی کرن دماغ میں پھوٹتی ہے وہ نظر کام کرنے لگتی ہے۔ جو نظر غیب کا مشاہدہ کرتی ہے غیب میں مشاہدے کے بعد کسی بندے پر جب یہ راز منکشف ہو جاتا ہے کہ ساری کائنات کی باگ دوڑ ایک واحد ہستی کے ہاتھ میں ہے تو اس کا تمام تر ذہنی رجحان اس ذات پر مرکوز ہو جاتا ہے اور اس مرکزیت کے بعد استغناء کا درخت آدمی کے اندر شاخ در شاخ پھیلتا رہتا ہے۔

باب ہفتم

حصول یا منتقلی

سوال: روحانیت کو ایک مخصوص طرزِ فکر کا حصول یا منتقلی کہہ کر بیان کیا گیا ہے، طرزِ فکر کی یہ منتقلی کیوں کر اور کس قانون کے تحت عمل میں آتی ہے؟ اس کو بیان فرمادیں۔

جواب: اللہ تعالیٰ کے قانون کے تحت یہ بات ہمارے سامنے ہے کہ ہر نوع میں بچے اس مخصوص نوع کے نقش و نگار پر پیدا ہوتے ہیں۔ ایک بلی آپ سے کتنی ہی مانوس ہو لیکن اس کی نسل بلی ہی ہوتی ہے۔ کسی نے یہ نہیں دیکھا کہ بکری سے گائے پیدا ہوتی ہو یا گائے سے کبوتر پیدا ہوتا ہو۔ کہنا یہ ہے کہ شکمِ مادر میں ایک طرف نوعی تصورات بچے کو منتقل ہوتے ہیں اور دوسری طرف ماں کے یا باپ کے تصورات بچے کو منتقل ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان تصورات میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق مقداریں متعین ہیں۔

تیسویں پارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ ”پاک اور بلند مرتبہ ہے وہ ذات جس نے تخلیق کیا۔ اور مقداروں کے ساتھ ہدایت بخشی۔“ یہ مقداریں ہی کسی نوع کو الگ کرتی ہیں اور نوعوں میں افراد کو الگ کرتی ہیں۔

اس نقطہ نظر سے جب ہم سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کے بارے میں غور کرتے ہیں تو یہ بات واضح طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں یعنی حاصل کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابراہیمؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک تمام انبیائے کرام کی معین مقداریں منتقل ہوئیں۔ یعنی تمام انبیاء کا وہ ذہن جس میں اللہ بستا ہے، حضور ﷺ کو بطور ورثے کے منتقل ہوا۔ اس بات کو اس طرح بھی کہا جاسکتا ہے کہ سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذہن مبارک بعثت سے پہلے ہی تمام انبیاءؑ کی منازل طے کر چکا تھا اور جب اللہ تعالیٰ نے اپنا کرم فرمایا تو حضور ﷺ کو وہ مقام عطا ہوا جو کسی کو حاصل نہیں ہوا۔ دوسری بات یہ بہت زیادہ غور طلب ہے کہ قرآن پاک میں جتنے انبیاءؑ کا تذکرہ ہے وہ تقریباً سب حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہیں۔ یعنی ایک نسل کی طرزِ فکر برابر منتقل ہوتی رہی۔

چونکہ نبوت ختم ہو چکی ہے اور اللہ تعالیٰ کا قانون جاری و ساری ہے قرآن پاک کے ارشاد کے مطابق اللہ کی سنت میں نہ تعطل ہوتا ہے نہ تبدیلی ہوا قع ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس سنت کو جاری و ساری رکھنے کا پروگرام حضور ﷺ نے اپنے ورثاء کو منتقل کیا۔ جو

اللہ کے دوست ہیں اور جن کو عرف عام میں اولیاء اللہ کہا جاتا ہے۔ شیخ یا مراد حضور ﷺ کی ایسی طرز فکر کا وارث ہوتا ہے۔ جب کوئی بندہ یا مرید اپنے شیخ کی طرز فکر حاصل کرنا چاہے تو اس کے لئے سب سے پہلے ضروری یہ ہے کہ وہ شیخ کی نسبت حاصل کرے۔ شیخ کی نسبت حاصل کرنے میں پہلا سبق ''تصور شیخ'' ہے۔

جب مرید یا سالک آنکھیں بند کر کے ہر طرف سے ذہن ہٹا کر اپنے شیخ کا تصور کرتا ہے تو اس کے اندر شیخ کی طرز فکر منتقل ہوتی ہے۔ طرز فکر دراصل روشنیوں کا وہ ذخیرہ ہے جو حواس بناتی ہیں۔ شعور بناتی ہیں، زندگی کی ایک نہج بناتی ہیں۔ جب ہم اپنے ارادے کے تحت شیخ کا تصور کریں گے تو تصور میں گہرائی پیدا ہونے کے بعد شیخ کے اندر کام کرنے والی وہ روشنیاں جو اسے سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے منتقل ہوئی ہیں، ہمارے اندر منتقل ہو جائیں گی۔

ایسے بے شمار واقعات ہیں کہ جب کوئی مرید اپنے شیخ کے تصور میں گم ہو گیا تو اس کی چال ڈھال، گفتگو اور شکل و صورت میں ایسی نمایاں شباہت پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ پہچاننا مشکل نہیں رہتا کہ یہ اپنے شیخ کا عکس ہے۔ چونکہ شیخ کا تصور شیخ کے اندر کام کرنے والی طرز فکر کی منتقلی کا باعث بنتا ہے اس لئے اس تصور کی گہرائی کے ساتھ ساتھ حضور ﷺ کی طرز فکر بھی منتقل ہوتی رہتی ہے اس لئے کہ شیخ حضور ﷺ کی طرز فکر کا عکس ہے۔

ترقی اور تنزل

سوال: آج دنیا میں مسلمان من حیث القوم رسوائی اور ذلت سے دوچار ہیں۔ کیا اس صورت حال سے نکلنے کی کوئی صورت ہے؟ اگر ہے تو کیا ہے؟

جواب: ساری زندگی ہم نے یہ سنا کہ قرآن پاک میں غیر المغضوب علیہم والا الضالین کا مطلب یہودی ہیں۔ ہمارے اسلاف نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ یہودی کبھی بر سر اقتدار نہیں آئیں گے۔ مگر آج کی حالت عبرت ناک ہے۔ ایک طرف 30 لاکھ یہودی ہیں اور دوسری طرف 90 کروڑ مسلمان ہیں۔ بات وہی رہی کہ جو قومیں اپنی حالت نہیں بدلنا چاہتیں اللہ تعالیٰ ان کی حالت میں تبدیلی پیدا نہیں کرتے۔ ہم نے من حیث القوم اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین سے نظر ہٹالی ہے اور اپنے آپ کو صرف عذاب و ثواب کے چکر میں محدود کر لیا ہے۔ تخلیقی فارمولوں سے ہم بالکل بے بہرہ ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں ارشاد فرماتے ہیں کہ ''ہم نے زمین، آسمان اور اس کے اندر جو کچھ ہے سب کا سب تمہارے تابع فرمان کر دیا ہے۔ تمہارے لئے سورج کو مسخر کر دیا ہے، تمہارے لئے چاند کو مسخر کر دیا ہے، تمہارے لئے ستاروں کو مسخر کر دیا ہے اور ہم ہیں کہ ہم نے اس تسخیری عمل کو کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔'' قرآن ہمارا ہے اور پاک واشگاف الفاظ میں کہتا ہے کہ لوہے میں انسانوں کے لئے بے شمار فائدے محفوظ ہیں۔

ظاہر ہے قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ یہ فائدے جو اللہ تعالیٰ نے لوہے کے اندر محفوظ کر دیئے ہیں۔ انہیں تلاش کرو اور جب تم ان فائدوں کو تلاش کر لوگے تو ان سے اللہ کی مخلوق کو فائدہ پہنچے گا اور اللہ کی مخلوق میں تمہاری عزت و توقیر ہو گی۔ اللہ کا قانون اپنی جگہ برحق ہے۔ جن لوگوں نے لوہے کی صلاحیتوں کو تلاش کیا وہ لوگ قومی اعتبار سے عزت دار ہو گئے اور ہم نے قرآن پاک کی تعلیمات کو نظر انداز کیا، ہم ذلیل و خوار ہو گئے۔ کلمہ، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اپنی جگہ اہم ہیں، فرض ہیں، ضروری ہیں۔ اس لئے کہ ان ارکان کی ادائیگی سے روح کو تقویت ملتی ہے، روحانی صلاحیتیں متحرک اور بیدار ہوتی ہیں لیکن یہاں معاملہ بالکل الٹا ہے اور برعکس ہے کہ یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ روح کی صلاحیتیں من حیث القوم یا انفرادی طور پر ہمارے اندر موجود بھی ہیں یا نہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارے اندر تفکر موجود نہیں ہے ہم عمل تو کرتے ہیں، عمل کی حقیقت کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ جب کوئی بندہ جس کو اللہ تعالیٰ نے علم الیقین کی دولت سے نوازا ہے۔ قرآن پاک میں تفکر کرتا ہے تو اس کے سامنے قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ آجاتی

ہے اور وہ اس بات کا مشاہدہ کر لیتا ہے کہ قوموں کا عروج و زوال اس بات پر منحصر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی فرمائی ہوئی باتوں پر جن قوموں نے تفکر کیا وہ سرفراز ہوئیں اور جن قوموں نے تفکر کو نظرانداز کر دیا ہے وہ قومیں غلام بن گئیں۔ بڑی ستم ظریفی ہے کہ ہم جب یہ دیکھتے ہیں کہ موجودہ سائنس کی ترقی میں وہ تمام فارمولے کام کر رہے ہیں جو ہمارے اسلام نے چھوڑے ہیں اور جو فی الواقع ہمارا ورثہ ہیں لیکن چونکہ ہم نے اس ورثہ کو کوئی اہمیت نہیں دی اس لئے دوسرے لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھالیا اور ہم ایک پسماندہ قوم بن گئے۔

ترقی اور تنزل جب زیر بحث آتے ہیں تو ذہن اس طرف بھی متوجہ ہوتا ہے کہ ترقی یا تنزل میں کون سے عوامل کارفرما ہیں۔ پچھلے اسباق میں ہم بتا چکے ہیں کہ انفرادی یا اجتماعی جدوجہد کے نتیجے میں ترقی نصیب ہوتی ہے اور انفرادی یا اجتماعی تساہل اور عیش پسندی کے نتیجے میں قوموں کو عروج کی بجائے زوال نصیب ہوتا ہے۔ ترقی کے بھی دو رخ ہیں۔ ترقی یا عزت و توقیر کی ایک حالت یہ ہے کہ کسی فرد یا کسی قوم کو دنیاوی عزت اور دنیاوی دبدبہ اور دنیاوی شان و شوکت نصیب ہے۔ لوگوں نے ترقی تو کی لیکن یہ ترقی استغناء کے خلاف ہوتی ہے۔ ترقی کا دوسرا رخ جو فی الواقع حقیقی رخ ہے اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ شہود میں رہتے ہوئے غیب کی دنیا میں جس فرد یا جس قوم کی رسائی ہوتی ہے۔ دراصل وہی اصل ترقی، عزت اور شان و شوکت ہے۔ ان دو رخوں پر اگر غور کیا جائے تو یہ بات پوری طرح ہمارے سامنے آتی ہے کہ موجودہ دور میں سائنسی ترقی کا دار و مدار صرف ظاہری ترقی پر ہے۔ بے شک وہ قومیں جنہوں نے علوم میں تفکر کیا اور جدوجہد کے نتیجے میں نئی نئی اختراعات کہیں اور دنیاوی اعتبار سے ترقی یافتہ ہیں لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہی ترقی یافتہ قومیں سکون اور اطمینان قلب سے محروم ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہی قومیں حقیقت سے بے خبر ہیں یا حقیقی دنیا کا ان سے ابھی کوئی واسطہ یا تعلق نہیں ہے۔ اس لئے کہ حقیقت میں ذہنی انتشار نہیں ہوتا۔ حقیقت کے اوپر کبھی خوف اور غم کے سائے نہیں منڈلاتے۔ حقیقی دنیا سے متعارف لوگ ہمیشہ پرسکون رہتے ہیں موجودہ دور بے شک ترقی کا دور ہے لیکن اس ترقی کے ساتھ ساتھ جس قدر صعوبتیں، پریشانیاں اور ذہنی انتشار سے نوع انسانی دوچار ہوئی ہے وہ اس سے پہلے کے دور میں نہیں ملتی۔ وجہ صرف یہ ہے کہ اس ترقی کے پیچھے ذاتی منفعت ہے وہ انفرادی ہو یا قومی ہو۔ اگر یہ ترقی فی الواقع نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے ہوتی تو قوموں کو اطمینان و سکون نصیب ہوتا۔ انفرادی یا اجتماعی ذہن کے طرز فکر میں اگر یہ بات ہوتی کہ ہماری کوشش، جدوجہد اور اختراعات سے نوع انسانی کو اور اللہ کی مخلوق کو فائدہ پہنچے تو یہ طرز فکر انبیاء کی طرز فکر ہے اور یہ طرز فکر اللہ کی طرز فکر ہے۔ یہ طرز فکر آدمی کے اندر استغناء سے پیدا ہوتی ہے۔ استغناء حاصل کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ انسان کی سوچ اور انسان کی طرز فکر اس طرز فکر سے ہم آہنگ ہو جو اللہ کی طرز فکر ہے۔ ہم جب زمین کے اوپر موجودات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بے شمار وسائل اپنی مخلوق کے لئے پیدا کئے ہیں لیکن ان وسائل میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کا تعلق براہ راست اللہ تعالیٰ کی کسی ضرورت سے ہو۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے بے نیاز ہیں باوجود یہ کہ ہر چیز سے بے نیاز ہیں اور

انہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں، وہ اپنی مخلوق کے لئے ایک قانون کے تحت تسلسل کے ساتھ وسائل فراہم کرتے رہتے ہیں۔ اگر کسی موسم میں آم کی ضرورت ہے تو ایک روئیں میں درخت پر پھول آئیں گے، آم لگیں گے اور ان آموں سے لوگوں کی ضروریات پوری ہونگی۔ چونکہ انسان وسائل کا محتاج ہے اس لئے وہ اس طرح کے وسائل سے بے نیاز نہیں ہو سکتا کہ وہ ہر طرف سے اپنا رشتہ منقطع کرے لیکن یہ طرز فکر وہ اختیار کر سکتا ہے کہ یہ وسائل جو میری جدوجہد اور کوشش سے وجود مظہر میں آئے ہیں، پوری نوع انسانی کا حصہ ہیں۔ جس طرح میں ان سے فائدہ اٹھاتا ہوں اسی طرح پوری نوع انسانی کو فائدہ اٹھانے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ طرز فکر حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان جس طرز فکر کو حاصل کرنا چاہتا ہے اس سے ذہنی قربت حاصل ہو مثلاً یہ کہ اگر آپ کسی نمازی سے دوستی کرنا چاہتے ہیں تو وہ تمام مشاغل اپنالیں جو اللہ والوں کے لئے پسندیدہ اور مرغوب ہیں۔ جس مناسبت سے ان مشاغل کو یا ان عادات کو اختیار کرتے چلے جائیں گے اسی مناسبت سے آپ کی طرز فکر بدلتی چلی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کی طرز فکر یہ ہے کہ وہ اپنی مخلوق کی خدمت کرتے ہیں اور اس خدمت کا کوئی صلہ نہیں چاہتے۔ بندہ جب اختیاری طور پر اس طرز فکر کو اختیار کر لیتا ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ کی مخلوق کے کام آئے تو اسے اللہ تعالیٰ کی طرز فکر منتقل ہو جاتی ہے اور جب یہ طرز فکر گہری ہوتی ہے تو اس کا ذہن ہر آن اور ہر لمحے اس طرف متوجہ رہتا ہے کہ میں وہ کام کر رہا ہوں جو اللہ تعالیٰ کے لئے پسندیدہ ہے۔ بار بار اس عادت یا عمل کا اعادہ ہونے سے اس کے مشاہدات میں بے شمار واقعات ایسے آتے ہیں کہ اس کے اندر یہ یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، جو کچھ ہو چکا ہے یا جو آئندہ ہونے والا ہے وہ سب اللہ کی طرف سے ہے، اسی تعلق کو استغناء کا نام دیا جاتا ہے۔ مسلمان قوم کا استغناء ورثہ ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ساری زندگی اس عمل سے عبارت ہے کہ ہر چیز کی طرف سے، ہر بات اور ہر عمل آدمی اس وقت انجام دیتا ہے جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ برائی اور بھلائی کا جہاں تک تعلق ہے کوئی عمل دنیا میں نہ برا ہے نہ اچھا ہے۔ دراصل کسی عمل میں معانی پہنانا اچھا یا برا ہے۔ معانی پہنانے سے مراد نیت ہے۔ عمل کرنے سے پہلے انسان کی نیت میں جو کچھ ہوتا ہے وہی اچھائی یا برائی کے پہلو میں ظاہر ہوتا ہے۔ انسان کو عمل پر اختیار نہیں ہے۔ انسان کو نیت کرنے پر اختیار ہے۔ آگ کا کام جلانا ہے ایک آدمی آگ کو لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے کھانا پکانے میں استعمال کرتا ہے۔ یہ عمل خیر ہے وہی آدمی اس آگ سے لوگوں کے گھر جلا ڈالتا ہے۔ یہ انتہائی درجہ برائی ہے۔ موجودہ دور کے علماء فضلا جو کچھ کرتے ہیں چونکہ ان کی نیت میں نوع انسانی کی فلاح نہیں ہے اس لئے تمام اعمال برائی ہیں۔ جن قوموں سے ہم مرعوب ہیں اور جن جن قوموں کے ہم دست نگر ہیں ان کی طرز فکر کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات دھوپ کی طرح روشن ہے کہ سائنس کی ساری ترقی کا زور اس بات پر ہے کہ ایک قوم اقتدار حاصل کر لے اور ساری نوع انسانی اس کی غلام بن جائے یا ایجادات سے اتنے مالی فوائد حاصل کئے جائیں کہ زمین پر ایک مخصوص قوم یا طبقہ ملک مالدار ہو جائے اور باقی انسان غریب اور مفلوک الحال بن جائیں کیونکہ اس ترقی میں اللہ تعالیٰ کے ذہن کے مطابق نوع انسانی کی فلاح مضمر نہیں ہے اس لئے یہ ساری ترقی نوع انسانی کے لئے اور خود ان قوموں کے لئے جنہوں نے جدوجہد اور کوشش کے بعد نئی نئی ایجادات کی ہیں۔ مصیبت اور پریشانی بن گئی ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد عالی کے مطابق وہ

لوگ جو راسخ فی العلم ہیں ان کا یقین ہے کہ ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ جب تک آدمی کے یقین میں یہ بات رہتی ہے کہ چیزوں کا موجود ہونا یا چیزوں کا عدم میں چلے جانا اللہ کی طرف سے ہے اس وقت تک ذہن کے مرکزیت قائم رہتی ہے اور جب یہ یقین غیر مستحکم ہو جاتا ہے تو آدمی ایسے عقیدے میں اور ایسے وسوسوں میں گرفتار ہو جاتا ہے جن میں ذہنی انتشار ہوتا ہے، پریشانی ہوتی ہے، غم اور خوف ہوتا ہے۔ حالانکہ اگر دیکھا جائے تو یہ بات بالکل سامنے کی ہے کہ انسان کا ہر عمل، ہر فعل، ہر حرکت، کسی ایسی ہستی کے تابع ہے جو ظاہرہ آنکھوں سے نظر نہیں آتی۔ ماں کے پیٹ میں بچے کا قیام، 9 مہینے تک نشوونما کے لئے غذا کی فراہمی اور پیدا ہونے سے پہلے ماں کے سینے میں دودھ، پیدائش کے بعد دو سال سوا دو سال تک مسلسل دودھ کی فراہمی، دودھ کا غذائیت سے ایک اعتدال کے ساتھ توازن کے ساتھ بچے کا بڑھنا۔ نہ صرف قد بڑھنا بلکہ ہر اعضاء کا اپنی مناسبت اور اعتدال سے رہنا۔ چھوٹا بچہ بڑھ کر سات فٹ کا ہو جاتا ہے جوانی کے تقاضے، ان تقاضوں کی تکمیل میں وسائل کی تکمیل، وسائل فراہم ہونے سے پہلے وسائل کی موجودگی۔ اگر اللہ تعالیٰ زمین کو منع کر دیں کہ وہ کھیتیاں نہ لگائے تو جوانی کے تقاضے میں حصول روزگار مفقود ہو جائے گا۔ آدمی کے اندر رزق حاصل کرنے کا تقاضا پیدا ہوتا ہے۔ تو اس تقاضے کی تکمیل میں پہلے سے وسائل موجود ہو جاتے ہیں۔ موجود وسائل میں انسان جدوجہد کر کے اپنے لئے آسائش اور آرام کا سامان مہیا کرتا ہے۔ اسی طرح شادی کے بعد والدین کے دل میں یہ تقاضا پیدا ہوتا ہے کہ ہمارا کوئی نام لینے والا ہو۔ اس تقاضے میں انتہائی درجہ شدت اور اس کے نتیجے میں ماں باپ بننا، ماں باپ کے دل میں محبت کا پیدا ہونا، غور طلب بات یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ والدین کے دل میں محبت نہ ڈالیں تو اولاد کی پرورش کس طرح ہو سکتی ہے اور اولاد کی پرورش کے لئے والدین کے دل میں اولاد کی محبت صرف انسانوں کے لئے مخصوص نہیں ہے ہر مخلوق میں محبت کا یہ جذبہ مشترک ہے اور اسی محبت کے سہارے ماں باپ اپنی اولاد کی پرورش کرتے ہیں، نگہداشت کرتے ہیں اور ان کے لئے وسائل اکٹھے کرتے ہیں۔

عام طور پر یہ تاثر لیا جاتا ہے کہ محنت اور جدوجہد کے بغیر وسائل کا حصول ناممکن ہے۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جن وسائل کے حصول میں ہم جدوجہد اور کوشش کرتے ہیں اور ایک قاعدے اور قانون کے تحت پہلے سے موجود ہیں۔ کسان جب محنت کر کے زمین میں بیج ڈالتا ہے اور اس بیج کی نشوونما سے انسانی ضروریات کے لئے قسم قسم کی غذائیں فراہم ہوتی ہیں۔ یہ سب اس وقت ممکن ہوتا ہے کہ جب پہلے سے وسائل موجود ہوں۔ مثلاً زمین کا موجود ہونا، زمین کے اندر بیج کو نشوونما دینے کی صلاحیت ہونا، بیج کی نشوونما کے لئے پانی کا موجود ہونا، چاندنی کا موجود ہونا، ہوا کا موجود ہونا اور موسم کے لحاظ سے سرد و گرم فضا کا موجود ہونا۔ اگر بیج موجود نہ ہو یا زمین کے اندر بیج کو نشوونما دینے کی صلاحیت مفقود ہو جائے یا پانی موجود نہ ہو تو انسانی کوشش تمام بے کار ثابت ہو گی، موجودہ دور کی ترقی میں بنیادی چیز بجلی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نظام کے تحت اگر پانی کے اندر بجلی موجود نہ ہو تو سائنس کی کوئی بھی ترقی ممکن نہیں ہو گی۔ اللہ تعالیٰ کا یہ وصف ہے کہ جب وہ کسی چیز کو تخلیق کرتے ہیں تو اس ایک تخلیق سے اربوں، کھربوں تخلیقات وجود میں آتی

ہیں۔ موجودہ دور میں بجلی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اللہ کی ایک تخلیق بجلی ہے اور اس بجلی کے ذریعے ہزارہا ایجادات منظر عام پر آ چکی ہیں، آ رہی ہیں اور آئندہ آتی رہیں گی۔ یہ صورت حال سامنے رکھتے ہوئے ہمارے اوپر یہ راز منکشف ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وسائل اس لیے تخلیق کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ایک مخصوص مخلوق ان وسائل کے اندر مخفی قوتوں کو تلاش کر کے ان سے کام لے۔

علم الاسماء

سوال: علم الاسماء کیا ہے؟ اور یہ اللہ تعالیٰ نے صرف آدمؑ ہی کو کیوں عطا فرمایا؟ اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب: وہ لوگ جن کے اندر اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ وابستگی قائم ہے اور جو زندگی کو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ منسلک سمجھتے ہیں اور ان کے اندر یہ طرز فکر راسخ ہو جاتی ہے کہ ہر کام، ہر بات، ہر عمل، ہر چیز، موت، پیدائش، وسائل، بیماری، صحت، رزق سب کچھ دردبست اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ جب یہ طرز فکر کسی بندے کے اندر پوری طرح قائم ہو جاتی ہے تو روحانیت میں ایسے بندے کا نام مستغنی ہے۔ استغناء کے بارے میں کافی حد تک نہیں تو اتنی تشریح ضرور ہو گئی ہے کہ بات آسانی کے ساتھ سمجھ میں آ جائے۔ جب کوئی بندہ مستغنی ہو جاتا ہے تو اس کے اندر ایسی طرز فکر قائم ہو جاتی ہے کہ وہ اختیاری اور غیر اختیاری طور پر زندگی میں پیش آنے والے ہر عمل کو اللہ تعالیٰ کی طرف پھیر دیتا ہے۔ زندگی میں کسی عمل سے اگر اسے راحت ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے اور اگر زندگی میں اسے کوئی تکلیف ہوتی ہے تو اس تکلیف میں بھی کوئی نہ کوئی اچھی مصلحت تلاش کر لیتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اس کے ذہن کی افتاد یہ ہو جاتی ہے کہ وہ ہر آن اور ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستہ رہتا ہے۔ اس عمل کے بعد انسان کے اوپر ایک راز منکشف ہوتا ہے اور وہ راز یہ ہے کہ وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ میں ایک ہستی کے ساتھ بندھا ہوا ہوں یا یہ کہ کوئی ہستی ہے جو میری زندگی پر محیط ہے۔ بار بار جب یہ احساس ابھرتا ہے تو یہ احساس ایک مظاہراتی شکل اختیار کر لیتا ہے اور وہ یہ دیکھنے لگتا ہے کہ روشنی کا ایک دائرہ ہے اور میں اس دائرے میں بند ہوں۔ اسی دائرے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اللہ بکل شئ محیط۔

'اللہ تعالیٰ ہر شے پر محیط ہے۔'' یہ احاطہ یا یہ دائرہ ایک نور ہے۔ اس نورانی دائرے میں بشمول انسان ساری کائنات بند ہے۔ اس بات کو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بہت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

''اللہ سماوات اور ارض کا نور ہے۔'' یعنی سماوات اور ارض کی بساط جس چیز پر قائم ہے وہ ایک نور ہے جو ہر لمحہ اور ہر آن کائنات کی ہر چیز کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستہ کئے ہوئے ہے۔ مستغنی آدمی کی نظر جب اس دائرے یا نور کے ہالے پر ٹھہرتی ہے تو اس کی نظروں کے سامنے وہ فارمولے آ جاتے ہیں جن فارمولوں سے تخلیق عمل میں آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''اللہ سماوات اور ارض کا نور ہے اور اس نور کی مثال یہ ہے کہ ایک طاق ہے اس میں چراغ ہے، چراغ ایک قندیل میں ہے اور وہ قندیل ایک چمکدار

ستارہ کی طرح ہے، چراغ زیتون سے روشن ہے جو نہ شرقی ہے اور نہ غربی، اور اگر اس کو آگ نہ چھوئے تب بھی ایسا لگتا ہے کہ ابھی بھڑک اٹھے گا۔ نور کے اوپر نور ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت بخشتے ہیں جس کو چاہیں۔"

اس آیت مبارکہ میں انسانی تخلیق کے بنیادی فارمولے کا تذکرہ ہے۔ پہلا فارمولا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذہن میں یہ بات موجود ہے کہ مجھے کائنات بنانی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو بنانے کا ارادہ کیا اور کن فرما کر تخلیق کر دیا۔ اب جو چیز کائنات کے اندر جو کچھ موجود ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس کے ذہن سے منتقل ہو کر لوح محفوظ پر آ گیا۔ لوح محفوظ پر پوری کائنات کا یکجائی پروگرام نقش ہو گیا۔ یکجائی پروگرام میں جب حرکت واقع ہوئی تو نوعی پروگرام الگ الگ ہو گیا، نوعی پروگرام میں جب حرکت واقع ہوئی تو انفرادی پروگرام الگ الگ ہو گیا۔ اس بات کو آسان زبان میں اس طرح کہا جائے گا کہ کائنات کے ایک ممتاز فرد انسان کی ابتدائی تخلیق نور سے ہوئی۔ نور نے جب تنزل کیا تو انسان کے اوپر روشنی کا ایک غلاف چڑھ گیا۔ روشنی نے جب تنزل کیا تو انسان کے اوپر بے شمار رنگوں کے پرت آ گئے۔ ہر رنگ کا ہر پرت ایک طرف رنگ ہے اور دوسری طرف روشنی ہے یہ روشنی جس بنیاد پر قائم ہے وہ نور اور نور کی بنیاد اللہ تعالیٰ ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی تخلیقی صفات بھی منتقل ہوئیں۔ بات بالکل الگ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان تخلیقی صفات کا علم کس کو کتنا دیا۔ کائنات کے کل پرزے فرشتے بھی اس تخلیق کا علم جانتے ہیں اس تخلیقی علم سے جنات بھی واقف ہیں لیکن حضرت انسان کو اس علم پر ایسی دسترس حاصل ہے جو کسی اور مخلوق کو حاصل نہیں ہے۔ اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس طرح بیان کیا ہے: "میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔" فرشتوں نے کہا کہ یہ خون خرابا کرے گا اور زمین پر فساد کا باعث ہو گا اور اگر آپ اس کو اپنی تسبیح و تقدیس کے لئے تخلیق کر رہے ہیں تو تسبیح و تقدیس تو ہم بھی کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم جو جانتے ہیں وہ تم نہیں جانتے اور پھر آدم کو علم الاسماء سکھا دیا۔ علم الاسماء سے مراد یہ ہر گز نہیں ہے کہ آدم کو یہ سکھا دیا گیا کہ یہ بلی ہے، یہ بکری ہے، یہ بھیڑ ہے، یہ درخت ہے یا انگریزی میں بھیڑ کو یہ کہتے ہیں، ہندی میں یہ کہتے ہیں۔

علم الاسماء سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ان صفات کا علم سکھا دیا جو صفات تخلیق میں عمل پیرا ہیں یا جن صفات الہیہ سے تخلیق وجود میں آئی، قائم ہے اور جب تک اللہ تعالیٰ چاہیں گے قائم رہے گی۔ یہی وہ علم تخلیق ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی امانت قرار دیا ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ اپنی امانت کا تذکرہ فرماتے ہیں وہاں ہمیں قرآن اس بات کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے کہ انسان کی طرح کائنات میں موجود دوسری مخلوق بھی باشعور ہے اور عقل رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ہم نے اپنی امانت پیش کی سماوات پر، زمین پر، پہاڑوں پر، انہوں نے عرض کیا۔ یا اللہ! ہم اتنے بڑے علم کے متحمل نہیں ہو سکتے اور اگر ہم نے اس بار کو اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا تو ہم ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور ہمارا وجود صفحہ ہستی سے مٹ جائے گا۔ انسان نے اس امانت کو اٹھا لیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ "بے شک یہ ظالم اور جاہل ہے۔"

غور طلب بات یہ ہے کہ جب آدم نے یاانسان نے اللہ تعالیٰ کی اس امانت کو اپنے کندھوں پر اٹھالیا تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ ظالم اور جاہل ہے۔ سماوات اور ارض کے بارے میں ظالم اور جاہل کا لفظ نہیں فرماتے جبکہ سماوات اور ارض کے یہ عرض کر دینے سے کہ ہم اس کے متحمل نہیں ہیں یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ زمین کے ذرے ذرے میں اور آسمان کی ہر مخلوق میں عقل و شعور موجود ہے۔ یہ بات کہ انسان بحیثیت اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کا امین اللہ تعالیٰ کی تخلیقی صفات کا عالم ہے اور پھر بھی وہ ظالم اور جاہل ہے۔ اس طرف اشارہ ہے کہ باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنا وہ علم عطا کیا جو بحیثیت خالق کے اللہ کا اپنا مخصوص علم ہے پھر بھی انسان اللہ تعالیٰ کی صفات سے دور ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ کائنات خوشگوار ماحول میں مسلسل متحرک رہے، قائم رہے اور انسان کی تمام تر کوشش اس بات پر صرف ہو جاتی ہے کہ کائنات کا قیام جتنا زیادہ مختصر ہو سکے، مختصر ہو جائے حالانکہ کہتا وہ یہ کہ جو کچھ کرتا ہوں وہ طویل زندگی کے لئے کرتا ہوں۔

یہ صورت حال ہمیں بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بعد اگر کسی تخلیق کو یہ اختیار دیا ہے کہ ذیلی تخلیق کر سکتی ہے تو وہ انسان ہے لیکن اگر کسی انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستگی نہ ہو۔ باالفاظ دیگر اس کے اندر استغناء موجود نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کی ودیعت کردہ تخلیقی صلاحیتیں پس پردہ چلی جاتی ہیں اور انسان زمین کی دوسری مخلوق سے بھی کم تر شمار ہوتا ہے اس لئے کہ دوسری تمام مخلوقات نے اس بات کا اعلان کر کے ہمارے اندر یہ بار امانت اٹھانے کی سکت نہیں ہے خود کو بری الذمہ قرار دے دیا ہے اور باوجود اس کے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے علوم کا خزانہ ہے، اللہ تعالیٰ کے تخلیق علوم کا امین ہے وہ ہر کام ایسا کرتا ہے جس سے نوع انسانی کو راحت و سکون نہ پہنچے اور نوع انسانی اضطراب اور تکلیف میں مبتلا رہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ نوع انسانی کے افراد کے اندر اللہ تعالیٰ کے اوپر توکل، بھروسہ اور استغناء نہیں ہے۔ نوع انسانی کے افراد اپنی ذاتی اغراض اپنے سامنے رکھتے ہیں۔

بحیثیت انسان جب ہم عقل و شعور سے کام لیتے ہیں تو یہ بات ہمارے اوپر پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا میں یا کائنات میں جو کچھ موجود ہے دراصل اس کی حیثیت علم کی ہے۔ اگر کسی چیز کے بارے میں ہماری عقل یا ہمارا شعور علمی طور پر باخبر ہے تو ہم اس چیز سے براہ راست یا بالواسطہ متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ علم کی دو حیثیتیں ہیں۔

ایک علم یہ ہے کہ شعور اس سے واقف ہو اور واقفیت کے ساتھ ساتھ وہ چیز وجودی اعتبار سے آنکھوں کے سامنے بھی ہو۔ دوسری حیثیت علم کی یہ ہے کہ وجودی اعتبار سے ظاہرہ آنکھ کے سامنے وہ چیز موجود نہ ہو لیکن نوع انسانی کا شعور انفرادی شعور میں منتقل ہو گیا ہو۔ ان دونوں صورتوں میں سے کوئی بھی صورت ہو انسان علم سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ یہ علم ہمیں بتاتا ہے کہ کائنات میں موجود ہر شئے اس علم کی بنیاد پر ایک دوسرے سے متعارف ہے۔ تعارف میں کہیں راحت سرور اور مسرت کے خاکے نمایاں ہوتے ہیں اور کہیں پریشانی، بے قراری اور اضمحلال موجود ہوتا ہے۔ غم اور خوشی کا جہاں تک تعلق ہے۔ اس کی بنیاد بھی علم کے اوپر ہے۔ علم جب ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اس چیز کے نہ ہونے سے ہمارا نقصان ہے تو ہمارے اوپر تکلیف کی کیفیات مرتب ہوتی ہیں۔ علم

جب ہمیں بتاتا ہے کہ یہ کام یا یہ عمل یا یہ چیز ہمارے فائدے کے لئے ہے تو اس علم کے نتیجے میں ہمارے اوپر جو کیفیات مرتب ہوتی ہیں ان کا نام ہم خوشی، مسرت، سکون، اطمینان قلب وغیرہ وغیرہ رکھتے ہیں۔

یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ آگ ایک ایسی مخلوق ہے کہ جو ہمیں راحت بھی پہنچاتی ہے اور نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔ چونکہ علم میں مثبت اور منفی دونوں رخ موجود ہیں اس لئے آگ سے ہم منفی اور مثبت دونوں قدروں میں متاثر ہوتے ہیں۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ پانی سے ہمارے اندر موجود رگوں، پٹھوں اور اعصاب کی سیرابی ہوتی ہے ساتھ ہی یہ بات بھی ہمارے علم میں موجود ہے کہ اگر پانی اعتدال سے زیادہ ہو جائے تو یہ زمین اور نوع انسانی کے لئے بربادی کا باعث بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پانی سے مثبت اور منفی پہلوؤں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ علیٰ ہذالقیاس اس قسم کی مثالیں بے شمار ہیں۔ مختصراً عرض یہ کرنا ہے کہ زندگی کے اندر کام کرنے والے تمام جذبات و احساسات میں اسی قسم کی وسعت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ علم کی حیثیت اگر منفی ہے تو دانستہ اور نادانستہ اس سے ایسے کام سرزد ہو جاتے ہیں جن کے نتیجے میں نہ صرف یہ ہے کہ وہ پریشان ہوتا ہے اس کی نوع بھی تکلیف میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ علم کی حیثیت اگر مثبت ہے تو اس سے دانستہ یا نادانستہ ایسے اعمال، ایسی حرکات کا صدور ہوتا ہے جن سے وہ خود بھی راحت محسوس کرتا ہے اور نوع انسانی بھی اس کے پر مسرت جذبات سے فائدہ حاصل کرتی ہے۔ دوسری صورت جو جذبات و احساسات کی تخلیقی حیثیت ہے وہ یہ ہے کہ انسان علم کے معانی پہناتا ہے جس قسم کے وہ علم کے اندر معانی اور مفہوم داخل کر دیتا ہے اسی قسم کے تاثرات اس کے اوپر قائم ہو جاتے ہیں اس کی چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔

ہمارا علم ہمیں بتاتا ہے کہ رزق حلال انسان کو سکون اور راحت پہنچاتا ہے۔ دوسری صورت میں ہمارا علم یہ بتاتا ہے کہ رزق حرام انسان کے سکون اور راحت کے لئے ایک بہت بڑی دیوار ہے جو انسان کو سکون کے اندر داخل نہیں ہونے دیتی لیکن جب ہم رزق اور رزق حرام کے بارے میں سوچتے ہیں تو یہی بات سامنے آتی ہے کہ رزق حرام بھی کھایا جاتا ہے اور رزق حلال بھی کھایا جاتا ہے۔

رزق حرام سے بھی آدمی آٹا خرید کر روٹی پکاتا ہے پیٹ بھرتا ہے اور رزق حلال سے بھی آدمی آٹا خرید کر روٹی پکاتا ہے پیٹ بھرتا ہے۔ کھانا کھانے کی بنیادی ضرورت ایک ہے یعنی بھوک کا تقاضا ایک علم ہے۔ جب تک علم بھوک کے اندر محدود ہے اس کی حیثیت علم کی ہے کہ بھوک کس طرح رفع کی جائے۔ یہ علم کے اندر معانی پہنانا ہے اب اگر معانی منفی پہنا دیئے گئے تو باوجود اس کے کہ بھوک کو رفع کرنے کے لئے ہی سارے کام کئے جا رہے ہیں اور آدمی اسی طرح اہتمام سے دستر خوان بچھا کر کھانا کھا رہا ہے اس روٹی سے خون بھی بن رہا ہے، اس روٹی سے انرجی بھی حاصل ہو رہی ہے، اس روٹی میں غذائیت کی وجہ سے قد و قامت بھی بڑھ رہا ہے۔ اس غذائیت اور روٹی کے اعتبار سے تجربات اور احساسات میں بھی روشنی کا پہلو نمایاں ہو رہا ہے یعنی عقل و شعور میں اضافہ ہو رہا ہے لیکن چونکہ یہ معانی پہنا دیئے گئے ہیں کہ یہ روٹی حلال ہے اور حلال نہ ہونے کے علم میں یہ معانی پہنا دیئے گئے کہ اس سے سکون درہم برہم ہو جائے گا۔ اس لئے اب جب آدمی حرام روٹی کا لقمہ کھائے گا تو اس کے اندر بے سکونی، پریشانی، بدحالی،

ذہنی کشاکش، دماغی کشمکش کا پیٹرن بنادیا جائے گا۔ جب یہ دماغ کے اندر بننے والا پیٹرن مستحکم اور مضبوط ہو جاتا ہے تو اب علم میں جب بھی معانی پہنائے جائیں گے وہ بے سکونی، بے اطمینانی اور پریشانی کے ہونگے۔ اس کے برعکس ہم علم میں مثبت پہلو داخل کرتے ہیں یعنی علم کے اندر جو معانی اور مفہوم پہناتے ہیں وہ معانی اور مفہوم سکون آشنا زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ سکون آشنا زندگی کا پیٹرن جب دماغ میں مستحکم ہو جاتا ہے تو دماغ کے اندر وہ خلیے جو علم کے اندر مفہوم اور معانی پہناتے ہیں ہمیشہ سکون اور راحت کے معانی پہنائیں گے۔ سکون اور راحت کی زندگی میں یہ تلاش کرنا ضروری ہے کہ فی الواقع سکون کیا ہے اور اضطراب کیا ہے؟ یہ بات ہم ابھی بتا چکے ہیں کہ اضطراب ہو یا سکون ہو، پریشانی ہو یا خوشحالی، غم ہو یا خوشی اس کا تعلق علم کے اندر معانی پہنانے سے ہے اب یہ تلاش کرنا ہے کہ کون سی ایسی مخلوق ہے سکون آشنا زندگی گزارتی ہے اور جس کے اوپر خوف اور غم کے سائے اگر منڈلاتے ہیں تو وہ کم سے کم ہوتے ہیں مخلوق کو تلاش کرنے میں ہمیں کہیں باہر جانا نہیں پڑتا۔ اس زمین پر ہمیں ایسی مخلوق ملتی ہے جو انسانی زندگی کے اعتبار سے زیادہ پر سکون ہے، زیادہ خوشحال ہے، زیادہ صحت مند ہے، زیادہ بے فکر ہے جبکہ اس کی تمام ضروریات وہی ہیں جو انسان کی ضروریات ہیں مثلاً کھانا کھانا اور دوسرے تمام تقاضے جو زندگی میں جب تک داخل نہ ہوں زندگی پوری نہیں ہوتی۔ یہ مخلوق درخت ہیں، پرندے ہیں، چرندے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس نوع کی زندگی میں سکون کا بڑا واسطہ اور سکون کا بڑا ذریعہ یہ ہے کہ یہ تمام مخلوق جبلت کے اندر رہتے ہوئے زندگی پوری کرتی ہے۔ یا اس بات کو اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ انسان کے علاوہ دوسری نوعیں علم کو صرف اس حد تک جانتی ہیں جس حد تک علم از خود اپنے معانی اور مفہوم ان کے دماغ پر ظاہر کرتا ہے۔ ان تمام نوعوں کے برعکس انسان کی ممتاز حیثیت یا انسان کی اسفل ترین حیثیت یہ ہے کہ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے علم میں معانی پہنا سکتا ہے اور علم میں مثبت یا منفی معانی پہنانے کا اختیار اللہ تعالیٰ نے اس کو بخش دیا ہے۔ یہی وہ صورت حال ہے جس کے بارے میں اللہ تعالی نے فرمایا ہے۔ ''ہم نے اپنی امانت سماوات، پہاڑ اور ارض پر پیش کی، سب نے انکار کر دیا اور انسان نے اپنے کاندھوں پر اٹھالیا ہے بیشک یہ ظالم اور جاہل ہے۔'' ظلم اور جہالت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت خاص سے علم کے اندر معانی پہنانے کا نہ صرف یہ کہ اختیار دیا بلکہ معانی پہنانے کی مشین اس کے اندر فٹ کر دی اور یہ بھی بتا دیا کہ علم کے اندر معانی اور مفہوم اگر مثبت ہوں گے تو آدمی پر سکون زندگی گزارے گا اور علم کے اندر معانی اگر منفی ہونگے تو آدمی ایسی زندگی گزارے گا۔ جو کتے، بلیوں، بھینس، گائے، درخت سے بھی بدتر ہوگی۔ اس وقت جو صورت حال ہے وہ ہم سب کے سامنے ہے آدمی کے اوپر جس قدر پریشانیاں، خوف، عدم تحفظ کا احساس، نئی نئی بیماریوں، نئی نئی پریشانیوں، نئی نئی تکالیف کے انبار، موت کا خوف جتنا اشرف المخلوقات کو ہے اتنا بھیڑ بکری کو بھی نہیں ہے۔ حالانکہ ضروریات زندگی میں جتنے تقاضے ضروری ہیں۔ وہ بکری بھی پوری کرتی ہے اور آدمی بھی پورے کرتا ہے یہ بات بھی ذہن نشین ہونی چاہئے کہ سکون آدمی کو وہاں ملتا ہے جہاں سکون موجود ہو۔ راحت آدمی کو وہاں ملتی ہے جہاں راحت کے وسائل موجود ہوں۔ روشنی آدمی کو وہاں ملتی ہے جہاں روشنی ہو، خوشبو آدمی کو وہاں ملتی ہے جہاں خوشبو موجود ہو۔ بدبو اور تعفن میں کوئی بندہ اگر خوشبو تلاش کرتا ہے تو یہ نادانی ہے کچھ اور نہیں۔ کائنات پر نظر ڈالئے زمین

کے طبقات کو کھنگالئے آسمان کی رفعتوں کو چھوییۓ، فرشتوں کی مجلسوں میں بیٹھئے، جنت کی مزین صورتوں اور خوبصورت باغات اور نہروں کا مشاہدہ کیجئے، دوزخ کا مشاہدہ کیجئے۔ کہیں بھی چلے جاییۓ پر سکون ہستی اگر کوئی ہے تو وہ ایک ہی ذات ہے اور وہ ذات وہ ہے جو ہر اعتبار سے قادر مطلق ہے اور وہ خالق ہے، اللہ ہے، رب ہے، معبود ہے۔ جب کوئی بندہ اللہ کے ساتھ اپنا تعلق قائم کر لیتا ہے تو اس کے دماغ میں ایک ایسا پیٹرن بن جاتا ہے کہ اس دماغ کے اندر مخلوق سے احتیاج ٹوٹ جاتی ہے اور وہ در وبست اللہ کو اپنا حاکم اپنا خالق اپنی خواہشات پوری کرنے والا۔ اپنی ضروریات زندگی پوری کرنے والا سمجھنے لگتا ہے نتیجے میں اللہ کی ذات کا سکون انسانی دماغ پر منعکس ہونے لگتا ہے اور پھر انسان سکون آشنا زندگی کے علاوہ کسی دوسری زندگی سے متاثر نہیں ہوتا۔ یہی تعریف ہے ان لوگوں کی جن کو اللہ تعالیٰ نے مستغنی کہا ہے۔

ذات مطلق

سوال: اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

جواب: رواں دواں پانی کو دیکھ کر آدمی اس لئے متاثر ہوتا ہے کہ اس کے لاشعور میں یہ بات موجود ہے کہ پانی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے ایک اہم عنصر ہے۔ خنک لطیف ہوا کے جھونکوں سے آدمی اس لئے پر کیف ہو جاتا ہے کہ وہ یہ جانتا ہے کہ لطیف اور خنک ہوا آدمی کی بنیادی ضرورت آکسیجن فراہم کرتی ہے۔ خوشنما لباس پہن کر آدمی اس لئے اپنے اندر فرحت محسوس کرتا ہے کہ اس کے ذہن میں یہ بات موجود ہے کہ خوشنما چیزیں دوسروں کو متاثر کرتی ہیں اور خوشنمائی خود انسان کے لئے ایک بہترین خوشی کا ذریعہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو دیکھ کر، اس میں حیوانات یا انسان کی کوئی تخصیص نہیں۔ آدمی کے اوپر ایک بے خودی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے یہ اس لئے ہوتا ہے کہ اس کے ذہن میں اس کا اپنا بچپن محفوظ ہے۔ باالفاظ دیگر ہم اس بات کو اس طرح کہیں گے کہ ایک بڑا بوڑھا آدمی بچے کو دیکھ کر اپنے ماضی کے بچپن میں لوٹ جاتا ہے کیونکہ بچے فطری اور جبلی طور پر خوش رہتے ہیں اس لئے جب ایک 60 سالہ، بیس سالہ یا 25 سالہ آدمی اپنے بچپن میں داخل ہوتا ہے تو اس کے اوپر وہی تاثرات غالب آ جاتے ہیں جو بچوں کی زندگی کا خاصہ ہیں۔ اس کے برعکس جب آدمی خزاں رسیدہ درخت کو دیکھتا ہے جب کہ اس کے اوپر پتے نہیں ہوتے، شگوفے نہیں ہوتے، پھل نہیں ہوتے، شادابی نہیں ہوتی تو اس درخت سے وہ ان حالات کی طرح متاثر نہیں ہوتا۔ جس طرح وہ بہار کے موسم میں درخت سے متاثر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ کوئی آدمی خود کو خزاں رسیدہ دیکھنا نہیں چاہتا۔ کوئی آدمی یہ نہیں چاہتا کہ اس کی نسل زمین پر نہ پھیلے۔ کوئی آدمی نہیں چاہتا کہ۔۔۔۔۔ اس کے گھر میں شگوفے نہ کھلیں۔ کوئی آدمی خود کو بیمار دیکھنا نہیں چاہتا جب کہ خزاں رسیدہ درخت ایک طرح سے بیماری کا خاکہ پیش کرتا ہے۔ ہم ایسے پانی کو دیکھتے ہیں جو پانی انتہائی درجہ تلخ ہے یا انتہائی درجہ گرم ہے تو ہمارے اوپر یقیناً وہ تاثرات قائم نہیں ہوتے جو شیریں، سفید اور ٹھنڈے پانی کو دیکھنے کے بعد طاری ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے یہی ہے کہ کوئی آدمی کڑوا پانی پینا نہیں چاہتا۔ کوئی آدمی انتہائی تیز گرم پانی سے غسل کرنا نہیں چاہتا اور اس سے آگے بڑھیں تو ہمارے اوپر قدرت کا ایک عجیب انکشاف ہوتا ہے وہ یہ کہ پانی ایک ایسا Matter ہے جو جس ڈائی میں ڈال دیا جاتا ہے اسی کے مطابق ڈھل جاتا ہے۔ اس بات سے ایک قانون کا انکشاف ہوا ہے وہ یہ ہے کہ ڈائیاں مختلف ہیں (Matter) ایک ہے پانی جب کیلے کے درخت کی شریانوں، رگوں اور پٹھوں سے گزر کر کیلے کی ڈائی میں جم جاتا ہے تو کیلا بن جاتا ہے اس Matter کو جب انار کی ڈائی میں ڈال دیا جاتا ہے تو انار بن جاتا ہے۔ آم کی ڈائی میں جا کر آم بن جاتا ہے۔ آدمی کے اندر فٹ

ڈائی میں جا کر جب یہ پانی جمتا ہے تو آدمی بن جاتا ہے۔ بکری، گائے، بھینس کے اندر فٹ سانچوں میں جب یہ پانی جم جاتا ہے تو اس پانی کی شکل کہیں بکری بن جاتی ہے، کہیں گائے بن جاتی ہے اور کہیں بھینس بن جاتی ہے۔ قدرت کی کتنی بڑی صناعی ہے کہ Matterایک ڈائیاں کھرب ہا کھرب ہیں۔ ساتھ ساتھ ڈائی کے اندر شکل و صورت کی موجودگی میں رنگ بھی تبدیل ہوتے ہیں کہیں ایک رنگ ہوتا ہے۔ کہیں دس رنگ ہوتے ہیں، کہیں مکمل رنگ ہوتے ہیں حالانکہ درخت جڑوں کو جو پانی سیراب کرتا ہے اس کا رنگ ایک ہے۔ انار کے درخت میں جو پانی ڈالا جاتا ہے وہ سفید ہے لیکن جب ہم انار کو کھولتے ہیں تو ہمیں وہاں اللہ تعالیٰ کی عجیب صفت نظر آتی ہے ایسی خوبصورتی سے دانے جڑے ہوتے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ وہ رنگین ہوتے ہیں، کالے ہوتے ہیں، سفید ہوتے ہیں، زرد ہوتے ہیں۔ یہاں سے ایک نئے قانون کا انکشاف ہوتا ہے وہ یہ کہ ڈائی کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے یہ علم ودیعت کیا ہے کہ اس ڈائی نے سفید پانی کو کیا معنی پہنانے ہیں، کیا رنگ دینا ہے، کیا ذائقہ دینا ہے۔ مطلب بالکل صاف اور واضح ہے کہ جس طرح ایک آدمی شعور رکھتا ہے انار کو بھی اللہ تعالیٰ نے یہ شعور دیا ہے کہ اس کے اندر دوڑنے والے پانی کو اسے کیا رنگ دینا ہے، کیا ذائقہ دینا ہے، کیا شکل دینی ہے۔ بات پھر وہیں اسی آیت پر آتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ہم نے اپنی امانت سماوات پہاڑوں اور زمین پر پیش کی۔ ان سب نے انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سماوات زمین اور پہاڑ بھی عقل و شعور رکھتے ہیں۔ عقل و شعور کا یہ عالم ہے کہ وہ اس بات کو سمجھ گئے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اوپر جو ذمہ داری ڈالنا چاہتے ہیں ہم اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

وہ اللہ تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں ہمارے اندر اتنی استطاعت اور سکت نہیں ہے۔ ہم نے اگر آپ کے ارشاد کے مطابق اس امانت کو اپنے اوپر اٹھا بھی لیا تو ہم ریزہ ریزہ ہو جائیں گے ہمارا وجود ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ یہ بات کہنا کہ ہم اس علم کے متحمل نہیں ہیں اور اگر ہم نے علم کو اٹھا لیا تو ہم نیست و نابود ہو جائیں گے۔ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ سماوات ارض اور جبال کو پورا پورا شعور حاصل ہے۔ ارض دراصل ایک طرح ماں کا پیٹ ہے جس طرح کوئی بچہ شکم مادر سے پیدا ہو کر شعور حاصل کرتا ہے شعور اس وقت حاصل کرتا ہے جب اس کے اندر شعور بنانے کی مشین یا شعور بنانے کا پیٹرن موجود ہو۔ اسی طرح جب زمین کی کوکھ سے کوئی درخت تولد ہوتا ہے اس کے اندر بھی شعور ہوتا ہے اور یہ کہاں سے آیا؟ کس نے بنایا، کس طرح وجود میں آیا؟ یہ سب باتیں ہمارے سامنے ہیں جس نے زمین بنائی، جس نے پانی بنایا۔ جس نے ڈائی بنائی، جس نے ڈائی کو یہ شعور بخشا ہے کہ مجھے اس تصویر کے اندر جو میرے اندر پرورش پا رہی ہے کیا شکل و صورت دینی ہے، کیا رنگ دینا ہے۔ اسی ذات مطلق نے شعور عطا کیا۔ اب اگر ہم اس ذات مطلق سے متعارف ہونا چاہتے ہیں تو ہمیں اس بات پر یقین کرنا پڑے گا کہ ایک ہی ذات مطلق ہے جس نے ہمیں اور ساری کائنات کو سنبھالا ہوا ہے اور اسی ذات مطلق کے ذہن کی عکاسی نئی نئی شکل و صورت میں نمودار ہو رہی ہے اب جب ہم اس یقین پر پہنچ جاتے ہیں کہ ذات مطلق ایک ہے۔ تو ہمارے اندر از خود یہ جستجو پیدا ہو جاتی ہے کہ اس ذات یا ہستی کو دیکھنا چاہئے، اس ذات مطلق

کو خود سے قریب کرنا چاہئے اور ایسے اعمال کرنے چاہئیں جن سے ذات مطلق ہم سے خود قریب ہو جائے۔ قربت کے لئے ضروری ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ کام کریں وہ عادات واطوار اختیار کریں جو اس ہستی کے اندر موجود ہیں جس ہستی سے ہم قریب ہونا چاہتے ہیں۔ ایک آدمی اگر کسی نمازی سے دوستی کرنا چاہتا ہے اور اس سے انتہائی درجہ قربت کا خواہاں ہے تو وہ جب اس کے ساتھ نماز ادا کرنے لگتا ہے تو از خود اس کی دوستی نمازی سے ہو جاتی ہے۔ ایک شرابی کے ساتھ اگر دوستی کرنا مقصود ہے تو اس کے ساتھ شراب پینے سے انتہائی درجہ قربت حاصل ہو جاتی ہے۔ ایک آدمی شطرنج کھیلنے سے یا شطرنج میں دلچسپی لینے سے اس سے دوستی اور قربت پیدا ہونے لگتی ہے۔ کسی سینما کے شوقین سے دوستی کرنے کے لئے یہ بہت آسان طریقہ ہے کہ اس کے ساتھ فلم دیکھنا شروع کر دیا جائے۔ علیٰ ہذالقیاس جس آدمی سے آپ قریب ہونا چاہتے ہیں تو اگر اس کے عادات واطوار اختیار کر لیں تو دوستی زیادہ ہو گی اور اس کی عادتیں اس طرح اختیار کر لی جائیں کہ اس دوست میں اور خود میں کوئی فرق نہیں رہے تو وہ دونوں دوست ایک جان دو قالب ہو جائیں گے اب دیکھنا یہ ہے کہ ذات مطلق جس نے یہ ساری کائنات بنائی ہے کیا کام کرتی ہے؟ تدبر اور مفکر سے کام لیا جائے تو ایک ہی بات سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی خدمت کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ مخلوق آرام و آسائش کی زندگی اور خوش رہے جب کوئی بندہ اللہ کی مخلوق کی خدمت کو اپنی زندگی کا اہم مقصد قرار دے لیتا ہے اور اللہ کی مخلوق کی خدمت اس طرح کرتا ہے کہ اس خدمت کے پس پردہ کوئی خدمت، کوئی صلہ یا کوئی غرض نہیں ہوتی در اصل بندے نے وہی کام شروع کر دیا ہے جو اللہ تعالیٰ کر رہے ہیں۔ اس خدمت اس عمل یا اس کام میں جتنا زیادہ انہماک ہو جاتا ہے جتنا زیادہ آدمی آگے بڑھتا ہے اسی مناسبت سے وہ اللہ تعالیٰ سے قریب ہو جاتا ہے اس لئے کہ بندے نے وہ کام شروع کر دیا ہے جو اللہ تعالیٰ کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ جب یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے بندے نے ایسی زندگی اختیار کر لی ہے جو زندگی ہمارے لئے انتہائی درجہ پسندیدہ ہے تو اللہ تعالیٰ اس بندے کو پسند کرتے ہیں اور اس پسندیدگی کے نتیجے میں بندے کو اپنی گود میں بٹھا لیتے ہیں، حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں سے خوش ہو کر انہیں اچک لیتے ہیں۔

بیمار درخت

سوال: ہم دیکھتے ہیں کہ انسان اپنی تمام تر ترقی کے باوجود بیماریوں اور پریشانیوں کا شکار رہتا ہے۔انسان اس کی وجوہات جاننے سے قاصر نظر آتا ہے۔آپ اس پر کچھ روشنی ڈالیں۔

جواب: ہم جب اللہ تعالی کی تخلیق پر غور کرتے ہیں اور اس غور و فکر میں قرآن پاک سے رجوع کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آکر یقین بن جاتی ہے کہ باوجود اس کے Matter ایک ہے، تخلیقی قاعدے ضابطے اور طریقے ایک ہیں، مخلوق کے اندر طبعی تقاضے یکساں ہیں، عقل و شعور سب میں ہے یہ الگ بات ہے کسی میں شعور زیادہ ہے کسی میں کم ہے اور کسی میں بہت کم ہے باوجود ان تمام مشترک چیزوں کے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہر تخلیق کی انفرادیت اپنی جگہ قائم ہے۔انفرادیت کے دو رخ ہیں۔

ایک رخ اجتماعی حیثیت رکھتا ہے اور دوسرا رخ انفرادی شخصیت کے روپ میں موجود ہے۔اجتماعی رخ کو ہم نوع کا نام دیتے ہیں اور انفرادی رخ کو ہم فرد کہتے ہیں۔ ہر نوع کا ہر فرد الگ اپنی ایک حیثیت، شکل و صورت، رنگ و روپ اور نقش و نگار رکھتا ہے۔ طوطے کی نوع کے تمام افراد کی شکل ایک ہے۔ کبوتر کی نوع کے افراد کی شکل و صورت ایک ہے۔اس طرح اللہ تعالی کی جتنی بھی مختلف مخلوقات ہیں وہ نوعی اعتبار سے جو شکل رکھتی ہیں وہی شکل و صورت انفرادی ہے یہ بات ایسی ہے کہ اس میں زیادہ تفکر اور تدبر کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔انسانی مشاہدات ہر وقت اس صورت حال سے آشنا ہیں۔نوعی تنوع پر غور کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ نوع کا مختلف ہونا اس بات کی علامت ہے کہ نوع کے خدوخال میں معین مقداریں کام کر رہی ہیں۔ بکری کی نوع میں اللہ تعالی نے جو معین مقداریں رکھ دی ہیں وہ معین مقداریں جب متحرک ہوتی ہیں تو اس کے نتیجے میں بکری ہی متحرک ہوتی ہے ایسا نہیں ہوتا کہ بکری کے پیٹ سے کبوتر پیدا ہو جائے یا کبوتر کے پیٹ سے بکری پیدا ہو جائے۔۔۔۔۔۔یہ متعین مقداریں نہ صرف زمین کے اوپر موجود مخلوق میں نظر آتی ہیں بلکہ کائنات کی ہر تخلیق کے ہر جزو میں یہ مقداریں کام کر رہی ہیں ان مقداروں کا اہم کام یہ ہے کہ جب یہ آپس میں رد و بدل ہوتی ہیں یا ان کا آپس میں ایک دوسرے کے اندر انجذاب ہوتا ہے تو مختلف رنگ اختیار کر لیتی ہیں اور یہ رنگ ہی دراصل کسی نوع کے خدوخال بن جاتے ہیں۔اب تخلیقی فارمولا یہ بنا کہ Matter ایک ہے ڈائیاں مختلف ہیں۔ڈائی کی تخلیق اس طرح عمل میں آئی ہے کہ ڈائی Matter کو اپنے اندر محفوظ کر کے اس طرح متحرک کرتی ہے کہ Matter مختلف اور معین مقداروں میں تبدیل ہو جاتا ہے جب یہ معین مقداریں ایک دوسرے میں مل کر پیوست ہو کر

ضرب کھاتی ہیں تو کوئی ایک رنگ بنتا ہے اور جب ایک رنگ دوسرے رنگ میں جذب ہوتا ہے تو تیسرا رنگ بنتا ہے، نتیجے میں بے شمار رنگ وجود میں آجاتے ہیں اور یہ بے شمار رنگ ہی اللہ تعالیٰ کی کائنات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے پاک اور بلند مرتبہ ہے وہ ذات جس نے تخلیق کیا برابر برابر اور معین مقداروں کے ساتھ اس کو ہدایت بخشی۔ اللہ تعالیٰ وہ باتیں فرما رہے ہیں کہ برابری کے ساتھ پیدا کیا اور الگ الگ مقداروں کے ساتھ اس کو شعور بخشا۔ برابری سے مراد وہی ایک مادہ یا Matter معین مقداروں سے مراد رنگوں کی مختلف طرزیں ہیں۔ یہ بات ہم پھر عرض کرتے ہیں کہ ہم اس بات پر پوری طرح روشنی ڈال چکے ہیں کہ زندہ رہنے کے لئے جذبات و احساسات تمام زمینی اور آسمانی مخلوق میں موجود ہیں اور جو کچھ موجود ہے وہ یکساں کائنات کا ہر ذرہ باشعور ہے۔ کائنات کے ہر ذرے کے اندر زندگی قائم رکھنے کے لئے تمام جذبات و احساسات موجود ہیں کائنات کا ہر ذرہ اس بات کا شعور رکھتا ہے کہ وہ مخلوق ہے، اس کو پیدا کرنے والی کوئی ہستی موجود ہے۔ کائنات میں موجود ہر شئے اس بات کا علم بھی رکھتی ہے کہ میں نوعی اعتبار سے اپنی ایک حیثیت رکھتی ہوں مثلاً یہ ہے کہ بکری یہ بات جانتی ہے کہ وہ بکری ہے اور بکری اس بات سے بھی واقف ہے کہ اس کی طرح چار پیروں پر چلنے والا جانور بھیڑیا ہے جس سے اس کو اپنی حفاظت کرنا ہے۔

بکری اس بات کا بھی شعور اور علم رکھتی ہے کہ ایک دوسرے نوع آدمی سے بالکل اسی طرح جس طرح آدمی اس بات کا شعور رکھتا ہے کہ یہ بکری کی نوع ہے، یہ گھوڑے کی نوع ہے، یہ بھینس کی نوع ہے یا یہ درخت کی نوع ہے۔

روحانیت میں یہ بات نہ صرف یہ کہ علمی طور سے سمجھائی جاتی ہے بلکہ اس بات کا مشاہدہ کرادیا جاتا ہے کہ درخت بھی اپنی نوع سے اس طرح واقف ہے جس طرح آدمی اپنی نوع سے اور خود سے واقف ہے جس طرح آدمی کا شعور علم یہ بات جانتا ہے کہ آدم نوع انسانی کا پہلا فرد ہے اسی طرح ایک درخت بھی ہی جانتا ہے کہ اس کا بھی کوئی پہلا فرد ہے۔ جس طرح نوع انسانی کو آدم سے ارتقائی منازل کے بعد شعور منتقل ہو رہا ہے اسی طرح درختوں میں بھی درختوں کے آدم سے شعور منتقل ہو رہا ہے یہاں ایک اعتراض ہو سکتا ہے کہ آدمی شعوری ارتقاء کے ساتھ ساتھ علمی حیثیت میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے، اپنا ایک تعارف رکھتا ہے اور علمی ارتقاء کے ساتھ ساتھ اس سے بہت ساری ایجادات اور بہت ساری ترقیات وابستہ ہیں۔ یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ ایک زمانہ ایسا تھا کہ انسان غاروں میں رہتا تھا پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ اس نے پتھر کا استعمال سیکھ لیا۔ پھر ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ وہ کسی طرح آگ کے استعمال سے واقف ہو گیا پھر دھات کا زمانہ آیا اور بتدریج ترقی کرتے کرتے انسان ایسے مقام پر پہنچ گیا کہ جس مقام پر بظاہر درخت اور دوسری نوعیں ہمیں نظر نہیں آتیں۔

بظاہر یہ بات سامنے ہے کہ آدمؑ کے زمانے میں درخت کی جو حیثیت تھی اب بھی درخت اسی حیثیت میں موجود ہے۔ اس نے کوئی ایسی ترقی نہیں کی جس کی بنیاد پر یہ کہا جائے کہ آدمؑ کی طرح درخت بھی ایک ترقی پذیر قوم یا نوع ہے۔ یہ بات بظاہر صحیح ہے لیکن یہ بات ہمیں ماننی پڑے گی کہ انسان نے جیسے جیسے ترقی کی ہے اور ترقی کی مناسبت سے جو جو مصائب، مشکلات، پریشانیاں اس کو پیش

آتی رہیں وہ اس ترقی یافتہ دور سے پہلے کے دور میں نہیں تھیں۔ انسان نے علوم کی ترقی کے ساتھ ساتھ جب مصائب و آلام کا انبار اپنے گرد جمع کر لیا تو اس نے اس مسائل سے نکلنے کے لئے جدو جہد اور کوشش کی اور فضا میں جو گھٹن اور زہریلے مادے اس نے پیدا کر دیئے ہیں ان سے بچاؤ کے لئے بے شمار تدابیر اختیار کیں۔ جس کے نتیجے میں نئے نئے علاج وجود میں آئے اور نئی نئی ترکیبیں ایسی پیش کی گئیں جن ترکیبوں سے اور جن تدبیروں سے وہ ان مصیبتوں اور پریشانیوں کو دور کر سکے۔ یہ بات زیر بحث نہیں ہے کہ انسان نے تخلیق کردہ مصیبتوں، پریشانیوں اور عدم تحفظ کے احساس پر کس حد تک کنڑول حاصل کیا ہے اور وہ کسی حد تک بے بس ہے۔ بتانا یہ ہے کہ انسان کی علمی ترقی نے فضا کو (Atmosphere) کو زہر آلود کر دیا ہے۔ جس طرح انسان فضا کے اند ر زہریلے مادوں سے متاثر ہو کر بیمار ہوتا ہے اور ان بیماریوں کے تدارک کے لئے علاج کے سلسلے میں نئی نئی ایجادات کرتا ہے اس طرح درخت بیمار نہیں ہوتے اور نہ ہی درخت اپنے لئے نئے نئے طریقے اور نئی نئی اختراع کرتے ہیں لیکن یہ کہے بغیر چارہ نہیں ہے کہ انسان جو اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ کرتا ہے جب فضا کی زہرناکیوں سے متاثر ہونے پر مجبور ہے تو لازمی طور پر درخت جو اشرف المخلوقات نہیں ہیں، وہ بھی اس زہر آلود فضا سے متاثر ہوتے ہیں۔ ایک انسان جب صاف ستھرا پانی نہیں پیتا تو اس کو طرح طرح کی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ ایک انسان جب ہوا میں گھلی ہوئی اور بسی ہوئی دھوئیں کی مقدار کو سانس کے ذریعے اپنے پھیپھڑوں میں منتقل کرتا ہے تو اس ہوا سے پھیپھڑے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ جس طرح انسان کی زندگی کا انحصار آکسیجن پر ہے اسی طرح درخت یا کسی دوسری نوع کی زندگی کا انحصار بھی اسی آکسیجن پر ہے۔ فضا میں موجود آکسیجن انسان کی زندگی کا ایندھن بنتی ہے، وہی آکسیجن درخت کی زندگی کا بھی ایندھن بنتی ہے لیکن یہ ایندھن جب انسان کے خون میں گردش کرتا ہے کیونکہ اس میں کثافت ہے اس لئے انسان بے شمار بیماریوں کا مرکز بن جاتا ہے۔ ان بیماریوں میں ایسی بیماریاں بھی ہیں جن کا علاج انسان دریافت نہیں کر سکا۔ پھر ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ درخت جب وہی آکسیجن اپنی زندگی میں استعمال کرتا ہے جس آکسیجن کے استعمال کے بعد انسان بیمار ہو جاتا ہے تو درخت کیوں بیمار نہیں پڑ جاتا۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ نوع انسانی جس طرح ارتقاء کی منازل طے کر رہی ہے قدرت نے درخت کو بھی اتنا علم، اتنا شعور اور اتنی عقل عطا فرمائی ہے کہ وہ اپنی نوع کا تحفظ کرتا رہے اور اشرف المخلوقات انسان کی پھیلائی ہوئی بربادیوں سے خود کو محفوظ رکھ سکے۔ اگر درختوں کے اندر اتنا علم موجود نہ ہوتا یا اپنے تحفظ کے لئے وہ عقل استعمال نہ کر سکتے تو فضا کی آلودگی سے وہ ختم ہو جاتے اور زمین پر کہیں درخت نظر نہیں آتا۔ ان شواہد سے اور اس حقیقت سے یہ بات واضح طور پر یقین بن جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ ہم نے معین مقداروں کے ساتھ تخلیق کیا ہے۔ ان معین مقداروں میں درخت بھی ہیں درخت کا تذکرہ بطور خاص اس لئے کیا گیا ہے یہ سمجھا جاتا ہے کہ درخت ایک ایسی مخلوق ہے جو بات نہیں کرتی، کوئی احساس نہیں رکھتی جب کہ دوسری مخلوق مثلاً گائے بھینس بکری کے بارے میں عام تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ درختوں کی نسبت زیادہ باشعور ہیں، زیادہ باعقل ہیں۔ جو چیز انسانی نظر میں بالکل بے شعور، بے عقل اور بے اختیار ہے اس کے اندر بھی اللہ تعالیٰ کی ودیعت کردہ معین مقداروں کی وجہ سے اتنی سمجھ بوجھ ہے کہ وہ اپنی نوع کا تحفظ کر سکے۔

باب ہشتم

نیابتِ الٰہیہ

سوال: انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنا نائب اور خلیفہ مقرر فرمایا اور اسی سے انسان دوسری مخلوقات سے اشرف ٹھہرا۔ روحانی علوم کی روشنی میں اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب: شعور کا تجزیہ اگر کیا جائے تو ہم اس طرح بیان کرینگے کہ ہر وہ چیز جو متحرک ہے گردش کر رہی ہے اور ارتقائی منازل سے گزر رہی ہے، شعور رکھتی ہے۔ باالفاظ دیگر کسی چیز کا متحرک رہنا، بڑھنا گھٹنا، سرسبز و شاداب ہونا یا خشک ہونا، پیدا ہونا یا مر جانا۔

موسم کے گرم و سرد سے متاثر ہونا اور اس چیز کے اوپر آوازوں کا اثر انداز ہونا شعوری کیفیت ہے۔ جیسے جیسے کیفیات میں تیزی آتی رہتی ہے اسی مناسبت سے شعور بڑھتا رہتا ہے۔ شعور بڑھنے سے مراد یہ ہے کہ علم میں اضافہ ہوتا رہتا ہے یعنی علم میں اضافہ دراصل شعوری ارتقاء ہے۔ آدمؑ کی پیدائش سے اب تک نوع انسانی نے جس قدر عقلی، علمی یا شعوری ترقی کی ہے ہم اس کو ارتقائی منازل اس لئے کہتے ہیں کہ نوع انسانی کے علوم میں اضافہ ہوا ہے۔ بات بہت سیدھی ہے یعنی آدمؑ کو جو علم حاصل تھا وہ آج آدمؑ کی اولاد کو علم حاصل ہے اور اس علم میں بے اندازہ اضافہ ہوا ہے۔ باالفاظ دیگر آدمؑ کی اولاد نے جب وہ علوم حاصل کر لئے جن علوم سے آدمؑ یا آدمؑ کی اولاد واقف نہیں تھی تو نوع انسانی ترقی یافتہ صورت میں ظاہر ہوئی۔ سائنس کیا ہے؟ یہ بھی علوم کی ایک ارتقائی شکل و صورت ہے۔ نوع انسانی میں سے کوئی بندہ یا کوئی سائنس دان پیدا ہوا، اس نے کسی علم کی بنیاد رکھی۔ ابھی علم کے خدوخال پوری طرح واضح بھی نہیں ہوئے تھے کہ وہ مر گیا۔ اس سائنس دان کی تھیوری کو آنے والی نسلوں نے علمی اور عقلی اعتبار سے آگے بڑھایا اور نتیجے میں علم کی ایک ایسی ٹھوس اور مثبت شکل سامنے آگئی جس کو ہم نے کوئی نام دے دیا ہے۔ مثلاً ٹیلی فون، ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ ارتقائی منازل سے گزر کر ہی کوئی نئی چیز ایجاد ہوتی ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ کوئی چیز جو متحرک ہے اور عقل و شعور رکھتی ہے اگر عقل و شعور کے دائرے میں رہ کر جدوجہد اور تجسس کرتی ہے تو اس سے نئی نئی ایجادات سامنے آتی ہیں۔ نوع انسانی اور دوسری نوعوں میں شعوری اعتبار سے جو حد فاصل قائم ہے۔ وہ یہ ہے کہ دوسری نوعیں ایک مخصوص شعور اور مخصوص جبلت میں رہ کر زندگی گزارتی ہیں اور انسان چونکہ اللہ تعالیٰ کے علم کا امین ہے اس لئے وہ نئی نئی اختراعات کے لئے جدوجہد اور کوشش کرتا رہتا ہے اور یہ کوششیں بارآور ہوتی رہتی ہیں۔ ان تمام کوششوں کے نتیجے میں جو چیزیں

وجود میں آتی ہیں وہ ہمیں اس تفکر کی دعوت دیتی ہیں کہ کوشش اور جدوجہد سے انسان بہت کچھ سیکھتا ہے، بہت کچھ بناتا ہے اور دوسری نوعوں سے ممتاز ہو جاتا ہے لیکن اگر نوع انسانی میں کوئی ایک قوم یا زیادہ اقوام تفکر سے کام نہیں لیتیں تو ان کی حیثیت حیوانوں کی سی ہوتی ہے۔ جس طرح ایک بکری ایک مخصوص طرز میں زندگی گزارتی ہے۔ اسی طرح نوع انسانی کے افراد یا نوع انسانی کی قوم ایک دو مخصوص طرزوں میں زندگی گزار کر مر جاتی ہے اور اس نوع میں سے جو افراد اور جو قومیں جستجو اور جدوجہد کرتی ہیں، اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے اور نشانیاں تلاش کرتی ہیں تو ان سے نئی نئی چیزیں وجود میں آتی ہیں۔ یہ صورت حال جو اس وقت ہمارے سامنے ہے یہ ہے کہ اقوام عالم میں واحد قوم مسلمان ہے جو علمی اعتبار سے انتہائی درجہ پست اور انتہائی درجہ پیچھے ہے۔ ہم نے زمین اور آسمان کو اور اس کے اندر جو کچھ ہے سب کو انسان کے لئے مسخر کر دیا ہے اور تسخیری فارمولے کی کتاب قرآن میں ان سب باتوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے اور قرآن سمجھنے کے لئے آسان کر دیا ہے۔

''اور ہم نے لوگوں کے اوپر قرآن کا سمجھنا آسان کر دیا ہے۔ ہے کوئی سمجھنے والا؟''

ہے کوئی سمجھنے والے سے مراد یہ ہے کہ جب بندہ قرآن پاک کے مفہوم میں تدبر اور تفکر کرے گا تو بات سمجھ میں آئے گی اور قرآن پاک کی آیات میں تفکر اور تدبر نہیں کیا جائے گا تو قرآن سمجھ میں نہیں آئے گا۔ جب قرآن پاک سمجھ میں آ جائے گا تو قرآن میں کائنات کی تسخیر کے متعلق جو فارمولے بیان کئے گئے ہیں وہ بھی سمجھ میں آ جائیں گے۔ موجودہ سائنس کی ترقی کے اوپر اگر نظر ڈالی جائے تو سائنس کی ہر ترقی میں اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی اشیاء کا عمل دخل ہے۔ سائنس کی کوئی ترقی ایسی نہیں ہوئی ہے اور نہ آئندہ کبھی ہو گی کہ جو اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی اشیاء سے مثنیٰ ہو۔ مثلاً بجلی، بجلی کا بڑا سورس پانی ہے۔ پانی اللہ کی ایک تخلیق ہے بجلی کو محفوظ رکھنے کے لئے اور بجلی کو رواں رکھنے کے لئے تاروں کی ضرورت پیش آتی ہے تار جس دھات سے بنتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی تخلیق ہے۔ بڑی بڑی مشینری، چھوٹی چھوٹی مشینری، چھوٹے سے چھوٹا پرزہ یا بڑے سے بڑا پرزہ دھات سے بنتا ہے یہ دھات بھی اللہ کی بنائی ہوئی ہے۔ علیٰ ہذاالقیاس، دنیا کی ترقی ایسے ممکن نہیں ہے جس میں پہلے سے موجود اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی چیزوں کا عمل دخل نہ ہو۔ انسان جس اللہ کی بنائی ہوئی کسی تخلیق میں تفکر کرتا ہے اور تفکر کے ساتھ اس چیز کو آگے بڑھاتا ہے تو اسی ایک چیز سے ہزاروں لاکھوں چیزیں وجود میں آ جاتی ہیں لیکن لوہے کے اندر باوجود اس کے ایسی صلاحیت موجود ہے کہ وہ ہزاروں، لاکھوں اشیاء میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ صلاحیت اس میں موجود نہیں ہے کہ وہ از خود اشیاء میں تبدیل ہو جائے۔ لوہے کو نئی نئی چیزوں میں ڈھالنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی سب سے اچھی تخلیق انسان ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسی صلاحیتوں پر تخلیق کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مصنوعات سے دوسری بے شمار مصنوعات تیار کرتا رہتا ہے تصوف یا روحانیت میں انسان کو اپنی صلاحیتوں کی پہچان کا نام آدمی کا اپنا عرفان ہے۔ روحانیت ہمیں بتاتی ہے کہ انسان کا سب سے پہلا فرض منصبی یہ ہے کہ وہ اپنے اندر چھپی ہوئی مخفی طاقتوں کا سراغ لگائے اور ان صلاحیتوں کو اپنے اندر متحرک کر دے جن صلاحیتوں کی بنیاد پر وہ خالق ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بارے میں ارشاد فرماتے

ہیں۔احسن الخالقین۔ میں تخلیق کرنے والوں میں بہترین خالق ہوں۔مطلب واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے بندے بھی تخلیقی صلاحیت رکھتے ہیں اور جب وہ تخلیقی صلاحیتوں سے کام لیتے ہیں تو نئی نئی چیزیں وجود میں آجاتی ہیں لیکن اگر انسان اپنی ان صلاحیتوں سے متعارف ہوئے بغیر ان صلاحیتوں کو کسی طرح متعارف کردے تو اس سے جتنی بھی تخلیقات عمل میں آتی ہیں وہ نوع انسانی کے لئے فلاح و بہبود کا ذریعہ بننے کی بجائے ہلاکت اور پریشانیوں کا پیش خیمہ بن جاتی ہیں۔اس لئے کہ آدمی اپنی صلاحیتوں سے واقف ہونے کے بعد یہ راز معلوم کرلیتا ہے کہ اصل خالق اللہ ہے اور بندہ جن صلاحیتوں سے دوسری چیزیں تخلیق کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی صلاحیتیں ہیں یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔اس کی مثال یہ ہے کہ آگ کی صلاحیت جلانا ہے،آگ کو جس جگہ بھی ڈالا جائے گا وہ چیز جل جائے گی لیکن ایک آدمی آگ کی تپش، آگ کے اندر شدت گرمی اور اس گرمی سے دوسری چیزوں کو پگھلانے کی صلاحیت سے واقف ہے تو آگ سے بے شمار ایسی چیزیں بنالے گا جو اس کے لئے مفید اور کارآمد ہونگی اسی صورت سے جب کوئی بندہ اپنی ذات کا عرفان حاصل کرلیتا ہے تو اس کے اوپر یہ راز کھل جاتا ہے کہ آدمی گوشت پوست کا آدمی نہیں ہے۔آدمی دراصل اللہ تعالیٰ کی تخلیقی صلاحیتوں کا مظہر ہے اسی بات کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ کہہ کر بیان فرمایا ہے یعنی جب کوئی بندہ خود کو پہچان لیتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کو بھی پہچان لیتا ہے۔خالق کائنات کو پہچاننے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے آدمی خود سے متعارف ہو۔اگر کوئی بندہ اپنے آپ کو نہیں پہچانتا، نہیں جانتا یا اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی ان صلاحیتوں سے وقوف نہیں رکھتا۔جن صلاحیتوں کی بناپر وہ کائنات میں عام نوعوں سے ممتاز ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل نہیں کرسکتا۔روحانیت ہمیں سکھاتی ہے کہ جو لوگ اس سبق کو یاد کرکے آگے بڑھ جاتے ہیں انہیں آنکھوں سے دکھادیتا ہے کہ آدمؑ کا پتلا صرف گوشت پوست کا نہیں ہے۔ دراصل یہ اللہ تعالیٰ کی صفات سے مرکب ہے اللہ تعالیٰ چونکہ خالق ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ کی ہر صفت تخلیق ہے چونکہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس بات کا ادراک عطا کردیا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کا نائب ہونے کی حیثیت سے بے شمار تخلیقات کرسکتا ہے اور انسان کے علاوہ دوسری کوئی نوع ان تخلیقی حدود میں اپنے ارادے سے داخل نہیں ہوسکتی۔اس لئے انسان دوسری نوعوں کے اوپر اشرف ہے لیکن اگر انسان ان تخلیقی صلاحیتوں سے واقف نہیں ہے یا واقف ہونے کے لئے جدوجہد اور کوشش نہیں کرتا تو اس کی حیثیت اشرف المخلوقات کی نہیں ہے،زمین اور آسمان پر اس کی حکمرانی زیر بحث نہیں آتی۔وہ چیونٹی اور مچھر سے بھی کمتر ہے۔تصور شیخ اور مراقبہ ریاضت و مجاہدہ اشغال و اذکار اور تفکر یہ سب سیڑھیاں ہیں اس منزل تک پہنچنے کے لئے جس منزل پر ہمیں یہ سراغ ملتا ہے کہ انسان کی حیثیت کائنات میں اللہ تعالیٰ کے نائب یا قائم مقام کی ہے۔نائب یا قائم مقام کی حیثیت سے اس کو اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت عطا کی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اختیارات کو استعمال کرسکتا ہے اور اگر کوئی بندہ ان اختیارات کو استعمال نہیں کرسکتا یا اختیارات کے استعمال سے واقف نہیں ہے تو اس کی حیثیت اللہ تعالیٰ کے نائب یا قائم مقام کی نہیں ہے۔ عرف عام میں نائب اور قائم مقام کے معانی یہ ہیں کہ کوئی آدمی جب کسی کا نائب ہوتا ہے یا کسی کی جگہ بحیثیت قائم مقام کے بیٹھتا ہے تو اسے وہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں جس کی وہ نیابت کررہا ہے یعنی کسی ملک کے صدر کا کوئی نائب یا قائم مقام مستقل نہ سہی

عارضی طور پر وہی اختیارات رکھتا ہے جو صدر کے ہوتے ہیں اس بات کو اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ کسی بااختیار ہستی نے اپنے اختیارات دوسرے کے سپرد کر دیئے ہیں۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔'' پھر اس نائب یا خلیفہ کو فرشتوں سے سجدہ کرانا، فرشتوں کے اعتراض پر نائب اور خلیفہ کو وہ خصوصی علم عطا کرنا، جو فرشتوں کو حاصل نہیں تھا اور نہیں ہے اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نائب کو عارضی طور پر اپنے اختیارات منتقل کئے ہیں اللہ تعالیٰ چونکہ خالق ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ کے بحیثیت خالق کے اختیارات، تخلیقی اختیارات میں شمار ہونگے یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے تخلیقی اختیارات اپنے نائب کو منتقل کر دیئے۔ اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے ''احسن الخالقین'' کہہ کر ارشاد فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ''میں تخلیق کرنے والوں میں بہترین خالق ہوں۔'' بات بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اختیارات کے تحت وہ لوگ بھی تخلیقی اختیارات استعمال کر سکتے ہیں جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے بحیثیت نائب یا خلیفہ کے اپنے اختیارات استعمال کر سکتے ہیں جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے بحیثیت نائب یا خلیفہ کے اپنے اختیارات تفویض کر دیئے ہیں اختیارات دو طرح استعمال ہوتے ہیں۔ اختیارات استعمال کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی از خود بلا کسی دوسرے کے مشورے کے ان اختیارات کو استعمال کرے۔ اختیارات استعمال کرنے کی دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی اختیارات استعمال کرنے میں بااختیار ہو لیکن وہ اختیار کسی کا تفویض کردہ ہو۔ جہاں تک اختیارات استعمال کرنے کا تعلق ہے دونوں صورتوں میں اس کا طریقہ کار ایک ہی ہوگا۔ فرق صرف اتنا ہے گا کہ ایک آدمی جو کسی کے دیئے ہوئے اختیارات استعمال کر رہا ہے اور اس ہستی کی رضا اور منشاء کو ملحوظ نظر رکھے گا۔

قرآن پاک میں جہاں تخلیقی فارمولوں کا تذکرہ ملتا ہے اس میں بنیادی بات جو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمائی ہے وہ سورہ یٰسین شریف کی آخری آیتوں میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کا امر یہ ہے کہ جب وہ ارادہ کرتا ہے کسی چیز کا، تو کہتا ہے کن اور وہ چیز ہو جاتی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کو تخلیق کرنا چاہتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کا امر پہلے اس چیز کو وجود میں لانے کے لئے ارادہ کرتا ہے پھر یہ ارادہ متحرک ہو کر اس چیز کو حکم دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ چیز خدوخال اور جود کے ساتھ مظہر بن جاتی ہے فارمولا یہ بنا کہ جب کسی چیز کو تخلیق کیا جائے گا تو پہلے اس چیز کا خاکہ اس چیز کے نقوش، اس چیز سے متعلق ضروریات ذہن میں موجود ہونگی۔ ذہن ان چیزوں کو وجود میں لانے کا ارادہ کرے گا پھر ارادے میں گہرائی پیدا ہوگی اور ارادے میں جب حرکت پیدا ہوگی تو وہ چیز جو پہلے سے ذہن میں موجود ہے خدوخال کے ساتھ وجود میں آجائے گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اس کا امر یہ ہے۔ امر سے مراد اللہ تعالیٰ کا ذہن جس کو تصوف کی اصطلاح میں واجب الوجود میں کہا گیا ہے۔ کائنات کی تخلیق سے پہلے اللہ تعالیٰ کے ذہن (امر) میں یہ بات آئی کہ کائنات بنانی ہے، ذہن یا امر نے اس کائنات کو وجود بخشنا چاہا یعنی کائنات کے خدوخال جو اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود تھے ان کو اللہ تعالیٰ کے ذہن سے باہر مظہر بنانے کا ارادہ کیا۔ اس ارادہ نے کن کہا یعنی حکم دیا کہ اس کائنات کو جو کائنات اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود تھی اور اس حکم کے ساتھ وہی کائنات تشکیل پا گئی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنا ذہن ہے یا اللہ تعالیٰ کا تخلیق کرنے کا اپنا ذاتی طریقہ ہے

کہ اللہ تعالیٰ کے ذہن میں جو کچھ موجود تھا اس کو اللہ تعالیٰ نے ظاہر کرنے کا ارادہ کیا۔ ارادے میں حرکت پیدا ہوئی اور یہ سب جو اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود تھا شکل و صورت کے ساتھ موجود ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کی وہ تخلیق جس کو اللہ تعالیٰ نے ذیلی تخلیقات کا اختیار دیا ہے اس کی زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ہی ذیلی تخلیق بھی اللہ تعالیٰ کی اس صفت کو اختیاری یا غیر اختیاری طور پر استعمال کر رہی ہے۔ بندے کو پیاس لگتی ہے پیاس کا تقاضا اس کے اوپر وارد ہوتا ہے یہ تقاضا جب گہرا ہوتا ہے تو آدمی پانی پینے کا ارادہ کرتا ہے۔ ارادے میں جب حرکت ہوتی ہے تو آدمی پانی پی لیتا ہے۔ پیاس کے تقاضے کے ساتھ اگر آدمی کا ارادہ شامل نہ ہو تو آدمی کبھی پانی نہیں پی سکتا۔ اسی طرح آدمی کو بھوک لگتی ہے یعنی آدمی کے ذہن کے اوپر بھوک کا تقاضا مرتب ہوا۔ بھوک کا تقاضا مرتب ہونے سے مراد یہ ہے کہ جن اشیاء سے بھوک رفع ہو سکتی ہے ان تمام اشیاء کے نقوش اور خدوخال ذہن کے اوپر مرتب ہو گئے اس کو براہ راست طرز میں اس طرح کہا جائے گا کہ آدمی کے ذہن نے یہ چاہا کہ کچھ کھایا جائے تا کہ بھوک رفع ہو۔ یہ اللہ کا امر ہے اس امر نے یہ چاہا کہ بھوک رفع کرنے کے لئے اشیاء کا استعمال کیا جائے۔ چاہنا ارادہ ہے۔ جب ذہن نے بھوک رفع کرنے کے لئے ارادہ کیا تو وہ چیزیں موجود ہو گئیں جن چیزوں سے بھوک رفع ہوتی ہے۔ بھوک کن چیزوں سے رفع ہوتی ہے یہ ایک علم ہے یا زندگی کے تقاضوں کی تکمیل کن چیزوں سے ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک علم ہے اسی علم کو علم الاسماء کہا گیا ہے۔ اب یہاں دو صورتیں زیر غور ہیں۔ بھوک کا علم اور بھوک کو کن چیزوں سے رفع کیا جائے۔ اس کا علم حیوانات کو بھی ہے۔ بکری یہ بات جانتی ہے کہ میری بھوک پتوں سے رفع ہوتی ہے، گوشت کھانے سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ لہٰذا بکری پتے کھاتی ہے گوشت نہیں کھاتی۔ شیر کو اس بات کا علم ہے کہ اس کی بھوک گوشت کھانے سے رفع ہوتی ہے، اس لئے وہ بھوک رفع کرنے کے لئے گوشت کھاتا ہے، پتے نہیں کھاتا۔ علم کی ایک شکل یہ ہے کہ پتے کھانے سے بھوک رفع ہوتی ہے، گوشت کھانے سے بھوک رفع ہوتی ہے اور پتے اور گوشت کو اپنے اختیارات کے تحت استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ایک آدمی جو اختیارات کے استعمال سے واقفیت رکھتا ہے وہ پتوں سے بھی بھوک رفع کر لیتا ہے اور گوشت سے بھی بھوک مٹا لیتا ہے۔ اس لئے کہ اسے بھوک پیاس رفع کرنے کے علم کے ساتھ ساتھ یہ علم بھی حاصل ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے علم کے ساتھ ساتھ اپنے اختیارات بھی استعمال کر سکتا ہے۔ لیکن جہاں تک تخلیقی فارمولے یا Equations کا تعلق ہے اس کا طریقہ ایک ہی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ فارمولے ہر چیز سے بے نیاز ہو کر بحیثیت قادر مطلق کے استعمال کرتے ہیں اور یہ بندہ اللہ تعالیٰ کے تخلیقی فارمولوں کے مطابق اپنے اختیارات استعمال کر کے عملدرآمد کرتا ہے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیفہ اور نائب قرار دیا ہے اور تخلیقی فارمولوں پر اسے اختیار دیا گیا ہے انہی تخلیقی فارمولوں پر اختیار کو ظاہر کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے کہ تمہارے لئے ارض و سماوات اور اس کے اندر جو کچھ ہے سب کا سب مسخر کر دیا گیا ہے، چاند کو مسخر کر دیا، سورج کو مسخر کر دیا گیا، نجوم کو مسخر کر دیا گیا۔ انسان بحیثیت خالق کے جن فارمولوں سے

مرکب ہے وہ بھی قرآن پاک سے ثابت ہیں اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں ارشاد فرماتے ہیں ''انسان ناقابل تذکرہ شے تھا۔ ہم نے اس کے اندر اپنی روح ڈال دی اور وہ بولتا، ہنستا، چکھتا، محسوس کرتا، انسان بن گیا۔'' یعنی جب تک اللہ تعالیٰ کی روح انسان کے اندر نہیں پھونکی گئی اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی جیسے ہی اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی روح آئی انسان متحرک ہو گیا اس بات کو مزید وضاحت کے ساتھ اللہ تعالیٰ بیان فرماتے ہیں کہ ''تم میری سماعت سے سنتے ہو' تم میری بصارت سے دیکھتے ہو۔ تم میرے دماغ سے سوچتے ہو اور اللہ ہر چیز پر محیط ہے' اللہ ہی ابتدا ہے' اللہ ہی انتہا ہے' اللہ ہی ظاہر ہے' اللہ ہی باطن ہے۔ مقصد واضح ہے کہ انسان کی حیثیت اس وقت ہے جب اس کے اندر اللہ کی روح کام کرتی ہے۔ روح کے بغیر انسان کی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ مٹی کے ڈھیلے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ روح کے بارے میں قرآن کہتا ہے۔ ''اے پیغمبر ﷺ! یہ لوگ آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ آپ ان سے فرمادیجئے کہ روح میرے رب کے امر سے ہے۔'' قرآن پاک امر کی تعریف یہ کرتا ہے کہ اس کا امر جب ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے کن اور جس چیز کا ارادہ کیا گیا وہ چیز موجود ہو جاتی ہے۔

رنگین دنیا

سوال: انسانی زندگی میں رنگوں کی اہمیت اور ان سے آگاہی کا طریقہ بیان فرمادیں؟

جواب: ہم جب زمین کے اوپر موجود نت نئی تخلیقات پر غور اور تفکر کرتے ہیں تو یہ بات ہمارے سامنے واضح طور پر آجاتی ہے کہ تخلیق کا عمل ظاہر بین نظروں سے دیکھا جائے تو ایک نظر آتا ہے مثلاً ہم کسی درخت کی پیدائش کے بارے میں غور کرتے ہیں تو ہمیں زمین کے اوپر موجود تمام درختوں کی پیدائش کا لامتناہی سلسلہ ایک ہی طریقے پر قائم ملتا ہے۔ درخت چھوٹا ہو یا بڑا، تناور ہو یا بیل کی شکل میں یا جڑی بوٹی کی شکل میں، پیدائش کا سلسلہ یہی ہے کہ زمین کے اندر بیج بویا جاتا ہے۔ زمین اپنی کوکھ میں اس بیج کو نشوونما دیتی ہے اور بیج کی نشوونما مکمل ہونے کے بعد درخت وجود میں آجاتا ہے لیکن یہ بڑی عجیب بات ہے کہ باوجود پیدائش کا طریقہ ایک ہے، ہر درخت اپنی ایک انفرادیت رکھتا ہے اور درخت کی یہ انفرادیت نامکمل نہیں ہوتی۔ مثلاً آم اور بادام کے درخت کو دیکھا جائے تو درخت کی حیثیت میں وہ دونوں ایک ہیں۔ دونوں کی پیدائش کا طریقہ بھی ایک ہے، دونوں کا قد و قامت بھی ایک سا ہے لیکن آم کے تنے میں اور بادام کے تنے میں، زمین آسمان کا فرق ہے، آم کے درخت کا پھل اور بادام کے درخت کا پھل بالکل الگ الگ شکل و صورت میں موجود ہیں اسی طرح جب ہم پھولوں کی طرف توجہ کرتے ہیں تو پھول کا ہر درخت اپنی ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے اور اس انفرادی حیثیت میں اس کے پتے بھی الگ ہوتے ہیں، اس کی شاخیں بھی الگ ہوتی ہیں اور اس کے اندر جو پھول نکلتا ہے وہ بھی الگ ہے۔ پھولوں کی بے شمار قسموں پر جب نظر جاتی ہے تو یہ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ پھول میں اگر خوشبو ہے تو ہر پھول میں الگ خوشبو ہے۔

پھول اگر رنگین ہے تو ہر درخت کا پھول الگ رنگ لئے ہوئے ہے۔ اس کی رنگ سازی کا عالم یہ ہے کہ کوئی پھول اس قدر سرخ ہوتا ہے کہ نوعِ انسانی کا اس قدر سرخ رنگ بنانا آسان نہیں۔ پھول کے رنگوں میں کہیں سفید، کہیں سبز اور کہیں اودا۔ مطلب یہ ہے کہ بے شمار رنگ زمین سے پھوٹتے رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی شان بھی کیسی عجیب شان ہے کہ زمین ایک ہے، ہوا بھی ایک ہے، سورج کی روشنی بھی ایک ہے، پانی بھی ایک ہے، پیدائش کا طریقہ بھی ایک ہے لیکن ہر چیز ایک دوسرے سے مختلف ہے اور دوسری بات جو بہت زیادہ توجہ طلب ہے وہ یہ ہے کہ ہر پیدا ہونے والی شئے میں کسی نہ کسی رنگ کا غلبہ ضروری رہتا ہے۔ مطلب یہ

ہے کہ کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جو بے رنگ ہو۔ یہ بے رنگ اور رنگ دراصل خالق اور تخلیق کے درمیان ایک پردہ ہے۔ خالق سے مخلوق کو جو چیز الگ اور ممتاز کرتی ہے وہ رنگ ہے۔ انسان کے اندر جب تخلیقی صفات کا مظاہرہ ہوتا ہے یا اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس کے اندر تخلیقی صلاحیتوں کا علم بیدار کر دیتے ہیں تو اس کے اوپر یہ بات منکشف ہو جاتی ہے کہ تخلیق کا مطلب ہی یہ ہے کہ کوئی خیال سے بے رنگ خیال جب رنگین ہو جاتا ہے تو تخلیق بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بحیثیت خالق کے جو کچھ بھی ہیں اس کا الفاظ میں احاطہ ممکن نہیں ہے۔ جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ بحیثیت خالق کے ظاہر ہو گئے ان کا ارشاد بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ ایسی ماوراء ہستی ہیں کہ جو تمام مخلوقات سے الگ اور ممتاز ہیں۔ حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے ''لوح قلم'' میں اللہ تعالیٰ کی ذات کو ورائے نے رنگ فرمایا ہے یعنی رنگ، ورائے بے رنگ۔ اللہ تعالیٰ نے جب کائنات کو بنانے کا ارادہ فرمایا تو جو کچھ اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود تھا اس کا ارادہ کیا اور فرمایا کن اور وہ چیز وجود میں آ گئی یعنی ورائے بے رنگ سے نزول کر کے اللہ تعالیٰ کے خیال نے ایک رنگ اختیار کیا۔ جس کو سمجھنے کے لئے تصوف نے بے رنگی کا نام دیا۔ یعنی ایسا رنگ جس کو بیان نہیں کیا جا سکتا اور جس کی الفاظ میں تشریح نہیں کی جا سکتی۔ پھر اس بے رنگی میں حرکت پیدا ہوئی تو رنگین وجود تخلیق میں آ گیا اور یہی وجود مختلف صورتوں میں اور مختلف رنگوں میں اور مختلف صلاحیتوں کے ساتھ مجسم اور منتقل ہو گیا۔ اس بات سے یہ پتہ چلا کہ کائنات کی تخلیق میں بنیادی عنصر یا بنیادی مسالہ رنگ ہے۔

اس سے پہلے یہ بات پوری طرح وضاحت سے بیان کی جا چکی ہے کہ انسان گوشت پوست اور ہڈیوں کے ڈھانچے کا نام نہیں ہے۔

انسان کے اوپر ایک اور روشنیوں کا بنا ہوا جسم ہوتا ہے جسے قلندر بابا اولیاءؒ نے ''نسمہ'' کا نام دیا ہے یہ جسم جو روشنیوں کا بنا ہوا ہے، روح نہیں ہے، بلکہ جس طرح اس روشنیوں کے بنے ہوئے جسم نے اپنے گوشت پوست کا لباس بنایا ہے اسی طرح روح نے یہ روشنیوں کا انسان تخلیق کیا ہے۔ انسان کے اندر روشنی کے چھ نقطے یا روشنی کے چھ قمقمے ہوتے ہیں، جن کو تصوف میں لطیفے کہا جاتا ہے۔ ہر دو لطیفوں سے ایک روح بنتی ہے۔ لطیفہ نفسی اور لطیفہ قلبی سے روح حیوانی کا جسم بنتا ہے، لطیفہ سری اور لطیفہ روحی سے روح انسانی وجود میں آتی ہے، لطیفہ خفی اور لطیفہ اخفی سے روح اعظم کی تشکیل ہوتی ہے، لطیفہ نفسی اور لطیفہ قلبی سے جو روح بنتی ہے یعنی روح حیوانی اس کے اوپر ہمیشہ زرد رنگ غالب رہتا ہے۔ لطیفہ روحی اور لطیفہ سری سے بننے والی روح انسانی پر سبز رنگ غالب رہتا ہے، اخفی اور خفی سے مرکب روح اعظم پر نیلے رنگ کا غلبہ رہتا ہے۔ جس قدر زرد رنگ کا غلبہ زیادہ ہو جائے گا اسی مناسبت سے آدمی دنیاوی لوازمات میں زیادہ گرفتار ہو جاتا ہے۔ روحانیت میں مراقبہ اس لئے کرایا جاتا ہے کہ آدمی کے اوپر سے زرد رنگ کی گرفت کم ہو جائے۔ زرد رنگ کی گرفت کم ہونے سے آدمی کا ذہن سبز روشنیوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ سبز روشنیاں اسے سکون دیتی ہیں اور ذہنی ارتکاز میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ جب ذہنی ارتکاز سبز روشنیوں پر ہوتا ہے تو ذہن نیلی روشنیوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ نیلی روشنیوں کے بعد کوئی رنگ نہیں ہے۔ جب کوئی بندہ نیلی روشنیوں کی گرفت سے آزاد

ہو جاتا ہے تو اس کا ذہن بے رنگی میں منتقل ہو جاتا ہے۔ ذہن انسانی کی تخلیق اللہ تعالیٰ نے کچھ اس طرح کی ہے کہ وہ کسی جگہ ٹھہرتا نہیں ہے۔ بے رنگی سے نکل کر وہ ورائے بے رنگ کا مشاہدہ کر لیتا ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کی ذات کا عرفان ہے۔ تصوف میں سالک کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے اپنے اوپر ایسی کیفیات اور واردات محیط کرے جو اس کو دنیاوی خیالات سے آزاد کر دیں۔ دنیاوی خیالات سے آزاد ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی کھانا پینا چھوڑ دے، کپڑے نہ پہنے، گھر میں رہے، شادی نہ کرے۔ دنیاوی خیالات سے آزادی کا مطلب یہ ہے کہ دنیاوی معاملات میں ذہن کا انہماک نہ ہو۔ دنیاوی معاملات کو روٹین کے طور پر پورا کرے۔ مثلاً ایک آدمی کی ضرورت ہے کہ وہ پانی پئے، اسے جب پیاس لگتی ہے پانی پی لیتا ہے لیکن وہ تمام دن اپنے اوپر پیاس مسلط نہیں رکھتا۔ پانی کا تقاضا پیدا ہوا، پانی پیا اور بھول گیا۔ اس طرح آدمی زندگی قائم رکھنے کے لئے کھانا کھاتا ہے لیکن کوئی آدمی صبح سے شام اور شام سے صبح تک اس خیال میں غرق نہیں رہتا کہ کھانا کھاتا ہے یا کھانا کھانے میں اتنی دیر باقی ہے، بھوک رفع کرنے کا ایک وقت مقرر ہے، بھوک لگتی ہے اور آدمی کھانا کھا لیتا ہے۔ یہی صورت حال سونے اور جاگنے کی ہے۔ یہی صورت حال رشتہ داروں اور دوستوں سے میل جول کی ہے۔ جب کوئی بندہ کسی ایک دو، دس، بیس، پچاس خیالات میں اس طرح گھر جاتا ہے کہ اس کا ذہن کسی وقت یکسو نہیں ہوتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ بے رنگی سے دور ہو کر رنگوں کی دنیا میں مصروف ہو گیا ہے۔ اگر کوئی بندہ دنیاوی ضروریات کے تمام اعمال کو روٹین کے طور پر انجام دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ وہ رنگوں کی دنیا میں رہتے ہوئے بے رنگ دنیا کی طرف سفر کر رہا ہے۔

سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام دنیاوی معاملات سے علیحدگی اور ذہنی یکسوئی کے لئے غار حرا میں تشریف لے جاتے تھے۔ ساتھ میں حسب ضرورت کھانا اور پانی بھی لے جاتے تھے۔ جو غار حرا میں قیام کے دوران خورد و نوش کے کام آتا تھا۔ حضور ﷺ کے اس رولین عمل یا سب سے پہلی سنت پر غور کرنے سے یہ بات یقینی بن جاتی ہے کہ ذہنی یکسوئی حاصل کرنے کے لئے یہ ضرورت نہیں ہے کہ بندہ دنیاوی علائق اور بنیادی جسمانی ضروریات سے قطع تعلق کر کے گوشہ نشین ہو جائے۔ سیدنا حضور اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کی اس اولین سنت سے یہ بات بھی امت کے سامنے آتی ہے کہ حضور ﷺ غار حرا میں مستقل طور پر قیام نہیں فرماتے تھے۔ کچھ مدت کے لئے تشریف لے جاتے تھے اور پھر واپس آ کر دنیاوی معاملات میں مصروف ہو جاتے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولین سنت ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ جب حضور ﷺ کو ذہنی یکسوئی حاصل ہو گئی اور اس ذہنی یکسوئی کے نتیجے میں حضرت جبرائیلؑ تشریف لے آئے اور حضور ﷺ کے اوپر اللہ تعالیٰ کی خصوصی تعلیمات کی بارش ہو گئی اس کے بعد حضور ﷺ غار حرا میں تشریف نہیں لے گئے۔ بعثت نبوی کے بعد اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات کے بعد جو اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو عطا فرمائیں۔ حضور ﷺ کی طرز فکر صرف اور صرف یہ تھی۔ ''ہر چیز من جانب اللہ ہے۔'' کوشش اور جدوجہد انسان کا کام ہے لیکن نتیجہ دروبست اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ غار حرا کے عمل کے نتیجے میں امت کے اوپر یہ بات آشکار ہو جاتی ہے کہ جب یکسوئی

کے مسلسل عمل (مراقبہ) سے ذہن اللہ کی ذات میں مرکوز ہو جاتا ہے تو پھر مراقبہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔علوم نبوت پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ذہن کو دنیاوی علائق اور دنیاوی معاملات سے یکسوئی کرنے کے لئے ایسی مشقوں کی ضرورت ہے۔جن مشقوں میں ذہن دنیا کو عارضی طور پر چھوڑ دے۔ان عبادات و ریاضیات اور مشقوں سے جب ذہن یکسو ہو جاتا ہے یعنی ذہن میں سے دنیا کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے یا یوں کہئے کہ دنیاوی معاملات روٹین کے طور پر عمل پذیر ہوتے ہیں تو آدمی کے اندر روحانی صلاحیتیں بیدار ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔جب ان بیدار روحانی صلاحیتوں میں ذہن انسانی بہت زیادہ متوجہ ہوتا ہے تو شعور کے اوپر سے زردرنگ کا غلبہ ٹوٹنے لگتا ہے جس کسے نتیجے میں زمان و مکان کی حد بندیاں اس طرح ختم ہو جاتی ہیں کہ آدمی بیدار رہتے ہوئے ایسے عمل کرنے لگتا ہے جس طرح کے عمل یا جس طرح کے کام وہ خواب کی زندگی میں کرتا ہے۔اسے مراقبے کے اندر آنکھیں بند کئے ہوئے پوری طرح یہ احساس رہتا ہے کہ میں جسمانی طور پر موجود ہوں۔جسمانی طور پر زمین پر میٹھا ہوا ہوں، آنکھیں بند ہیں اس کے باوجود چل پھر رہا ہوں، اڑ رہا ہوں اور دور دراز فاصلوں کو حذف کر کے چیزوں کو دیکھ رہا ہوں۔یہ دیکھنا دراصل بیداری میں خواب دیکھنا ہے۔جس طرح آدمی سوتے ہوئے خواب دیکھتا ہے اور اسے اس حالت میں یہ پتہ نہیں ہوتا کہ میرا جسم موجود ہے یا نہیں، میں لیٹا ہوا ہوں یا بیٹھا ہوا ہوں، مطلب یہ ہے کہ خواب کی زندگی میں آدمی مکان و زمان کے فاصلے معدوم کر کے دوسری دنیا کی سیر کرتا ہے، عزیز رشتہ داروں سے ملتا ہے۔اگر خواب کی حالت میں کوئی چیز کھاتا ہے تو اس کی لذت محسوس کرتا ہے۔کوئی آدمی اسے مارے تو چوٹ کا احساس ہوتا ہے۔کوئی دہشتناک منظر اس کی نظروں کے سامنے آجائے تو ڈر اور خوف سے اس کی چیخ نکل جاتی ہے۔نہ صرف یہ کہ اسے یہ ڈراؤنا منظر یاد رہتا ہے بلکہ وہ بیدار ہونے کے بعد ان تمام کیفیات سے گزرتا ہے۔جن کیفیات سے بیداری میں ایک دہشت زدہ انسان گزرتا ہے۔خواب سے بیدار ہونے کے بعد اس کے دل کی حرکت تیز ہوتی ہے اور اس کے جسم پر پسینہ ہوتا ہے۔چہرے پر دہشت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں اور آنکھوں میں خوف کی جھلک ہوتی ہے۔اس کے برعکس جب وہ خواب میں ایسی کیفیات سے گزرتا ہے، جن کیفیات میں شادمانی ہے، مسرت ہے، سکون ہے، اطمینان ہے، خوشی ہے، بیدار ہونے کے بعد اس کے اوپر سکون اطمینان کی تمام کیفیات موجود ہوتی ہیں۔تو بیدار ہونے کے بعد۔۔۔۔۔۔وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ میں کسی باغ سے گزر کر آیا ہوں۔اگر اس نے خواب میں رنگ برنگ حسین پھولوں کی خوشبو سونگھی ہے تو بیدار ہونے کے بعد بھی اس کے ماحول میں خوشبو بسی ہوئی ہوتی ہے۔خواب کی حالت میں اگر وہ کوئی پھل کھاتا ہے تو اس کا ذائقہ اور خوشبو بھی اسے محسوس ہوتی ہے۔یہ خواب کی ایسی حالت ہے کہ جس میں انسان کے حواس جسمانی وجود سے بے خبر ہوتے ہیں۔لیکن روح حیوانی کے اوپر زردرنگ کا غلبہ، عام طور سے جتنا غلبہ ہوتا ہے اس سے کم ہو جاتا ہے۔مراقبے میں جو کوئی بندہ خواب دیکھتا ہے یا بالفاظ دیگر دو بند آنکھوں سے کام نہ لے کر تیسری آنکھ سے دیکھتا ہے تب بھی اس کے اوپر یہی کیفیات مرتب ہوتی ہے۔خواب اور مراقبے میں فرق یہ ہے کہ خواب میں ذہنی، جسمانی اعضاء کو نظر انداز نہیں کرتا۔کوئی مراقبے کرنے والا بندہ جس کی آنکھ کھلی ہوئی ہے، آنکھ سے مراد اندر کی آنکھ ہے یا روح کی آنکھ ہے تو Time and Space یا زمان و مکان کو حذف کرتے ہوئے بھی جسمانی کیفیات سے

آشنا رہتا ہے۔ مراقبے کو ہم خواب کا پہلا درجہ قرار دے سکتے ہیں۔یعنی ایسا خواب جس خواب میں آدمی کے اوپر نیند غالب نہ ہو اور بیداری مکمل طور پر حاوی ہو۔ اس کے باوجود آدمی زمان و مکاں سے گزر کر کوئی سفر کرے، کوئی چیز دیکھے یہ مراقبہ ہے۔ یہ صورت حال روح حیوانی کے اعمال و حرکات پر قائم ہے۔ روح حیوانی دو نقطوں سے مرکب ہے۔ ایک نقطے کا نام نفس ہے اور دوسرے نقطے کا نام قلب ہے۔ شعور انسانی جب تک نفس کے اندر دنیا کا مشاہدہ کرتا ہے یا دنیا کو دیکھتا ہے تو یہ زمان و مکاں میں پابند رہتے ہوئے بیداری میں دیکھنا ہے۔ اس سے ترقی کر کے جب آدمی روح حیوانی سے اوپر قلب میں دیکھتا ہے تو Time and Space حذف ہو جاتا ہے اور یہ دیکھنا خواب ہے۔ دو سیڑھیوں سے گزر کر جب آدمی تیسری سیڑھی پر قدم رکھتا ہے یعنی لطیفہ روحی میں دیکھتا ہے، تو یہ دیکھنا مراقبے میں دیکھنا ہے۔ مراقبے میں بیدار رہتے ہوئے شعور و حواس کے ساتھ ٹائم اسپیس کی پابندی کے خلاف چلنا، پھرنا، دوڑنا، کھانا، پینا اور اللہ تعالیٰ کی دنیا کی بے شمار چیزوں کا دیکھنا ہے۔ مراقبہ کی بھی کئی صورتیں ہیں۔ مراقبے کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاتا ہے۔ اسے ذہنی یکسوئی نصیب ہو جاتی ہے۔ کوئی چیز اس کی نظروں کے سامنے آتی ہے لیکن بندہ دیکھی ہوئی چیز میں معانی اور مفہوم نہیں پہنا سکتا۔ دوسری بات یہ ہوتی ہے کہ جس وقت کوئی چیز نظر آتی ہے اس وقت شعور اور حواس معطل ہو جاتے ہیں اور جب اس کیفیت سے وہ نکلتا ہے تو اس کے ذہن میں صرف یہ تاثر قائم رہتا ہے کہ میں نے کوئی چیز دیکھی ہے۔ کیا دیکھی ہے؟ کس طرح دیکھی ہے؟ ایسی کوئی بات اس کے حافظے میں نہیں رہتی۔ تصوف میں اس صورت کو بیداری میں خواب دیکھنا کہتے ہیں اور بیداری میں خواب دیکھنے کو اصطلاحی طور پر ''غنود'' کہتے ہیں۔ اس کے بعد دوسری اسٹیج یہ آتی ہے کہ آدمی نے بیٹھے ہوئے، ہوش و حواس کو قائم رکھتے ہوئے کوئی چیز دیکھی، اس کو ایک جھٹکا سا لگا اور یہ بات ذہن میں آئی کہ میرا وجود موجود ہے، وجود کی موجودگی کے ساتھ ساتھ دیکھی ہوئی چیز کچھ یاد رہ گئی کچھ بھول میں پڑ گئی۔ اس کیفیت کا اصطلاحی نام ''ورود'' ہے اور جیسا کہ ابھی میں نے عرض کیا ہے کہ بیداری کے حواس میں اس طرح کسی چیز کو دیکھنا کہ وہ یاد بھی ہے، اس کے معانی اور مفہوم بھی ذہن نشین ہو جائیں، وجود جسمانی کا احساس بھی باقی رہے اور Time and Space کی پابندی بھی نہ ہو، اس کیفیت کا نام مراقبہ ہے۔ روحانی طرزوں میں اندرونی دنیا کو دیکھنے کا عمل ابتدائی درجوں میں چار طریقوں پر قائم ہے۔ پہلا طریقہ خواب، دوسرا طریقہ غنود، تیسرا طریقہ ورود اور چوتھا طریقہ مراقبہ ہے۔ یہ کیفیات سب کی سب دراصل خواب کی دنیا کا بیداری میں منتقل ہو جانا ہے۔

بے جا اصراف

سوال: روحانیت میں زماں (Time) کو مختصر کرنے کا تذکرہ کیا جاتا ہے، وہ کون سی طاقت ہے جس کی مدد سے زماں کی حدود میں ردوبدل کیا جاسکتا ہے۔ کیا ظاہری زندگی میں بھی ایسا کرنا ممکن ہے؟

جواب: غور کیا جائے تو یہ ظاہری زندگی کا عام مشاہدہ ہے کہ ہم زماں یا ٹائم کی گرفت کو اپنے اوپر سے توڑ بھی سکتے ہیں اور اپنے اوپر مسلط بھی کر لیتے ہیں۔ مثلاً ہمیں کوئی کام کرنا ہے۔ اس کام کو اگر قاعدے اور طریقے سے کیا جائے تو وہ ایک گھنٹے میں پورا ہو جاتا ہے لیکن اگر ہم نہ چاہیں تو یہ ایک گھنٹے کا کام ہفتوں اور مہینوں میں بھی پورا نہیں ہوتا۔

ایک کام کرنا ہے اب سوچنا شروع کر دیجئے کہ یہ کام کرنا ہے۔ اس سوچ میں کہ میں کام کرنا ہے، ہفتے بھی لگ سکتے ہیں، مہینے بھی لگ سکتے ہیں، سال بھی صرف ہو سکتے ہیں اور اگر ہم فوری طور پر کام شروع کر دیں تو یہ کام منٹوں، گھنٹوں یا دنوں میں پورا ہو جاتا ہے بات وہی ہے جو پہلے کہی جا چکی ہے۔ زماں کا مختصر کرنا یا طویل کرنا انسان کا اپنا اختیاری عمل ہے۔

کہا جاتا ہے کہ زندگی کا وقت معین ہے لیکن مشاہدات اور تجربات اس بات کا انکشاف کر رہے ہیں کہ زندگی کے ماہ و سال بھی آدمی اپنے اختیار اور ارادے سے گھٹا اور بڑھا سکتا ہے۔ ایک آدمی ان عوامل میں زندگی گزارتا ہے جن میں زندگی میں کام آنے والی طاقتوں اور صلاحیتوں کا اصراف بیجا ہوتا ہے۔ وہ ایسی غذائیں استعمال کرتا ہے جن سے آدمی کی صحت متاثر ہوتی ہے۔ اس کے دماغ پر غم و فکر کے ایسے خیالات چھائے رہتے ہیں جن کے دباؤ سے اس کے اعصاب مضمحل اور ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ نتیجے میں ایسے آدمی کی عمر کم ہوتی ہے۔

اس کے برعکس ایک آدمی لوازمات زندگی کو بہت مختصر کر دیتا ہے۔ غم و آلام اور فکر کو اپنے قریب نہیں پھٹکنے نہیں دیتا، ایسی غذائیں استعمال نہیں کرتا جو خون کو کمزور کرتی ہیں یعنی تمباکو، منشیات وغیرہ ایسے صاف ستھرے ماحول میں رہتا ہے۔ جہاں فضا زہر آلود نہیں ہوتی نتیجے میں ایسے آدمی کی عمر بڑھ جاتی ہے۔

یہ وضاحت ہے اس بات کی کہ زمانیت کے بھی دو رخ ہیں۔ ایک رخ وہ ہے جس میں آدمی کے اندر کام کرنے والی انرجی (Energy) یعنی وہ صلاحیت، وہ طاقت یا وہ لہریں جو اس کی زندگی کو قائم رکھتی ہیں اتنی زیادہ خرچ ہوتی ہے کہ آدمی اعصابی طور پر کمزور ہو جاتا ہے، اس کے اعصاب جواب دے جاتے ہیں اور وہ بالآخر مر جاتا ہے۔ زمانیت کا دوسرا رخ وہ ہے کہ جس رخ میں کام کرنے والی لہریں ضرورت کے مطابق خرچ ہوتی ہیں اسراف بیجا نہیں ہوتا چونکہ لہریں اعتدال میں خرچ ہوتی ہے اس لئے ان کا ذخیرہ محفوظ رہتا ہے۔ ذخیرہ محفوظ رہنے سے آدمی کے اندر صلاحیتیں زیادہ طاقتور ہو جاتی ہیں اور وہ اس طاقت سے زمانیت کو مختصر اور بہت مختصر کر سکتا ہے۔

روحانیت میں مراقبہ ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعہ اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ انسان کے اندر لہروں کا ذخیرہ زیادہ سے زیادہ حد تک محفوظ ہو جائے اور اس محفوظ ذخیرے کی طاقت سے اس کا اپنا اختیار اور ارادہ اس طرف سفر کرنے لگے جہاں سکون اور راحت کی زندگی موجود ہے۔

ہم نے جس طاقت کو لہروں کا نام دیا ہے، سائنس دان ان لہروں کا نام (Calories) رکھتے ہیں۔

نفسِ واحدہ

سوال: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک ہے ''جس نے اپنے نفس کو پہچانا، اس نے اپنے رب کو پہچانا۔'' سوال یہ ہے کہ یہ نفس کیا ہے جس کو سمجھ کر ہم اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل کر سکتے ہیں؟

جواب: اللہ تعالیٰ جب تخلیق کا تذکرہ فرماتے ہیں تو اپنی خالقیت کا اعلان کرتے ہیں تو کہتے ہیں۔ ''وہی ہے جس نے تمہیں تخلیق کیا ہے نفس واحدہ سے۔'' تصوف میں اس کا اصطلاحی نام ''نسبت وحدت'' ہے اور اس کو ایک نقطہ سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جس میں تمام کائنات بند ہے۔

بادی النظر میں ہم غور کرتے ہیں کہ نفس واحدہ کیا چیز ہے؟ تو عام طرزوں میں یہ کہہ دیا جاتا ہے، نوع انسانی آدم سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی نفس واحدہ سے مراد آدم ہے۔ یہ طرز فکر اور یہ تاویل صحیح نہیں ہے اس لئے کہ جب آدم کا تذکرہ آتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق آدم کا پتلا سڑی اور عبنی مٹی سے تخلیق ہوا۔ حقیقت میں نفس واحدہ جس کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ہم نے تمہیں نفس واحدہ سے تخلیق کیا ہے۔ وہ نقطہ ہے جو ساری کائنات کی بنیاد ہے اور اس نقطہ میں کائنات کا ایک ایک ذرہ ریکارڈ ہے۔ کوئی چیز اس سے باہر نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آدمی اپنے اندر موجود اس نقطہ سے واقف ہو جائے اور اس کی نگاہ اس نقطہ کے اندر کام کرنے لگے۔

اسی نقطہ کے بارے میں حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے۔ ''جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔'' اللہ تعالیٰ کے فرمان اور حضور اکرم ﷺ کے ارشاد پر تفکر کیا جائے تو اس کے معانی اور مفہوم اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں اور ہم ان دونوں میں باہمی ربط موجود پاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے تمہیں تخلیق کیا نفس واحدہ سے۔۔۔۔۔اور حضور اکرم ﷺ اس نفس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ مشکل یہ آن پڑی ہے کہ جب عرفان نفس کا کوئی مسئلہ سامنے آتا ہے تو ہم ان قرآنی آیات کو جس میں عرفان نفس کے متعلق واضح اور روشن ہدایات موجود ہیں متشابہات کہہ کر گزر جاتے ہیں۔ حالانکہ اس کتاب میں کسی قسم کے شک اور شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ خود اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ یہ کتاب جس میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں ان لوگوں کو ہدایت بخشتی ہے جو متقی

ہیں اور متقی وہ لوگ ہیں جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ یعنی غیب ان کے مشاہدے میں ہوتا ہے۔ ان حضرات کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ ان کی عام طرز فکر یہ ہوتی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم اس بات پر ایمان رکھتے ہیں، یہ بات ہمارا یقین ہے۔ یعنی یہ بات ہمارے مشاہدے میں ہے کہ ہر بات، ہر کام، ہر عمل، ہر حرکت خواہ وہ ابتدا ہو یا انتہا، ظاہر ہو یا چھپی ہوئی ہو سب اللہ کی طرف سے ہے۔

مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کے عملدر آمد ہونے میں براہ راست اللہ تعالیٰ کی مشیت کا عمل دخل ہے۔

یہ بات سامنے آچکی ہے کہ کائنات میں موجود ہر شے لہروں کے تانے بانے پر قائم ہے اور یہ لہریں نور کے اوپر قائم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق زمین و آسمان اللہ کا نور ہیں۔ تخلیق کی ایک حیثیت نورانی ہے اور دوسری حیثیت روشنی ہے۔ ان لہروں اور تخلیق کے نورانی وصف کو تلاش کرنے کے اہل اللہ نے انسانی شعور کی مناسبت سے قاعدے اور ضابطے بنائے ہیں اور ایک نقطہ کو چھ حصوں میں تقسیم کر دیا ہے تاکہ ایک سالک آسانی سے سمجھ سکے۔ اس نقطے کے چھ حصوں کا نام تصوف میں لطائف ستہ یعنی چھ لطیفے رکھا گیا ہے۔ پانچ لطیفوں کو چھوڑ کر آخری چھٹا لطیفہ جس کو اخفیٰ کا نام دیا گیا ہے ہر انسان کے اندر نفس واحدہ ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جس میں داخل ہونے کے بعد کائنات صحیح معنوں میں انسان کے لئے تسخیر ہو جاتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد سمجھ لیتا ہے کہ ہم نے مسخر کر دیا سب کا سب تمہارے لئے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں، یعنی آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ تمہارا محکوم ہے اور تم اس کے حاکم ہو۔ اس ارشاد کی مزید تفصیل یہ سامنے آتی ہے کہ ہم نے تمہارے لئے سورج کو مسخر کر دیا، چاند کو مسخر کر دیا، ستاروں کو مسخر کر دیا۔ مسخر ہونے سے یہ مطلب نکالا جاتا ہے کہ چاند اور سورج کو اللہ تعالیٰ نے ایک ڈیوٹی تفویض کی ہے اور یہ بات ان کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ مخلوق کی خدمت کریں۔ چاند ہو، سورج ہو، ستارے ہوں، نباتات ہوں یا جمادات، پانی ہو یا گیس، چرندے ہوں یا پرندے۔ سب انسان کی خدمت گزاری میں مصروف ہیں، ہ مسخر ہونے کی تعریف میں نہیں آتا۔ مسخر ہونا کسی چیز پر حاکمیت قائم ہونے کے معنی رکھتا ہے کہ اس چیز پر تصرف کیا جا سکے۔ موجودہ صورت یہ ہے کہ انسان چاند اور سورج کے تصرف میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ اگر چاند اور سورج اپنا تصرف ختم کر سکتے تو زمین کا وجود باقی نہ رہتا۔ مثلاً یہ کہ ہم دھوپ کے محتاج ہیں اور ہم اس بات کے بھی محتاج ہیں کہ چاند اپنی روشنی سے ہماری فصلوں کو پروان چڑھائے۔ ہمیں چاند اور سورج پر کوئی حاکمیت حاصل نہیں ہے۔

کام اور آرام

سوال: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے دن کام کرنے کیلئے اور رات آرام کیلئے بنائی ہے۔ آپ اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں کہ لاشعور کو بیدار کرنے کیلئے نیند کم کرنی چاہئے۔ باباتاج الدینؒ رات کو مراقبہ کرتے تھے، رات میں جاگنے سے لاشعور بیدار ہو سکتا ہے۔ کوئی شخص اس طرح کرے تو بیمار تو نہیں ہو گا کہتے ہیں کہ لوگ رات میں عبادت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے قریب ہوتے ہیں۔ کتنی نیند کرنی چاہئے، کس وقت سوئیں، کس وقت اٹھیں، لاشعور بیدار کرنے کیلئے نیند کم کرنے سے بیمار تو نہیں ہونگے؟

جواب: نیند اور کھانے پینے کا تعلق عادت سے ہے مثلاً ایک آدمی اپنی خوراک 16 روٹیاں کرلے تو وہ 16 روٹیاں کھاتا رہے گا جسم اس کا پھیلتا رہے گا۔ ایسے بھی لوگ آپ نے دیکھے ہونگے، میں نے تو اپنے پیر و مرشد کو دیکھا وہ چھوٹی چھوٹی دو ٹکیاں ایک ٹکیہ صبح اور ایک ٹکیہ شام کو کھاتے تھے۔ چلتے پھرتے بھی تھے، کام کاج بھی کرتے تھے۔ نماز، روزہ، غسل خانہ جانا، اپنا چھوٹا موٹا کام کرنا، وہ سب کرتے تھے۔ تو غذا کا جو مسئلہ ہے وہ ایسا ہے کہ اس کو جتنا چاہے بڑھالو اور جتنا چاہے گھٹالو۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ مجھے حیرت ہے کہ لوگ کھاتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ اتنے لوگ تلوار سے ہلاک نہیں ہوئے جتنے کھانے سے ہلاک ہوئے ہیں یعنی وہ اتنا کھاتے ہیں کہ بیمار ہو جاتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ اب یہی صورت حال نیند کی ہے جو غذا کی ہے کم کریں یا زیادہ کریں۔

16 روٹیاں کھائیں 4 روٹیاں بھی کھا سکتے ہیں۔ دو صبح کھائیں دو شام کھائیں۔ آپ کی صحت اچھی رہے گی۔ آپ اپنی غذا کو کم بھی کر سکتے ہیں اور اعتدال سے ہٹ کر زیادہ سے زیادہ بھی کر سکتے ہیں یہی حال نیند کا بھی ہے۔ میں نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو 16,16 گھنٹے سوتے ہیں ان کی کمر ہی نہیں دکھتی۔ تو اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے اپنی نیند بڑھالی اور ایسے بھی لوگ ہیں جو تین گھنٹہ سوتے ہیں اور تین گھنٹہ سونے کے بعد بڑے چاق و چوبند ہوتے ہیں اور حاضر دماغ بھی رہتے ہیں۔ بہت کام کرتے ہیں خود میں جب شروع شروع میں کالم لکھتا تھا تو عموماً 19 گھنٹہ روز کام کرتا تھا۔ یہ آپ کے جو خطوط آتے ہیں وہ میں سارے خود ہی لکھا کرتا تھا۔ اب تو ماشاءاللہ مجھے بہت سارے لوگ مل گئے ہیں ان سے بھی پورا نہیں ہوتا جبکہ میں اکیلا کرلیا کرتا تھا۔ 19 گھنٹہ میں، میں کبھی نہیں تھکا اس میں ذوق و شوق کا بھی بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ میرے پیر و مرشد قلندر باباولیاءؒ نے مجھ سے یہ فرمایا کہ اللہ سے دوستی کرنی ہے تو مخلوق سے محبت کرو، خدمت کرو۔ تو ذوق و شوق میں نیند کا کوئی غلبہ نہیں ہوتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے حضور سے فرمایا:

یاایھاالمزمل قرآن کریم کی آیت۔

ترجمہ: اے پیغمبر کمبل اوڑھنے والے! اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کو نئی نئے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ اپنے محبوب کو بڑے بڑے خطاب دیئے کبھی حٰم کہہ دیا کبھی یٰسین کہہ دیا تو کبھی یاایھاالمزمل کہہ دیا کبھی یاایھاالمدثر کہہ دیا۔ اپنے حبیب، اپنے محبوب کو جس طرح بھی یاد کریں۔

اے پیغمبر رات کو آدھی رات گزر جائے یا آدھی رات سے کم گزر جائے یا تھوڑی زیادہ گزر جائے اٹھو اور اٹھ کر قرآن پڑھو۔ اس کا مطلب بھی یہ ہے کہ نیند پر کنٹرول حاصل کریں تو زیادہ سونا جو ہے جس طرح آدمی سونے سے بیمار ہوتا ہے یعنی اتنا کم سوئیں ایک گھنٹہ ہی سوئیں تو لازمی بیمار ہو جائیں گے لیکن فرض کریں ایک آدمی کی نیند کا وقفہ 5 گھنٹہ ہے اور وہ 4 گھنٹہ سوئے تو بیمار نہیں ہو گا عادت پڑ جائے گی اور ایک آدمی بالکل سوتا رہے تو وہ بیمار پڑ جائے گا۔ روحانی لوگ یہ کہتے ہیں کہ 5 گھنٹہ سے زیادہ نہیں سونا چاہئے۔ آدمی اگر ایک دم جاگنے کی پریکٹس شروع کردے تو بیمار ہو سکتا ہے آہستہ آہستہ اگر پریکٹس کی جائے تو 5 گھنٹے کی نیند انسان کیلئے کافی ہے۔ آدمی چست بھی رہتا ہے، خوش بھی رہتا ہے، صحت بھی اچھی رہتی ہے، بھوک بھی زیادہ لگتی ہے۔ آپ کبھی تجربہ کرلیں کہ کم سونے والے بندوں کو بھوک زیادہ لگتی ہے کس لئے اس لئے کہ جتنا کام کریں گے حرکت ہوگی، کھانا زیادہ ہضم ہوگا۔ اگر کسی چیز کو اعتدال سے ہٹ کر کیا جائے تو آدمی بیمار ہو جائے گا اور اگر کسی چیز کو اعتدال میں رہ کر کیا جائے آہستہ آہستہ کیا جائے اور ساتھ ساتھ یہ کہ اس کے پیچھے کوئی رہنما بھی ہو، استاد بھی ہو تو اس میں کوئی نقصان نہیں ہو گا اور نہ ہی کوئی تکلیف ہو گی۔ جس طرح زندگی کے دوسرے تقاضے پورے کرنے کیلئے ہم اعتدال کرتے ہیں اگر اسی صورت سے نیند کی کمی کردیں۔ نیند کی کمی سے بلاشبہ لاشعور بیدار ہوتا ہے۔ نیند کی کمی اس حد تک کرلیں کہ جتنی ہمیں نیند کی ضرورت ہے اگر ہمیں 5 گھنٹہ نیند کی ضرورت ہے تو 6 گھنٹہ کیوں سوئیں اگر ہمیں 6 گھنٹہ نیند کی ضرورت ہے تو ہمیں چاہئے کہ 6 گھنٹہ سوئیں 7 گھنٹہ کیوں سوئیں۔ ان 7 گھنٹوں میں دنیا کا کام کریں، مطالعہ کریں اللہ کے نام کو پھیلانے کے لئے تبلیغ کا کام کریں، بیسیوں کام کر سکتے ہیں۔ آدمی اعتدال سے ہٹ کر کوئی بھی کام کرے گا بیمار ہو جائے گا وہ نیند ہو چاہے وہ کھانا ہو۔ کھانا آپ اعتدال سے ہٹ کر کھائیں گے بیمار ہو جائیں گے اور اگر اعتدال میں رہ کر کام کیا جائے تو وہ کام خوشی کا باعث بن جاتا ہے اور اس سے صحت مندی حاصل ہوتی ہے۔

باب نہم

روشنیوں کا سیب

سوال: کیا مادے کی بنیاد رنگین روشنیاں ہیں؟ ہم مختلف رنگوں سے کس طریقہ پر غذا حاصل کر سکتے ہیں؟ کیا گندمی رنگ کی روشنیاں غذائی ضروریات پوری کرتی ہیں؟ روحانیت کے حوالے سے اس پر روشنی ڈالیں۔

جواب: اگر گندم کے اندر بھوک دور کرنے والی انرجی کی روشنیاں آپ معلوم کر لیں اور انہیں استعمال کرنا سیکھ لیں تو نتیجہ تو وہی ہو گا مگر سوال یہ ہے کہ آپ تو سائیکل کی بھی نقل کرتے ہیں جو قوم خرافات میں پڑی ہوئی ہے جس کے اندر ریسرچ اور تلاش نہیں ہے وہ روشنیوں کی کس طرح تلاش کرے گی۔

کائنات میں جتنی بھی اشیاء ہیں ان سب کی بنیاد روشنی ہے اور اس بات کو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بیان فرمایا ہے کہ اللہ زمین اور آسمان کی روشنی ہے اللہ نے زمین اور آسمان اور اس کے اندر جو کچھ بھی ہے وہ روشنیوں سے تخلیق کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود نور ہیں یعنی روشنی ہیں تو جو کچھ بھی پروگرام دنیا کا بنا ظاہر ہے کہ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ سارا پروگرام اللہ کے ذہن میں موجود تھا تو جب کائناتی پروگرام اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ سارا پروگرام نورانیت اور روشنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ذہن کے مطابق اس پروگرام کو ظاہر کرنا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے کہا کن۔ نور کے اندر سے نکلے ہوئے الفاظ بھی نور ہوتے ہیں روشنی ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی آواز کو نور اور روشنی کے علاوہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ قرآن پاک کے مطابق پوری کائنات روشنی ہے۔ اس پورے رکوع میں اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس رکوع میں روشنی کا پورا فارمولا بیان کیا ہے۔ روشنی کس طرح بنی، روشنی کیا ہے، انسان کے اوپر روشنیوں کے کتنے پرت ہیں، کتنے غلاف ہیں اور پھر روشنی میں ایک طرف گرمی ہے ایک طرف ٹھنڈک ہے۔ قرآن کریم کی آیات۔۔۔۔۔ کہ وہ نور کے اوپر نور ہے۔ غلاف در غلاف آدمی روشنی کا بنا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اس کو وہ نور دکھا بھی دیتا ہے۔ اب گندم کی روشنیاں کوئی آدمی معلوم کر لے اور ان روشنیوں کو کسی بھی صورت سے اپنے اندر داخل کر لے تو آدمی کی غذائی ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔ یہ میرا اپنا تجربہ بھی ہے۔ کچھ عرصہ تک آدمی بغیر کھانا کھائے رہ سکتا ہے۔ اگر آپ کو یہ پتہ چل جائے تو کہ سیب کتنی روشنیوں سے بنا ہوا ہے اور مشاہداتی طور پر وہ بات آپ کو نظر بھی آ جائے کہ سیب اتنی روشنیوں سے بنا ہوا ہے تو آپ اس سیب کی روشنیوں کو اپنے اندر جذب کر کے اپنے اندر منتقل کر کے سیب سے غذائیت حاصل کر سکتے ہیں۔ سیب بذات خود کچھ نہیں سیب روشنی ہے۔ آدمی گندم کھاتا ہے فضلہ نکل جاتا ہے۔ اصل میں گندم جن روشنیوں سے

بناہوا ہے، وہ روشنیاں ہمیں انرجی فراہم کرتی ہیں۔انسان روشنیوں کا بناہوا ہے۔روحانی لوگ جسے جسم مثالی کہتے ہیں۔سائنس دان اسے اوراکاشیڈو کہتے ہیں۔

روشنی، روشنی کو کھاتی ہے۔اگر آدمی آدھا کلو گرام گندم روزانہ کھاتا ہے تو اس نے ایک ماہ میں پندرہ کلو گندم کھایا ہے۔تو سال بھر میں ایک سو اسی 180 کلو گندم اس کی غذا بنی جبکہ سال بھر میں اس کا وزن اتنا نہیں بڑھا اگر آپ فضلہ کا وزن کریں تو ایک ماہ میں فضلہ پندرہ کلو گرام نہیں ہوتا۔ قانون یہ ہے کہ آدمی (Quantity) نہیں کھا رہا ہے بلکہ روشنی کھا رہا ہے۔
قرآن تسخیر کائنات کی دستاویز ہے۔یہ المیہ ہے کہ ہم تسخیری فارمولے معلوم کرنے کے لئے قرآن نہیں پڑھتے۔یہاں تو مسئلہ یہ ہے کہ ہر مسلمان گروہوں میں بٹ گیا، کوئی دیوبندی ہے، کوئی بریلوی ہے، کوئی اہلحدیث ہے اور پتہ نہیں کیا کیا ہے اور ہر فرقہ کے دانشور قرآن کو اپنے تفرقہ میں استعمال کر رہے ہیں۔ تفرقہ بازی میں استعمال ہونے کی وجہ سے مسلمان قرآن پاک کے اندر سے قرآن کریم کی حکمتوں سے اور قرآنی فارمولوں سے محروم ہو گئے ہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کی رسی کو مضبوطی سے متحدہ ہو کر ایک جگہ جمع ہو کر پکڑ لو آپس میں تفرقہ نہ ڈالو لیکن اب اسلام صرف نام ہی تفرقہ کا ہے۔دیوبندی حضرات بریلوی حضرات کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ بریلوی حضرات دیوبندی علماء کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے اور جتنے فرقے ہیں ہر فرقہ اپنے آپ کو جنتی اور دوسروں کو دوزخی کہتا ہے حالانکہ کسی کو پتہ نہیں ہے کہ کون جنتی ہے اور کون دوزخی ہے۔یہ تو اللہ میاں فیصلہ کرینگے کہ کون جنتی ہے اور کون دوزخی ہے۔ابھی یوم حساب قائم نہیں ہوا ہے۔یوم میزان نہیں ہوا تو کون کہہ سکتا ہے کہ کون جنتی ہے اور کون دوزخی ہے۔یہ تو اللہ تعالیٰ کا اپنا فیصلہ ہے کہ وہ کس کو جنتی اور کس کو دوزخی قرار دیتے ہیں۔ ہمارا تو یہ حال ہے کہ ہم فرقوں میں جنت اور دوزخ کو بانٹ رہے ہیں تو جب ہم قرآن پڑھیں گے نہیں اور قرآن کے اندر تسخیری فارمولے تلاش نہیں کریں گے تو قرآن کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ اپنے فارمولے ہمارے اوپر ظاہر کرے۔اللہ کا فرمان ہے کہ ہم نے ساری دنیا میں جو کچھ بھی ہے مقداروں کے ساتھ تخلیق کیا ہے۔ ہومیوپیتھک کی اتنی سی گولی ہوتی ہے، خشخاش کے برابر اس گولی کی طاقت ایک لاکھ ہو جاتی ہے۔کہاں سے اس میں اتنی طاقت پیدا ہو گئی اگر Matter میں سبھی کچھ ہے تو ہومیوپیتھک کی ایک لاکھ کی طاقت کی اتنی چھوٹی گولی آپ کے جسم میں کیسے تبدیلی کر دیتی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ Quantity کی حیثیت نہیں ہے۔آپ جب گیہوں کھاتے ہیں تو جو مقداریں اللہ تعالیٰ نے گیہوں کے اندر متعین کر دی ہیں وہ آپ کھاتے ہیں۔روحانی آدمی کو ابتدائی تعلیمات میں یہ بتایا جاتا ہے کہ گیہوں کیسے بنا؟ روحانی استاد اپنے شاگرد کو یا مرید کو مشاہدہ کراتا ہے کہ گیہوں کا ایک دانہ ہے استاد اس کو بڑا کرتا ہے جتنا بڑا ہو سکتا ہے۔ جیسے خوردبین چھوٹی چیز کو بڑا کر کے دکھاتی ہے یعنی آنکھ خوردبین بن جاتی ہے۔ جب دانہ بڑا ہو جاتا ہے تو ایک گیہوں کا دانہ امرود کے برابر ہو جاتا ہے بعض اوقات اس سے بھی بڑا ہو جاتا ہے۔استاد کے ہاتھ پر امرود کے برابر ایک گیہوں کا دانہ رکھا ہوا ہے وہ کہتا ہے اس میں دیکھو کہ مقداریں کتنی ہیں۔اس میں مٹھاس کتنی ہے۔اس میں نشاستہ کتنا ہے اس میں بھر بھرا پن کتنا ہے۔

اس کے اندر رنگ کتنے ہیں۔ اگر رنگ 4ہیں تو سات رنگوں (مقداروں) میں پھیلنے کی صلاحیت کتنی ہے۔اس کے اندر پانی جذب کرنے کی کتنی صلاحیت ہے۔استاداس کے بعد دکھاتاہے کہ روٹی بنانے کے لئے آگ برداشت کرنے کی اس کے اندر کتنی صلاحیت ہے۔ساری مقداریں مشاہدہ کرا کے زمین کے اند گیہوں کا دانہ ڈال دیا جاتاہے۔ شاگرد کو پتہ چل جاتاہے کہ گیہوں کوئی چیز نہیں بلکہ۔۔۔۔۔اصل چیزاس کی مقدار ہے، مقدار سے مراد یہ ہے کہ ہم نے یہ سمجھ لیاہے مٹھاس کی ایک مقدار ہے تو روحانی لوگ کہتے ہیں کہ مٹھاس میں کتنی مقداریں کام کرتی ہیں تو پھر مٹھاس کا تذکرہ کر کے اس مٹھاس کی مقدار کا تعین کرتے ہیں پھر یہ کہتے ہیں کہ گیہوں کے اندر پانی جذب کرنے کی کتنی صلاحیت موجود ہے تو وہ یہ دیکھتے ہیں کہ پانی جذب ہو رہاہے تو کتنی مقدار میں جذب ہو رہاہے وہ تجربہ کرتے ہیں کہ گندم کے دانہ کا فارمولا یہ بنا کہ اس میں اتنا پانی ہے، اتنی شکر ہے، اتنا نشاستہ ہے، اتنااس کے اندر بھر بھراپن ہے، اتنی اس کے اندر سختی ہے۔اتنااس کے اندر پھیلاؤ ہے۔اتنااس کے اندر کڑاکڑاپن ہے۔ تقریباً20 مقداروں سے مل کر ایک گیہوں بنا۔ پھر اس کو زمین میں ڈالتے ہیں اور اس کی کاشت کرتے ہیں۔استاد نے اس گیہوں کو پکڑ اور پکڑ کر اس کو فضا میں رکھا تو وہاں شاگرد نے دیکھا کہ اس گیہوں کے اوپر فضا میں جتنی گیسیں ہیں جتنی روشنیاں ہیں ان کا اس گیہوں کے اندر جو مقداریں ہوتی ہیں اس پر کیا اثر ہوتاہے۔ وہ کس طرح ایک دوسرے سے Multiply ہوتی ہیں، کس طرح ایک دوسرے میں جذب ہو کر بڑھتی ہیں پھر اس کو نیچے پھینکتے ہیں۔ دیکھیں پکڑی ہوئی چیز الگ ہے اور اوپر سے نیچے آنے والی چیز الگ ہے۔اب اوپر سے جب چیز آرہی ہے تو زمین کی جو کشش ثقل ہے جس کو آپ Gravity کہتے ہیں، وہ گیہوں کو کھینچ رہی ہے۔اب یہ بتایا جاتاہے کہ یہ Gravity کی کتنی مقداریں ہیں۔اس کے بعد زمین پر گیہوں گر گیاہے اب زمین پر جب گیہوں گرا پھر فضا کے اندر جتنی روشنیاں ہیں جتنی گیسیں ہیں وہ اس میں شامل ہو گئیں اب زمین پر جب وہ گرا تو زمین کی ساخت زیر بحث آجاتی ہے کہ زمین کن عناصر سے ترتیب پائی ہے۔ زمین میں کتنے عناصر کام کر رہے ہیں۔ مثلاً زمین میں تانباہے، پیتل ہے، ایلومینیم ہے، فاسفورس ہے، چاندی ہے، سوناہے اور بے شمار معدنیات ہیں۔ ابرق ہے، نمک ہے، پھٹکری ہے وغیرہ وغیرہ۔ بے شمار معدنیات کا اس گیہوں پر کیا اثر ہوا اور ان معدنیات کی الگ الگ کتنی مقداریں ہیں۔ جب وہ ساری مقداریں گیہوں میں شامل ہو گئیں تو گیہوں زمین کے اندر چلا گیا اور زمین نے اس کو بند کر لیا۔ پھر گیہوں کے اندر کی تبدیلی واقع ہوئی۔ کس طرح اس کے اندر کلا پھوٹا۔ کس طرح وہ گیہوں پھول کر پھٹا۔ پھٹنے کے بعد اس میں کلا آیا۔ پھر پتی بنی پھر پودا، اس پودے کے اندر ہزاروں لاکھوں گیہوں لگ گئے پھر یہ مسئلہ زیر بحث آجاتا ہے کہ ایک گیہوں میں ہزار گیہوں کیسے لگ گئے؟

یہ روحانی تعلیمات کا ایک طریقہ ہے اب آپ دیکھیں اس میں سوائے روشنی کی مقداروں کے کوئی چیز نہیں ہے۔اب وہ جب گیہوں بنا اور آپ نے بہت سارے گیہوں اکٹھا کر کے اس کو پسوایا وہاں پر بھی مقداریں زیر بحث آ گئیں اگر وہ چکی کے پاٹوں میں مخصوص Heat پیدا نہ ہو تو آٹا نہیں بنتا۔ چکی چلے بغیر آٹا نہیں بنے گا۔ آپ نے دیکھا ہو گا جب آٹا پستا ہے آپ ہاتھ لگا کر دیکھیں

اچھا خاصا گرم ہوتا ہے، انگلیاں جل جاتی ہیں۔ پھر وہ گرم آٹا ٹھنڈا ہوا پھر آپ نے اس آٹے کو گوندھا اس میں پانی جذب کیا اس کو توے پر ڈالا۔ یہ ساری چیزیں مقداروں کے علاوہ کچھ نہیں۔ اب ہم جو کچھ بھی کھا رہے ہیں مادی اعتبار سے تو ہم Matter کھا رہے ہیں۔ لیکن روحانی نقطہ نظر سے کوئی آدمی Matter نہیں کھا رہا۔ انسان خود روشنیوں کا بنا ہوا ہے۔ روشنی روشنی کو کھا رہی ہے یا یوں کہیں کہ روشنی روشنی کو جذب کر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے جتنی ہم خوراک کھاتے ہیں اس کے حساب سے ہمارا وزن نہیں بڑھتا۔

کوئی چیز مقدار کے بغیر نہیں ہوتی اور مقدار روشنیوں کے علاوہ کچھ نہیں ہوتی تو روشنی کو کوئی نہ کوئی الگ نام ضرور دینا پڑے گا۔ اگر آپ کسی ذریعہ سے سیب کی، گیہوں کی، پپیتے کی جو مقداریں ہیں ان کو آپ دیکھ کر سمجھ کر اپنے اندر ذخیرہ کر لیں تو یہ بات صحیح ہے کہ آپ کو کھانا کھانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ جنت میں بھی Matter نہیں ہے، اسی لیے جنت میں بول و براز نہیں ہوتا۔ پاخانہ، پیشاب نہیں ہوتا۔ جنت میں چیزیں تو سب ہیں دودھ بھی ہے، پھل بھی ہیں، شہد بھی ہے، پانی بھی ہے۔ غذائی انتظام وہاں سارا کا سارا ہے لیکن وہاں ہر چیز روشنی سے بنی ہوئی ہے۔

راہ سلوک کے آداب

سوال: شریعت، طریقت اور معرفت میں کیا فرق ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب: جب ہم قرآن پاک کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کے اندر تفکر کرتے ہیں۔ایک تو اس طرح مطالعہ کرنا ہے کہ پڑھتے جائیں اور قرآن پاک میں غور و فکر کر کے اس کی حکمت کو تلاش کیا جائے۔یہ اصل میں قرآن کا منشاء ہے جو بندے قرآن پاک کو ترجمہ کے ساتھ پڑھ کر اس میں حکمت تلاش کرتے ہیں۔ان کے سامنے یہ بات آتی ہے کہ قرآن میں بے شمار علوم بیان کئے گئے ہیں۔ان کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ان میں سے ایک حصہ اس بارے میں ہے کہ حیوان میں اور انسان میں کس طرح امتیاز قائم ہو اور اس امتیاز کو قائم کرنے کے لئے انسان کو کیا کرنا ہے مثلاً جہاں تک زندہ رہنے کا تعلق ہے ایک بھینس بھی زندہ رہتی ہے، اسے بھی بھوک لگتی ہے۔پیاس لگتی ہے۔وہ بھی پانی پی کر پیاس بجھاتی ہے، بھینس کے بھی بچے ہوتے ہیں، بھینس اپنے بچے کو دودھ بھی پلاتی ہے جس طرح انسان اپنے بچے کو دودھ پلاتا ہے بھینس اپنے بچے کی تربیت بھی کرتی ہے، پرورش بھی کرتی ہے، بھینس کو گرمی، سردی بھی لگتی ہے اور اس کو نہانے کی بھی ضرورت پیش آتی ہے۔اب ہم انسان کی اور بھینس کی زندگی کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں ساری باتیں ایک سی نظر آتی ہیں لیکن جب ہم قرآن پاک کی آیات میں تفکر کرتے ہیں تو باوجود یہ کہ انسان اور حیوان کی زندگی یکساں ہے انسان ایک ممتاز مخلوق بن کر سامنے آتا ہے اور قرآن یہ بتاتا ہے کہ انسان کس طرح زندگی گزارے، کس طرح پاکیزگی اختیار کرے، کس طرح ہمسایوں کے حقوق پورے کرے، حصول معاش میں اس بات کا خیال رکھے کہ دوسروں کا حصہ نہ مارا جائے۔دوسروں کی حق تلفی نہ ہو، بے ایمانی نہ ہو۔بچوں کی تربیت کیسے ہو۔انسان عبادات کیسے کرے وغیرہ وغیرہ۔دوسرے حصہ میں تاریخ بیان کی گئی کہ نوع انسانی میں کس قسم کے لوگ پیدا ہوئے۔اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کی باتیں ان پیغمبروں کی کیا تعلیمات تھیں۔لوگوں نے ان پیغمبروں کو کس حد تک سنا اور کس حد تک رد کیا، لوگوں نے نہ صرف یہ کہ اللہ کی بات نہیں سنی بلکہ اللہ کے فرستادہ پیغمبروں کو قتل بھی کیا وغیرہ وغیرہ اور ان تاریخی حقائق میں یہ بات سامنے آئی کہ قوموں کا عروج و زوال اس بات پر منحصر ہے کہ قومیں کتنی جدوجہد کرتی ہیں۔کتنی کوشش کرتی ہیں۔تیسرا حصہ معاد کہلاتا ہے۔روح کیا ہے؟ اس حصہ میں ساری گفتگو روح پر ہے۔کہاں بنی، کیسے بنی، روح کے کتنے روپ ہیں۔عالم ارواح میں اگر روح تھی تو زمین تک آنے میں اس کو کن کن مدارج سے گزرنا پڑا پھر اس دنیا میں آنے کے بعد کن کن مدارج سے آدمی گزر کر بوڑھا ہوا اور بالآخر مر گیا۔مرنے کے بعد کہاں

چلا گیا اور مرنے کے بعد کی زندگی کا نقش پھر انسان اس طرح زندہ ہو جائے گا جس طرح مرنے سے پہلے تھا۔ حساب کتاب ہوگا، حشر نشر ہوگا، جنت دوزخ وغیرہ وغیرہ تو قرآن کے تین حصے ہمارے سامنے آئے ایک حصہ یہ کہ انسان اللہ کی منشاء پر چلتے ہوئے پاکیزہ زندگی کس طرح گزارے۔ دوسری تاریخ اور تیسرا حصہ معاد۔ معاد کا جو حصہ ہے اس میں سب سے پہلی بات یہ کہ انسان فی الواقع گوشت پوست کے جسم کا نام نہیں ہے بلکہ یہ جان لینے کے بعد کہ گوشت پوست کا جسم اصل نہیں بلکہ اس کی روح اس کا اصل ہے۔ یہ علم جاننا بہت ضروری ہے کہ روح کیا ہے۔ جب آپ نے روح کو سمجھ لیا تو یہاں یہ سوال پیدا ہوا کہ روح بنانے والا کون ہے۔ جب روح کے بنانے والے کے بارے میں آپ سوچیں گے تو اس ہستی کو آپ ڈھونڈیں گے۔ یہ کھوج لگانا اور تلاش کرنا یہ سب طریقت کے دائرے میں آتا ہے۔ انسان حیوانات سے ممتاز ہو کر زندگی گزارے۔ اچھائی، برائی، حرام، حلال وغیرہ یہ سب شریعت ہے۔ شریعت کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے لئے وہ لائحہ عمل منتخب کرے جس لائحہ عمل سے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ انسان کو متعارف کرایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل سلیم عطا کی وہ عقل سلیم اس کو کہتی ہے کہ تو سوچ اور تلاش کر کہ پیدا ہونے سے پہلے کہاں تھا اور مرنے کے بعد تو کہاں چلا جاتا ہے اور تو پیدا کیوں ہوتا ہے اور یہ چاہتا یہ ہے کہ میں کبھی نہ مروں مگر تو مر جاتا ہے۔ یہ کیا معاملہ ہے کہ اپنی مرضی سے تو پیدا بھی نہیں ہو سکتا، اپنی مرضی سے تو زندہ بھی نہیں رہتا، آخر پھر تیرے آنے کا یہاں مقصد کیا ہے۔ تیرا تو اپنا کوئی اختیار ہی نہیں ہے۔ پیدائش پر تجھے اختیار نہیں ہے۔ موت کا کچھ وقفہ کے لئے ملتوی کرنے کا تجھ کو اختیار نہیں ہے۔ جب کوئی ہستی چاہتی ہے تو، تو پیدا ہو جاتا ہے اور جب کوئی ہستی چاہتی ہے تو، تو مر جاتا ہے۔ اب لا محالہ ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ یہ گورکھ دھندا کیا ہے ہمیں پیدا کیوں کیا گیا۔ اگر ہمیں اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ کھانا کھائیں، ہماری اولاد ہو ہم ماں باپ بنیں۔ تو چڑیا بھی ماں باپ بن رہی ہے۔ چڑیا بھی کھا پی رہی ہے، چڑیا بھی سارے کام کر رہی ہے، چڑیا بھی عبادت کر رہی ہے۔ اگر انسان کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ گھر بنائے تو چڑیا بھی گھونسلہ بنا رہی ہے، چوہے بھی اپنا بل بناتے ہیں۔ عقل سلیم کے تحت جب انسان اپنا اور حیوانات کا موازنہ کرتا ہے کہ میں بھی پیدا ہو رہا ہوں، حیوان بھی پیدا ہو رہا ہے، میں بھی بچہ ہوں، حیوان بھی بچہ ہے۔ حیوان بھی جوان ہے، میں بھی جوان ہوں۔ حیوان بھی مر رہا ہے، میں بھی مر رہا ہوں تو اس کے پیچھے کیا بات ہے تو یہ جو تلاش ہے، اپنی تلاش اپنی روح کی تلاش، اپنے پیدا کرنے والے کی تلاش، کائنات کی تلاش، یہ جو ہے یہ سب طریقت ہے اس تلاش کے نتیجے میں جب آپ اس ہستی کو پہچان لیتے ہیں، اس ہستی سے واقف ہو جاتے ہیں، اس ہستی کا آپ تعارف حاصل کر لیتے ہیں جس ہستی نے آپ کو بنایا ہے، اس کا نام معرفت ہے۔ شریعت، طریقت اور معرفت یہ تینوں چیزیں اس طرح ہیں اب یہ کہ کوئی انسان شریعت کے بغیر حیوانات سے ممتاز نہیں ہو سکتا ہے۔ شریعت کے بغیر کسی انسان میں عقل سلیم نہیں پیدا ہوتی ہے مثال ہمارے سامنے ہے۔ ہمارے سامنے جو سائنس دان ہیں کیا ٹھکانہ ہے ان کے دماغوں کا کہ وہ آسمانوں میں بھی چلے گئے اور جین جیسی چیز انہوں نے دریافت کر لی لیکن چونکہ عقل سلیم ابھی پیدا نہیں ہوئی اس لئے ہر چیز کو وہ اتفاق کہتے ہیں۔ ہر چیز حادثاتی اور اتفاقی طور پر ہو گئی باوجود اس کے کہ نئے نئے انکشافات ہو رہے ہیں وہ اس بات کا برملا اظہار نہیں کرتے کہ کوئی ہستی ایسی ہے کہ

جس نے ہر چیز بنائی ہے وجہ یہ ہے کہ ان کا زندگی کا جو رہن سہن زندگی گزارنے کا ان کا جو پروگرام ہے اس میں پیغمبروں کی تعلیمات نہیں ہیں جن تعلیمات کا نام شریعت ہے۔ عقل سلیم حاصل کرنے کے لئے پیغمبروں اور حضور ﷺ کا دیا ہوا پروگرام ضروری ہے۔ شریعت کا علم اور عقل سلیم حاصل ہونے کے بعد کائنات کا کھوج لگانا ضروری ہے اور کائنات کا کھوج لگانے کے بعد اللہ کا عرفان ضروری ہے۔ بڑے پیر صاحب کا ایک بڑا مشہور واقعہ ہے وہ کہیں تشریف لے جارہے تھے کہ ایک دم آسمان میں چکا چوند ہوئی اور ذہن یں یہ بات آئی کہ میں نے نور دیکھا ہے، روشنی دیکھی ہے۔اس میں سے آواز آئی کہ اے عبدالقادر ہم نے تم پر نماز معاف کر دی۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ سوچ میں پڑ گئے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ حضور ﷺ کے اوپر تو نماز معاف نہ ہوئی جبکہ وہ معصوم بھی ہیں، میرے اوپر نماز کیسے معاف ہو گئی؟ اگر ان کو شریعت کا علم نہ ہوتا تو کبھی بھی ان کے ذہن میں یہ بات نہ آتی کہ حضور ﷺ معصوم ہیں اور جب ان کے اوپر نماز معاف نہ ہوئی تو کسی اور کے اوپر نماز کیسے معاف ہو سکتی ہے۔ انہوں نے کہا تو شیطان ہے۔ انہوں نے لاحول پڑھی پھر آواز آئی کہ تجھے تیرے علم نے بچا لیا۔ پھر یہ خیال آیا کہ حضور ﷺ کے متعلق یہ خیال اگر اللہ میرے ذہن میں نہیں ڈالتا تو میں کیسے بچتا میرا تو علم ناقص ہے اور یہ خیال میرے ذہن میں نہیں آتا۔ انہوں نے پھر توبہ استغفار کی تو بڑے پیر صاحب کے واقعے سے ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ جس طرح شریعت کا علم ہمارے لئے ضروری ہے اسی طرح طریقت کا علم بھی ضروری ہے۔ نماز ایک بنیادی رکن ہے 100 دفعہ نماز کے بارے میں قرآن میں تذکرہ آیا ہے۔ اب اس کے بعد جب آپ نے نماز کی نیت باندھی اب نماز میں اللہ تعالی کے ساتھ تعلق قائم ہو جانا یہ طریقت ہے۔ اگر اللہ تعالی کے ساتھ نماز میں تعلق قائم نہیں ہوا وہ قرآن پاک کے ارشاد کے مطابق ہر گز نماز نہیں ہے۔ اللہ قرآن پاک میں فرماتے ہیں۔۔۔۔۔۔

ترجمہ: اور ہلاکت ہے ان نمازیوں کے لئے جو اپنی نمازوں سے بے خبر ہیں۔ اللہ تعالٰی نے یہ نہیں کہ کہ ہلاکت ہے ان نمازیوں کے لئے جو نماز نہیں پڑھتے وہ تو بات ہی الگ ہے۔ نماز تو ایک رکن ہے بات تو یہ ہے کہ ہلاکت ہے ان نمازیوں کے لئے جو اپنی نمازوں سے بے خبر ہیں حالانکہ وہ نماز تو پڑھ رہے ہیں لیکن ان کو کچھ پتہ نہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں تو نماز کا پڑھنا اور نماز کے لئے کھڑے ہو جانا۔ نماز کے آداب پورے کرنا، یہ سب شریعت ہے اور نماز کے اندر ذہنی یکسوئی قائم ہو جانا اور اللہ تعالٰی کے ساتھ رابطہ قائم ہو جانا۔ حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق اللہ تعالی کو دیکھنا یا اللہ کا بندہ کو دیکھنا، اللہ کو پکارنا اور اللہ کا اس پکار کو سن کر جواب دینا یہ سب طریقت ہے۔ صرف اسلام قبول کر لینے سے کوئی انسان مومن کے درجہ پر فائز نہیں ہو سکتا۔ مسلمان ہو سکتا ہے اللہ تعالٰی نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے۔ "یہ کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں، مسلمان بے شک ہیں لیکن ابھی ان کے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا ہے۔"مسلمان ہونا شریعت پر عمل کرنا ہے۔ مسلمان ہونے کے بعد اللہ تعالی کے ساتھ رابطہ قائم کر لینا تمام ارکان کو پورے کرتے ہوئے یہ ایمان ہے اور ایمان کی تکمیل کے بعد جو مرحلہ ہے وہ عرفان ہے اور اللہ تعالی کی معرفت ہے تو یہ جو شریعت، طریقت اور تصوف کی بات ہے یہ کوئی لمبی چوڑی نہیں ہے، سیدھی سی بات ہے شریعت آداب ہیں اس راستہ پر چلنے کے

جو راستہ آدمی کو عرفان تک لے جاتا ہے۔ کیا سائن ہے، سگنل کہاں ہے، آپ سارے راتے چلتے رہیں گے منزل تک نہ پہنچیں گے۔ راستے کے آداب یہ ہیں کہ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ سڑک کدھر جاتی ہے اور اگر آپ دائیں بائیں مڑ گئے تو کہاں پہنچیں گے اور اگر آپ راستے کے آداب سے واقف نہیں ہیں تو آپ کا پہنچنا مشکوک ہے، پہنچ ہی نہیں سکتے۔ کبھی ادھر مڑ جائیں گے، کبھی ادھر مڑ جائیں گے۔ اھدنا الصراط المستقیم کا مطلب یہ ہے کہ "یا اللہ ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت دے۔" آپ سیدھے راستے کی ہدایت مانگتے ہیں۔ ہر نماز کی ہر رکعت میں آپ الحمد شریف میں پڑھتے ہیں تو جب آپ نماز کے لئے کھڑے ہو گئے تو کیا آپ صراط مستقیم پر نہیں ہیں، تو کیا آپ نماز پڑھنے کے باوجود سیدھے راستے پر نہیں ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ہم شریعت کے تمام تقاضے پورے کرتے ہوئے تیرے حضور میں کھڑے ہو گئے ہیں یا اللہ اب ہم کو طریقت کے راستے پر چلا تا کہ ہم طریقت کے راستے پر چلتے ہوئے آپ کا عرفان حاصل کر لیں اور ہمارے اوپر انعام کر ہمیں ان لوگوں میں شمار نہ کیجئے جن سے آپ ناراض ہیں بلکہ ہمیں ان لوگوں میں شمار کر لیجئے جن سے آپ راضی ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں مگر ابھی تو ان کے دلوں میں ایمان داخل ہی نہیں ہوا۔ تو اسلام لانا الگ چیز ہے اور ایمان دل میں داخل ہونا الگ چیز ہے۔ آپ دن میں کتنی بار دوسرا کلمہ پڑھتے ہیں جس کا مطلب گواہی دینا ہے۔ کیا آپ بغیر دیکھے گواہی دے رہے ہیں، جھوٹی گواہی دے رہے ہیں۔ آپ کی یہ دنیاوی اعتبار سے تو بغیر دیکھے گواہی تسلیم نہیں کی جاتی ہے۔ یہ دنیاوی معاملات بغیر دیکھے گواہی کے عدالت تسلیم نہیں کرتی تو اللہ آپ کی گواہی کیسے تسلیم کرے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ اللہ کو دیکھ چکے ہیں اور سب اس کی ربوبیت کا اقرار کر چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب آپ کو پیدا کیا تو الست بربکم کہہ کر اپنا دیدار آپ کو کرایا اور آپ نے دیکھ کر اس کی آواز سن کر یہ کہا قالو بلیٰ جی ہاں ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ آپ ہی ہمارے رب ہیں، آپ دیکھیں تو سہی۔ بات کیا ہے نظروں پر ہماری پردہ پڑا ہوا ہے۔ نفس کا پردہ۔ اسی کو حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔ تو اپنے آپ کو جان لو، پہچان لو اس پردہ کو دیکھ لو جس پردہ نے تم کو اور تمہارے رب کو الگ کر دیا ہے اور جیسے ہی تم اس پردہ کو ہٹاؤ گے رب تمہارے سامنے ہو گا۔ شریعت کے بغیر طریقت کی تکمیل نہیں ہوتی۔ شریعت اور طریقت کے بغیر عرفان کی تکمیل نہیں ہوتی۔ اپنے آپ کو پہچاننے اور اپنے رب کو پہچاننے کے لئے یہ تینوں چیزیں لازم وملزوم ہیں۔

سلطان کیا ہے؟

سوال: اے گروہ جنات اور انسان اگر تم نکل سکتے ہو تو آسمان اور زمین کے کناروں سے نکل کر دکھاؤ تم نہیں نکل سکتے مگر سلطان کے ساتھ۔ سلطان کیا ہے اور ہم اس کو کس طرح حاصل کر سکتے ہیں؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب: سورہ رحمٰن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔۔۔۔۔

ترجمہ: اے گروہ جنات اور اے انسانوں کے گروہ تم اگر زمین اور آسمان کے کناروں سے نکل سکتے ہو تو نکل کر دکھاؤ۔ اگر تم آسمانوں اور زمین کے کناروں سے باہر جا سکتے ہو تو جا کر دکھاؤ تم نہیں جا سکتے تم نہیں نکل سکتے مگر سلطان کے ذریعہ مطلب یہ ہے کہ آپ اگر سلطان حاصل کر لیں تو آپ زمین اور آسمانوں کے کناروں سے باہر جا سکتے ہیں۔

اس آیت مبارکہ میں بہت زیادہ غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ایک صورت اور ایک صلاحیت انسانوں کے اندر ایسی ہے کہ اگر وہ اس صلاحیت کو تلاش کر لیں اور اپنے اوراکو بیدار اور متحرک کر لیں تو انسان غیب کی دنیا میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اس آیت سے یہ بات ثابت ہے کہ اگر انسان کو سلطان حاصل ہو جائے تو وہ غیب کی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے۔ آسمان اور زمین کے کناروں سے تم نکل سکتے ہو آسمانوں کے کناروں سے نکلنا کیا معنی رکھتا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ کناروں سے باہر خلا ہے۔

جو چیز نظر نہیں آتی یا جس چیز کے بارے میں ہمیں علم نہیں ہے وہ غیب ہے جب زمین کے کناروں سے باہر اور آسمانوں میں ہیں غیب میں سات آسمانوں کے کناروں کے بعد عرش ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ اگر وہ سلطان حاصل کر لے تو زمین اور آسمانوں کے کناروں سے نکل جائے تو عرش اس کے سامنے آ جاتا ہے۔ عرش پر اللہ تعالیٰ اپنی صفات کے ساتھ قیام پذیر ہیں۔ اس کا مفہوم یہ نکلا کہ ہر بندہ اللہ کو دیکھ سکتا ہے۔ کچھ لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی کیسے دیکھ سکتا ہے۔ جبکہ موسیٰ علیہ السلام بھی نہیں دیکھ سکے جب کوہ طور پر اللہ تعالیٰ کی تجلی کا نزول ہوا تو موسیٰ علیہ السلام تجلی دیکھ کر بیہوش ہو گئے، نہیں دیکھ سکے تو ایک عام آدمی کیسے دیکھ سکتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے کچھ نہیں دیکھا تو وہ بیہوش کیسے ہو گئے۔ بہت زیادہ غور طلب بات ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ضرور لیکن موسیٰ علیہ السلام کا شعور

اس کو برداشت نہیں کر سکا۔اس لئے وہ بیہوش ہو گئے۔موسیٰ علیہ السلام کا بیہوش ہونا اس بات کی علامت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے تجلی کا دیدار تو کیا لیکن برداشت نہیں کر سکے۔

آپ 100 واٹ کا بلب دیکھتے ہیں اور دیکھنے کے عادی ہیں اور ایک دم آپ کے سامنے 5000 واٹ کا بلب روشن کر دیا جائے تو اس کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ آپ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ جائے گا۔لیکن پھر وہی بلب اگر آپ بار بار دیکھیں گے تو آپ عادی ہو جائیں گے۔موسیٰ علیہ السلام جب بھی اللہ تعالیٰ سے بات کرتے تھے تو وہ کوہ طور پر تشریف لے جاتے تھے۔اللہ تعالیٰ کی باتیں سنتے تھے لوگوں کے پیغام لے جاتے تھے لوگوں کے لئے جوابات لاتے تھے۔40 رات اور 40 دن انہوں نے کوہ طور پر قیام کیا اور تورات کتاب لائے اس بارے میں قرآن کریم کی آیات:

ترجمہ:اے گروہ جنات اور اے گروہ انسان کیا تم اس بات کی استطاعت رکھتے ہو کہ تم نکل جاؤ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل جاؤ تو اس آیت میں نکتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پہلے نہیں کہا حالانکہ بات زمین پر ہو رہی ہے لیکن اللہ پہلے سماوات کا تذکرہ کر رہے ہیں کہ کیا تم آسمانوں کے کناروں سے اور زمین کے کناروں سے نکل سکتے ہو۔

پہلے آسمان ہے اور پھر زمین ہے تم نہیں نکل سکتے مگر سلطان کے ذریعے سلطان کیا ہے۔سلطان انسان کے اندر اس کی اپنی روح ہے جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا۔پیدا کرنے کے بعد خود اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو انسان سے متعارف کرانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ کہا۔"الست بربکم" میں تمہارا رب ہوں۔جب انسانوں کے ذہن میں یہ آواز پڑی کہ میں تمہارا رب ہوں تو سارے انسانوں کے ذہن اس طرف متوجہ ہو گئے کہ یہ بولنے والی ہستی کون ہے یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے جب انسان اس آواز کی طرف متوجہ ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی ان کے سامنے موجود ہے تو انہوں نے دیکھ کر کہا۔"قالو بلیٰ" جی ہاں،آپ ہمارے رب ہیں۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ عالم ارواح میں ہماری روح نے اللہ تعالیٰ کی آواز بھی سنی اور اللہ تعالیٰ کو دیکھا بھی اور اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار بھی کیا۔پس ثابت ہوا کہ ہماری روح اللہ تعالیٰ کو پہلے سے دیکھے ہوئے ہے اور پہلے سے جانتی ہے اگر ہم اس روح کو تلاش کر لیں جس نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا تھا،اللہ تعالیٰ کی آواز سنی تھی اور اللہ تعالیٰ کو پہچان لیا تھا تو ہمارے اندر وہ صلاحیت منتقل ہو جائے گی اور اس صلاحیت ہی کا نام تو اللہ تعالیٰ نے سلطان رکھا ہے۔سلطان سے مراد یہ ہے کہ اگر تم اپنی روح کو تلاش کر لو اور اس روح کو جس روح نے عالم ارواح میں ہماری ربوبیت کا اقرار کیا ہے تو تم آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل سکتے ہو۔

مٹھاس کا استعمال

سوال: کتاب ''جنت کی سیر'' میں مراقبہ کے بارے میں پرہیز اور احتیاط کے سلسلہ میں پہلا نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ روحانی ترقی کے لئے مٹھاس کم سے کم استعمال کی جائے مگر آپ اکثر مٹھاس زیادہ استعمال کراتے ہیں اور نمک کم استعمال کرنے کا مشورہ دیتے ہیں؟ اس کی وضاحت کریں۔

جواب: روحانی ڈائجسٹ میں ہم بیماریوں کا علاج اور مسائل کا حل پیش کرتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ ہم جہاں پر بتاتے ہیں کہ نمک کم سے کم کر دیا جائے وہ روحانی تسکین کے لئے نہیں کہتے بلکہ نفسیاتی مریض کے لئے مشورہ دیتے ہیں۔ دماغی مریض، نفسیاتی مریض، پاگل پن کے مریض ان کے لئے ہم کہتے ہیں کہ نمک کم کر دو اور مٹھاس زیادہ کر دو اس کی وجہ یہ ہے کہ مٹھاس انسان کے زمینی شعور کو طاقت پہنچاتی ہے اگر مٹھاس کم ہو جائے تو انسان کا زمینی شعور کمزور ہو جاتا ہے۔ جب شعور کمزور ہو جاتا ہے تو بسا اوقات اسے ماورائی آوازیں آنے لگتی ہیں، ماورائی دنیا نظر آنے لگتی ہے۔ وہ اس آواز کے اپنے حساب سے معانی پہناتا رہتا ہے چونکہ عملی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا اس لئے یہ ایک قسم کا پاگل پن بن جاتا ہے جتنا کوئی آدمی مٹھاس زیادہ کھاتا ہے اسی مناسبت سے اس کے زمینی شعور میں کشش ثقل زیادہ ہو جاتی ہے اور پھر وہ دنیاوی زندگی زیادہ اچھی طرح گزارتا ہے۔ اس کے برعکس اگر اس کے اندر شک کی زیادتی ہو جائے تو اس کا شعور کمزور ہو جاتا ہے اور لاشعور متحرک ہو سکتا ہے۔ لاشعور متحرک (Active) ہونے سے دنیاوی کام میں خلل پیدا ہوتا ہے کیونکہ اس کے پیچھے کوئی استاد تو ہوتا نہیں ہے وہ اس میں اپنے ہی آپ معنی پہناتا رہتا ہے اس طرح وہ اپنے لئے پریشانی خرید لیتا ہے اور گھر والوں کے لئے بھی عذاب بن جاتا ہے۔ دماغی امراض، ٹینشن، ڈپریشن (اگر لو بلڈ پریشر نہ ہو)، مرگی، ہائی بلڈ پریشر، مرض استسقی، جلدی امراض، بے خوابی اور شیز و فرینیا میں نمک کا زیادہ استعمال بہت زیادہ مضر ہے۔ معالج کے مشورہ سے نمک کے استعمال میں احتیاط کرنا ضروری ہے۔

رویائے صدقہ

سوال: خیالی خواب اور حقیقی خواب میں کیا فرق ہے نیز یہ کہ انسان جب کسی کے بارے میں مسلسل سوچتا رہتا ہے تو وہ خیال کی صورت میں خواب میں نظر آ جاتا ہے اگر رجحان اچھی باتوں کی طرف ہے تو جو خواب دیکھتا ہے اس کو اچھا کہا جاتا ہے لیکن جب برے خیال خواب بنتے ہیں تو اس کو برا کہہ دیا جاتا ہے حالانکہ وہ بھی خیال ہی ہوتا ہے، ایسا کیوں ہے؟ وضاحت فرمائیں۔
جواب: کائنات میں کوئی بھی خیال، کوئی بھی واہمہ اور کوئی بھی تصور بے معنی نہیں ہے۔ ہر خیال کے دو قسم کے معنی نکلتے ہیں۔ اس خیال میں رحمانی قدروں سے متعلق معنی ہوتے ہیں یا خیالات شیطانی قدروں سے متعلق ہوتے ہیں۔ علوم کی دو قسمیں ہیں۔ شیطانی علوم اور رحمانی علوم۔

جتنے بھی پیغمبر اس دنیا میں تشریف لائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک انہوں نے ایک ہی بات کہی ہے کہ رحمانی علوم سیکھنے کے بعد ان پر عمل کرو تاکہ تم رحمان سے قریب ہو جاؤ۔ شیطانی علوم نہ سیکھو اور شیطانی علوم پر عمل بھی نہ کرو اس لئے کہ اگر تم نے شیطانی علوم پر عمل کیا تو شیطان سے قریب ہو جاؤ گے۔ ظاہر ہے کہ جو بندہ شیطان سے قریب ہو جائے گا وہ رحمان سے دور ہو جائے گا اور جو بندہ رحمان سے قریب ہو جائے گا وہ شیطان سے دور ہو گا۔ خواب خیال کی بات جو آپ نے پوچھی ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایک انسان کے خیال میں 24 گھنٹہ خیال رہتا ہے ''پیسہ پیسہ پیسہ'' اس کو پیسہ کی ہوس ہے تو خواب میں وہ دولت ہی دیکھے گا اور ایک آدمی کے ذہن میں اللہ کی محبت، پیغمبروں کی تعلیمات، اولیاء اللہ کی محبت ہو گی تو وہ ہر وقت اسی خیال میں رہے گا کہ اس کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت مل جائے۔ حضور ﷺ کا قرب نصیب ہو جائے، حضور ﷺ کی زیارت ہو جائے تو اس کے خواب بھی پاکیزہ ہوں گے۔ پیغمبروں نے شیطنت کو رد کیا ہے اور شیطانی خیال سے دور رہنے کی ہدایت کی ہے اور اللہ تعالیٰ سے قریب ہونے کے لئے اور رحمانی علوم سیکھنے کے لئے پوری نوع انسانی کو دعوت دی ہے۔ خواب کی دو طرزیں ہیں۔ ایک یہ کہ جو خیالات ہر وقت ذہن میں گشت کرتے رہتے ہیں وہ مسخ صورت ہو کر نظر آ جائیں۔ دوسری یہ کہ عالم بالا میں جو پاکیزہ خیالات گشت کر رہے ہیں وہ نظر آ جائیں۔ مسخ صورت خواب رویائے کا ذبہ اور حقیقی خوابوں کو رویائے صادقہ کہا جاتا ہے۔

باب دہم

دعا کے آداب

سوال: جنت کی سیر میں سید سعیدہ خاتون عظیمی نے ایک جگہ خواب بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ فرشتے جن دعاؤں کو مقبولیت کے قابل نہیں سمجھتے انہیں آسمان سے پھینک دیتے ہیں جبکہ ارشاد خداوندی ہے کہ لوگو مجھے پکارو، میں سنوں گا، مجھ سے دعا مانگو میں دوں گا۔ انسان خدا سے دعا کے ذریعہ مانگتا ہے۔ دعا کے ذریعہ خدا کو پکارتا ہے تو فرشتے دعا کو قابل قبول کیوں نہیں سمجھتے، آسمان سے کیوں پھینک دیتے ہیں؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب: بات سیدھی ہے کہ ہر چیز کے آداب اور اصول ہیں۔ دعا مانگنے کے بھی آداب ہیں کچھ بھی مانگنے کے اصول ہیں مثلاً بیٹا باپ سے کہے کہ ابے ابا پیسے نکال۔ ابا اسے پیسے نہیں دینگے بلکہ تھپڑ ماردیں گے اور کہیں گے کہ دور ہو جاؤ، دفع ہو جاؤ اور اگر وہی بیٹا یہ کہے کہ ابا جی مجھے پیسے چاہئیں، مجھے پیسوں کی ضرورت ہے تو ابا دو روپے کی بجائے اسے 5 روپے دے دیں گے۔ موجودہ دور میں جو دعائیں مانگی جاتی ہیں آپ اس پر ذرا غور کریں کہ اس کے اندر نہ گداز ہوتا ہے نہ عاجزی ہے نہ انکساری ہوتی ہے بلکہ ایک آرڈر ہوتا ہے کہ اللہ میاں یہ کردے، اللہ میاں یہ کردے، اس میں نہ ادب ہے، نہ احترام ہے، نہ گداز ہے، نہ یقین ہے تو وہ دعائیں فرشتے آسمان سے نیچے نہیں پھینکیں گے تو کیا کریں گے؟ میں 60 سال سے ایک بات سنتا ہوا آرہا ہوں کہ یا اللہ بنی اسرائیل کا بیڑہ غرق کر دے، حج میں بھی یہ دعا ہوتی ہے، ہر مسجد میں یہ دعا ہوتی ہے، ہر مدرسہ میں یہ دعا ہوتی ہے اور لاکھوں، کروڑوں آدمی آمین کہتے ہیں لیکن یہ دعا قبول نہیں ہوئی۔ 60 سال تو ہو گئے ہم کو سنتے ہوئے جتنا دعا مانگتے ہیں کہ بنی اسرائیل کا بیڑہ غرق ہو جائے اتنا ہی بنی اسرائیل کا عروج ہو رہا ہے۔ آخر کیا مطلب ہے؟ 60 سال کا عرصہ کسی دعا کے قبول ہونے کے لئے کم وقت ہے۔ کروڑوں مسلمان یہ دعا مانگ رہے ہیں کہ بنی اسرائیل کا بیڑہ غرق ہو جائے مگر بنی اسرائیل کا بیڑہ غرق نہیں ہوتا جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مجھ سے مانگو میں دوں گا، میں قبول کروں گا، تم دعا مجھ سے مانگو تو سہی۔ جب آپ دعا کے آداب ہی پورے نہیں کرتے، اللہ کے اوپر یقین ہی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ زبانی جمع خرچ کو نہیں مانتا۔ قرآن کریم میں ہے کہ اعمال سے قوموں کی تقدیروں میں ردوبدل ہوتا ہے۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ ہمارے اعمال ہی قرآن کے مطابق نہیں ہیں ہر آدمی جانتا ہے کہ جھوٹ بولنا گناہ ہے مگر وہ جھوٹ بولتا ہے۔ ہر آدمی جانتا ہے کہ کسی کی دل آزاری کرنا بہت بڑا پاپ ہے لیکن ہر شوہر بیوی کی دل آزاری کررہا ہے، ہر بیوی شوہر کی دل آزاری کررہی ہے۔ ماں باپ بچوں کی دل آزاری کررہے ہیں۔ آپ غور تو کریں کہ معاشرہ میں کس قدر برائیاں داخل

ہو گئی ہیں۔اس معاشرہ میں کیسے آپ کی دعا قبول ہو گی کس بات پر آپ اللہ تعالیٰ سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ آپ کی دعا قبول کرینگے۔مسلمان ہر وہ کام کر رہاہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ناپسند ہے۔جن لوگوں سے اللہ تعالیٰ کا تعلق ہے بلاشبہ اللہ ان کی دعا قبول کرتے ہیں۔ایسا نہیں ہے کہ سب کی دعائیں رد ہو جاتی ہیں،جن لوگوں کا اللہ تعالیٰ سے تعلق ہے اللہ تعالیٰ ان کی دعا قبول کرتا ہے۔میرا بیٹا سلام عارف عظیمی بتا رہا تھا کہ جامع مسجد راولپنڈی میں ایک مولوی صاحب تقریر کر رہے تھے۔انہوں نے دعا کرائی یااللہ ایسا کر کہ بنی اسرائیل کا بیڑہ غرق کر دے ایسا کر کہ کفار اس دنیا سے نیست ونابود ہو جائیں۔جوش خطابت میں کہنے لگے یااللہ بنی اسرائیل کی توپوں میں کیڑے ڈال دے یعنی توپ کو اللہ انسان بنادے،آٹا بنادے اور اس میں کیڑے ڈال دے۔یہ کتنی بڑی بے ادبی اور گستاخی ہے کہ آدمی کو یہ بھی پتہ نہیں کہ میں کس کے سامنے کھڑا ہوں اور کیا مانگ رہا ہوں تو دعا کیسے قبول ہو گی؟

دعا وہی رد ہوتی ہے جس کے ساتھ گداز نہ ہو،جس کے ساتھ دلی تعلق نہ ہو اور جس کے ساتھ یقین نہ ہو اگر دعا میں گداز ہے،اگر دعا میں آپ کا دل شامل ہے،اگر دعا کے ساتھ ساتھ یقین ہے تو وہ دعا ضرور قبول ہو گی۔حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خالی دعا کو نہیں مانتے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ پہلے عمل کرو پھر دعا کرو پھر میں قبول کروں گا۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہمارے سامنے ہے۔حضور ﷺ نے پہلے عمل کیا پھر دعا فرمائی۔آپ کو جتنے مجاہد میسر آئے انہیں لے کر میدان میں جہاد کے لئے تشریف لے گئے۔پھر عرض کیا اے میرے اللہ میں اتنے بندے ہی لا سکتا تھا۔اب آپ ہماری مدد کریں۔اللہ تعالیٰ نے دعا قبول کر کے فرشتے نازل کر دیئے تو بغیر عمل کے دعا قبول نہیں ہوتی۔عمل کے ساتھ گداز ہونا چاہئے۔یقین ہونا چاہئے تو ایسی دعائیں قبولیت کے درجہ پر فائز ہوتی ہیں۔

فیض کا حاصل ہونا

سوال: فیض سے کیا مراد ہے، مرشد جب اپنے مرید کو فیض منتقل کرتا ہے تو وہ کیا چیز منتقل کرتا ہے، کیا اس کا تعلق ماورائی لہروں سے ہے۔ ماورائی لہریں اگر منتقل ہوتی ہیں تو مرید کے اوپر کس قسم کے تاثرات قائم ہوتے ہیں؟

جواب: دوسرے علوم کی طرح روحانیت بھی ایک علم ہے۔ کوئی بھی استاد اپنے شاگرد کو علم منتقل کرتا ہے۔ جس طرح دنیاوی علوم کا استاد کسی کو اپنا علم منتقل کرتا ہے اسی طرح روحانی استاد اس کا نام پیر و مرشد ہو اس کا نام روحانی استاد ہو، بہر حال وہ روحانی استاد ہے۔ جس طرح دنیاوی علوم استاد اپنے شاگرد کو منتقل کر دیتا ہے اسی طرح روحانی استاد روحانیت منتقل کر دیتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دنیاوی علوم میں استاد کی جو طرز فکر ہے اس سے آدمی کافی حد تک متاثر ہوتا ہے اپنے استاد کی جو طرز فکر ہے اس کو قبول کر کے اس کے مطابق چلتا ہے لیکن جب روحانی استاد یا روحانی شاگرد کا تذکرہ آتا ہے اور کوئی روحانی استاد روحانیت منتقل کرتا ہے تو استاد کی طرز فکر منتقل ہو جاتی ہے مثلاً ایک روحانی آدمی کے لئے ضروری ہے کہ اس کا توکل اللہ کے اوپر ہو اس کے اندر استغناء ہو، جب اچھے حالات ہوتے ہیں اللہ کا شکر ادا کرتا ہے اور جب وہ خراب حالات سے گزرتا ہے تو اللہ سے رجوع کرتا ہے، اللہ سے معافی مانگتا ہے، استغفار کرتا ہے اور یہ بھی سوچتا ہے کہ اس میں بھی کوئی بہتری ہے، اب جو پریشانی لاحق ہے اس میں بھی اللہ کی طرف سے بہتری ہے لیکن ہم کمزور ہیں، ضعیف ہیں، ان پریشانیوں کو برداشت نہیں کر سکتے، آپ ہمیں معاف کر دیں، ہمارے لئے اچھا راستہ کھول دیں۔ مقصد یہ ہے کہ روحانیت ایک طرز فکر ہے اور روحانی علوم کا تعلق طرز فکر سے ہے اور وہ طرز فکر یہ ہے کہ روحانی آدمی کا ذہن ہمہ وقت اللہ کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ تمام پیغمبروں کی تعلیمات پر اگر غور کیا جائے اور الہامی کتابوں کا خلاصہ بیان کیا جائے تو ایک ہی حقیقت سامنے آئے گی کہ بندہ کا اللہ کے ساتھ ایک رشتہ ہے۔ ایک تعلق ہے۔ بندہ مخلوق ہے اور اللہ خالق ہے۔

جب بندہ اور اللہ کا رشتہ استوار ہو جاتا ہے تو بندہ اپنے ہر عمل کو اللہ کی طرف موڑ دیتا ہے۔ مثلاً اگر وہ کھانا کھاتا ہے تو کھانا کھانے کے بعد اللہ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو وسائل مہیا کیے، پہلے اچھا کھانا کھایا پھر یہ کہ اللہ نے مجھے اچھا ہاضمہ دیا، یہ نہیں ہوا کہ میں کھانا کھا کر قے کر دوں، کھانا کھا کر اسہال ہو جائیں۔ مطلب یہ کہ کھانا میں نے کھایا وہ پیٹ میں رہا اور ہضم ہوا اور اس کا خون بنا، خون سے انرجی بن کر جسم میں دوڑ رہی ہے۔ وہ مسلسل غور و فکر، صبر و شکر کے اعمال سے یہ جان لیتا ہے کہ زندگی میں بندہ کا اپنا

ذاتی عمل دخل کچھ نہیں ہے۔ایک آدمی کھانا کھاتاہے اگراندر کی مشینری بند ہو جائے اگر آنتیں چلنا بند ہو جائیں تو کھانا ہضم نہیں ہو گا۔بندہ کی یہ طرز فکر بن جاتی ہے کہ انسان دروبست اللہ کے تابع ہے اور جو بھی کچھ ہو رہاہے وہ اللہ کر رہاہے اور جو بھی کچھ اس کو مل رہاہے وہ اللہ کی طرف سے مل رہاہے۔ متقی لوگوں کی یہ پہچان ہے جن کا ایمان مکمل ہے وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ بھی ہے سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔

(القرآن)

اگراللہ بارش نہ برسائے زمین نہ بنائے اللہ دھوپ نہ نکالے اللہ چاند نہ نکالے اللہ زمین میں پانی نہ پیدا کرے تو زمین میں کوئی چیز اگ ہی نہیں سکتی۔آپ زمین نہیں بنا سکتے۔آپ پانی نہیں بنا سکتے۔آپ بیج نہیں بنا سکتے۔اگر گیہوں کا بیج زمین سے ناپید ہو جائے تو بتائیں کون سی ایسی سائنس ہے جو بیج بنادے گی۔جو بھی چیز آپ استعمال کرتے ہیں وہ بہر حال قدرت کی پیدا کردہ ہو گی۔ہم زمین کی پیداوار بڑھانے کے لئے کھاد استعمال کرتے ہیں اگر قدرت زمین میں وہ چیزیں پیدا نہ کرے جن سے کھاد بنتی ہے تو کھاد کیسے بن سکتی ہے؟ مثلاً آپ اپنی مرضی سے پیدا بھی نہیں ہو سکتے۔اگر اللہ نہ چاہے کون آدمی پیدا ہو سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ پیدائشی پاگل پیدا کردے کون سا ایسا علاج ہے جو پاگل پن کو صحیح کردے۔پاگل پن کا کوئی علاج ہی نہیں ہے۔نئی نئی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں مثلاً کینسر۔

کینسر کا ابھی تک علاج ہی دریافت نہیں ہوا ہے۔اتنے بڑے بڑے سائنس دان ہیں وہ کہتے ہیں ہم چاند پر چلے گئے، خلا میں چہل قدمی کر آئے ہیں اور یہ ہو گیا، وہ ہو گیا ہے۔ان کے بڑے سارے مر گئے وہ سائنسی ایجادات سے موت کے ہاتھ میں کیوں پنجہ نہ ڈال سکے؟ موت کو کیوں نہیں مار سکے۔جب ہم غور کرتے ہیں اپنی زندگی پر زمین کی زندگی پر آئندہ مستقبل کے اوپر ماضی کے اور اس کے سوا ہمیں کچھ نظر نہیں آتا کہ جو کچھ ہو رہاہے اللہ کے حکم سے ہو رہاہے اور اللہ کر رہاہے مثلاً جب بچہ پیدا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ ماں باپ کے دل میں محبت ڈال دیتاہے۔اگر ماں کے دل میں اللہ محبت نہ ڈالے تو بچہ کی پرورش ہی نہیں ہو سکتی۔

ماں چاہے بلی ہو، بکری ہو، بھینس ہو انسان کی ماں ہو جن کی ماں ہو کسی کی بھی ماں ہو ایک نظام ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے اس کی پرورش کے لئے،اس کی نشو و نما کیلئے اللہ ماں باپ کے دل میں محبت ڈال دیتاہے۔اگر اللہ ماں باپ کے دل سے محبت نکال لے تو کوئی بچہ پرورش نہیں پا سکتا۔پیدائش سے پہلے اللہ ماں کے سینہ کو دودھ سے بھر دیتاہے اس میں ماں کون سا کردار ادا کرتی ہے دودھ بنانے میں۔آپ جتنا بھی گہرائی میں تفکر کریں تو آپ کو ایک ہی بات نظر آئے گی کہ انسان کچھ نہیں کر رہاہے سب کچھ اللہ کر رہا ہے۔یہ انسان کی نادانی ہے کہ انسان سمجھ رہاہے کہ سب کچھ میں کر رہا ہوں، اچھا سب کچھ آپ کر رہے ہیں تو کاروبار میں نقصان کیوں ہوتا ہے، آپ بیمار کیوں ہوتے ہیں۔ حضرت علیؓ سے کسی نے پوچھا۔آپ نے اللہ تعالیٰ کو کیسے پہچانا تو انہوں نے فرمایا کہ ارادوں کی ناکامی سے جو نہیں چاہتا وہ ہوتاہے اور جو میں چاہتا ہوں وہ نہیں ہوتا۔

ارادہ تک تو آپ کو اختیار نہیں ہے۔ آپ دیکھتے ہیں آپ اپنی زندگی کا تجزیہ کریں بھوک ہے، بھوک خود لگتی ہے۔ کوئی آدمی بھوک پر کنٹرول حاصل نہیں کر سکتا کہ میں تو ساری زندگی روٹی نہیں کھاؤں گا ممکن ہی نہیں ہے کھانا کھانا پڑے گا اسے۔ میں پانی نہیں پیتا، پانی پینا پڑے گا اسے۔ مفہوم واضح ہے اگر اس کو زندہ رہنا ہے تو پانی پینا ہی پڑے گا۔ کوئی آدمی ساری زندگی سو نہیں سکتا۔ اٹھنا پڑے گا، کوئی آدمی ساری زندگی بیدار نہیں رہ سکتا، سونا پڑے گا۔ کوئی آدمی ساری زندگی بے کار نہیں بیٹھ سکتا، چلنا پڑے گا۔ کون سا ایسا مقام ہے آپ کی زندگی میں میری زندگی میں زمین کی زندگی میں کہ ہم کہہ سکیں کہ ہماری زندگی، ہماری اپنی ذاتی زندگی ہے۔

اس فلسفہ کو تو آپ عقلی توجیہہ اور دلیل کے ساتھ بیان بھی نہیں کر سکتے۔ آپ نہیں کہہ سکتے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے محتاج نہیں ہیں مثلاً سائنسی ایجادات، میزائل، ایٹم بم اور دوسری عام ایجادات ان کا تعلق کسی بھی شعبہ سے نہ ہو تو بارود نہ بنے گا، آپ ایک پٹاخہ بھی نہیں بنا سکتے۔ کوئی سائنس دان زمین بنا کر دکھا دے اور زمین کے اندر جتنی صلاحیتیں ہیں جتنی معادنیات ہیں وہ بنا کر دکھا دے۔ زمین کے اوپر پہلے سے موجود یورینیم دریافت ہوئی تو ایٹم بم بنا، اگر اللہ تعالیٰ زمین میں یورینیم نہ پیدا کرتے تو ایٹم بم نہیں بن سکتا تھا۔ اس میں لوہے کی ضرورت ہے لوہا نہ ہو تو میزائل تو بڑی بات ہے آپ کیل بھی نہیں بنا سکتے۔ جتنی بھی کائنات میں چیزیں ہیں اور جتنی بھی ایجادات اور ترقی ہوئی ہے، آدم سے لے کر اب تک اس میں وسائل ضرور زیر بحث آئیں گے۔ زمینی وسائل کو اگر آپ نظر انداز کر دیں تو کوئی ایجاد ممکن نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ خود چاہتے ہیں کہ نئی نئی ایجادات ہوں وہ خود دعوت دے رہے ہیں کہ سائنس دان وسائل استعمال کریں۔ قرآن پاک میں اللہ میاں کا یہ ارشاد پڑھیں۔۔۔۔۔ہم نے لوہا اس لئے نازل کیا ہے کہ لوگ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔ اب آپ دیکھیں آپ جہاں بیٹھے ہیں وہاں آپ کو دس جگہ لوہا نظر آئے گا۔ چھت میں لوہے کا گاڈر، دروازہ میں کنڈی، چھپکا، کھڑکی میں گرل، کنویں کے اوپر ڈول کھینچنے کے لئے چرخی، پانی لے جانے کے لئے پائپ، زمین کھودنے کے لئے بیلچہ، گینتی، کھرپا، باڑ کاٹنے کے لئے لوہے کی بڑی ساری قینچی اور جناب لوہے سے مراد دھات ہے اس میں المونیم بھی ہے، تانبا بھی ہے، پیتل بھی۔ اگر تمام دھاتوں کا ایک نام لوہا رکھ لیا جائے تو آپ دیکھیں گے کہ ہر جگہ لوہے کا استعمال آپ کو ملے گا۔ ایٹم بم میں، میزائل میں، ریل کی پٹڑی میں، پانی کے جہاز میں، وغیرہ وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ خود کہہ رہے ہیں کہ میں نے جو وسائل پیدا کر دیئے ہیں ان کو تم استعمال کرو اور یہ وسائل اس لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ ان کے استعمال سے انسان نئی نئی ایجادات کرے۔ غرض یہ کہ زمین پر کچھ بھی تخلیق ہو اللہ کے بنائے ہوئے وسائل سے ہی تخلیق ہوتی ہے۔

روحانی استاد جو علم منتقل کرتا ہے وہ یہ ہے کہ بندہ کا اللہ تعالیٰ سے ایسا ربط اور تعلق قائم ہو جائے کہ بندہ بہترین غذا کھائے، بہترین لباس پہنے، بہترین گھر میں رہے، بہترین خوشبو، بہترین باغ لگائے۔ درختوں کے سائے میں طیور کی آوازیں سنے، ہوا سے جھومتے درختوں کے ساز سنے لیکن ذہن اللہ سے ادھر ادھر نہ ہو۔

مثال: آپ دن بھر کام کرتے ہیں۔ کھانا بھی کھاتے ہیں۔ چلتے بھی ہیں، گاڑی میں سفر کرتے ہیں، دفتر بھی جاتے ہیں لیکن دن کی روشنی میں آپ کا ذہن کبھی نہیں بٹتا، اختیاری طور پر یا غیر اختیاری طور پر اگر دن کی روشنی سے آپ کا ذہن ہٹ جائے تو آپ کے سامنے تاریکی آجائے گی اور آپ چل پھر سکیں گے نہ پڑھ سکیں گے۔ رات ہوتی ہے، رات کی تاریکی بھی ایک روشنی ہے، جتنے رات کے کام ہیں مثلاً سونا، آرام کرنا، ذہن کا سکون وغیرہ وغیرہ۔ اگر رات کی روشنی سے آپ کا ذہن ہٹ جائے تو آپ رات کے کام نہیں کر سکتے۔ ہماری زندگی کا تجربہ ہے کہ ہم دن میں رہتے ہوئے اختیاری طور پر اور غیر اختیاری طور پر روشنی سے الگ نہیں ہو سکتے۔ تو ایسی صورت میں جس اللہ نے روشنی بنائی ہے اس اللہ سے ہم کیوں رشتہ نہیں رکھ سکتے۔ دراصل یہ ایک پریکٹس ہے اس بات کی کہ ہمارا ذہن یہ جان لے کہ ہم روشنی میں چل رہے ہیں، روشنی میں کھا رہے ہیں، روشنی میں لکھ رہے ہیں، روشنی میں سو رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ روشنی ہمارے اوپر محیط ہے۔

روحانی استاد جو اپنے شاگرد میں ایسی طرز فکر منتقل کر دیتا ہے کہ وہ کچھ بھی کرے شادی کرے، بچوں کی تربیت کرے، کاروبار کرے، جس طرح دن کی روشنی اس پر محیط رہتی اور وہ سارے کام کرتا ہے اس طرح اللہ تعالیٰ اس پر محیط ہو جاتا ہے اور قرآن پاک کی ان آیات کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

ترجمہ: ''اللہ ہر چیز پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔''

دنیاوی علوم اور روحانی علوم میں بنیادی فرق یہ ہے کہ روحانی استاد اگر اس کو روحانیت آتی ہے تو مرید کو وہ طرز فکر منتقل کر دیتا ہے جس طرز فکر میں آپ کا اور اللہ کا براہ راست رشتہ قائم ہے۔ آپ کچھ بھی کریں، جہاں بھی جائیں آپ کا ذہن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہٹے گا اور آپ کے اندر یہ طرز فکر منتقل ہو جائے گی تو ظاہر ہے آپ کو اللہ تعالیٰ سے جتنی قربت منتقل ہو گی اتنے ہی آپ اللہ کے دوست بن جائیں گے، اللہ کے قریب ہو جائیں گے۔ دوستی کسے کہتے ہیں؟ دوستی کا مطلب ہے قربت اور دشمنی کا مطلب ہے دوری۔ جب آپ اللہ تعالیٰ سے قریب ہو گئے واللہ کے دوست ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمادیا ہے کہ:

ترجمہ: ''اللہ کے دوستوں کو غم و خوف نہیں ہوتا۔'' آپ کی زندگی جو دوزخ بنی ہوئی ہے اگر اللہ تعالیٰ سے قربت حاصل ہو جائے تو یہ ساری زندگی جنت بن جائے گی۔

جنت کیا ہے؟ جنت کی خصوصیت یہ ہے کہ جنت میں تجلی کا دیدار ہو گا۔ اگر جنت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار نہ ہو تو جنت کا کوئی مصرف نہیں رہے گا۔ دوزخ اللہ تعالیٰ سے دوری کا نام ہے تو اس دنیا میں آپ اللہ تعالیٰ سے قریب ہو گئے تو اللہ تعالیٰ سے آپ کا رشتہ اس طرح جڑ گیا کہ آپ کھا رہے ہیں تو اللہ آپ کے سامنے ہے جیسے دن کی روشنی آپ کے سامنے ہے۔ پہن رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ آپ کے

سامنے ہے جیسے دن کی روشنی آپ کے سامنے ہے۔ آپ کاروبار کر رہے ہیں تو آپ کے سامنے اللہ ہے جیسے دن کی روشنی یا رات کی تاریک روشنی آپ کے سامنے ہے۔

حضورﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ہر آدمی اپنی جنت دوزخ ساتھ لئے پھرتا ہے۔ مخلوق میں سے قریب ترین بندہ اللہ کا اگر کوئی ہوتا ہے تو وہ پیغمبر ہوتا ہے۔ پیغمبروں کی طرز فکر جب آپ کو منتقل ہو گی تو آپ بھی اللہ تعالیٰ سے قریب ہو جائیں گے۔ روحانی استاد کا یہ بہت بڑا وصف ہے کہ وہ اپنے شاگرد کے اندر وہ طرز فکر منتقل کر دیتا ہے جو طرز فکر اس کو حضورﷺ سے منتقل ہوئی ہے۔

نماز کی اقسام

سوال: روحانی علوم کے حصول کے لئے مراقبہ کرنا کیوں ضروری ہے۔ کیا مراقبہ کے بغیر بھی یہ علوم حاصل ہو سکتے ہیں؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے انواع و اقسام کی مخلوقات پیدا کیں اور ہر نوع کی تخلیق کا کچھ نہ کچھ مقصد رکھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق بھی خاص مقصد کے تحت کی جب اللہ تعالیٰ تنہا تھا تو وہ ایک چھپے ہوئے خزانے کی طرح تھا اس نے چاہا کہ کوئی اسے جانے، کوئی اسے پہچانے، کوئی اس کی بزرگی کو مانے اور کوئی اس کی عظمت کا اعتراف کرے۔ اسی مقصد کے تحت اللہ تعالیٰ نے انسان کو تخلیق کیا تاکہ انسان اس کی عظمت و کبریائی کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی نیابت کا بوجھ اٹھا لے۔ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو علم الاسماء سکھائے یعنی اپنی صفات کا علم عطا کیا تاکہ انسان نیابت کے فرائض بااحسن طریق پورے کر سکے۔

آدمؑ نے نافرمائی کی تو جنت سے نکالے گئے۔ اس نافرمانی کے نتیجہ میں انہیں جو اللہ کی قربت اور عرفان حاصل تھا، وہ بھی متاثر ہوا۔ آدمؑ نے نافرمانی کی معافی مانگ لی اور اللہ تعالیٰ نے معاف بھی کر دیا مگر جنت سے نکالے جانے کی وجہ سے قربت اور عرفان جو متاثر ہوا تھا اس کا پوری طرح ازالہ نہ ہو سکا۔ یہی کیفیت نسل آدم کو ورثہ میں ملی۔

اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو پیدا ہی اس مقصد کے لئے کیا تھا کہ انسان اس کی ذات وصفات سے واقف ہو جائے۔ اس کا عرفان حاصل کر لے مگر نافرمانی کی وجہ سے اس وصف سے محروم ہو گیا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کو معرفت حاصل کرنے کا ایک پروگرام عطا کیا۔ اس پروگرام کے نتیجے میں انسان کی اللہ تعالیٰ تک رسائی ہونے لگی۔ اس پروگرام کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے اس میں دو باتیں بہت اہم اور ضروری ہیں۔ ’’قائم کرو صلوٰۃ اور ادا کرو زکوٰۃ‘‘ اس پروگرام کے دو جزو ’’نماز اور زکوٰۃ‘‘ ہیں یہ روح اور جسم کا وظیفہ ہیں، وظیفہ سے مراد وہ حرکت ہے جو زندگی کو قائم رکھنے کے لئے لازمی ہے۔ نبیکریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

’’جب تم نماز میں مشغول ہو تو یہ محسوس کرو کہ ہم اللہ کو دیکھ رہے ہیں یا یہ محسوس کرو کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھ رہا ہے۔‘‘

اس ارشاد سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نماز میں اعضاء کی حرکت کے ساتھ ساتھ ذہن کا اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا بھی ضروری ہے۔ صرف قیام، رکوع و سجود ہی نماز نہیں بلکہ ذہن کا اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہونا اصل میں نماز ہے۔

اس طرح نماز دو قسم کی ہو گئی۔ ایک نماز تو ایسی ہو گئی جس میں انسان اللہ تعالیٰ کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے۔ جس کے بارے میں قرآن کریم میں آیا ہے:

''اور وہ لوگ جو نمازی ہیں اور اپنی نمازوں سے بے خبر ہیں، ایسی نمازیں ان کے اپنے لئے ہلاکت اور بربادی بن جاتی ہیں۔''

(سورۃ الماعون)

عام طور پر ہوتا ہی یہی ہے کہ ادھر نیت باندھی اور ادھر دماغ میں فلم چلنے لگی۔ جسم نماز کے لئے موجود ہوتا ہے مگر دماغ غیر حاضر رہتا ہے۔ دماغ ادھر ادھر کی باتیں سوچتا رہتا ہے اگر جماعت میں شریک ہے تو یہ نہیں پتہ چلتا کہ امام نے کیا قرأت کی اور اگر تنہا پڑھ رہا ہے تو خود کیا پڑھا۔ بعض دفعہ رکوع و سجود میں گڑبڑ ہو جاتی ہے کہ بندہ نماز میں ہوتے ہوئے بھی نمازوں سے غافل ہوتا ہے۔

ان ہی نمازوں کو انسان کے لئے ہلاکت و بربادی کہا گیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسی نمازیں انسان میں بہت سے نقائص پیدا کر دیتی ہیں۔ مثلاً

ایسے نمازی کے ذہن میں یہ بات جم جاتی ہے کہ وہ چونکہ پابندی سے نماز پڑھتا ہے اس لئے اسے اللہ کی خصوصی توجہ حاصل ہے۔
(2) اس کے ذہن میں یہ غرور پیدا ہو جاتا ہے کہ جو لوگ نمازی نہیں ہیں وہ اس سے کمتر ہیں۔

(3) ایسے نمازیوں پر شیطانی غلبہ زیادہ ہوتا ہے۔

(4) یہ لوگ جنس سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔

(5) ایسے لوگ قنوطیت کا شکار جلد ہو جاتے ہیں۔

(6) ان کے اندر ذہنی وسعت نہیں ہوتی۔ ذہن محدود دائرے میں بند ہوتا ہے۔

(7) ایسے لوگ اچھائی پر آمادہ دیر سے ہوتے ہیں اور برائی سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں۔

(8) غیر نمازی کتنے ہی اچھے کام کریں کتنی ہی نیکی کے کام انجام دیں ان کی نظر میں یہ لوگ برے ہی ہوتے ہیں۔

(9) غافل نمازی جب دعا مانگتے ہیں تو یہ سمجھ کر کہ چونکہ وہ نمازی ہیں اس لئے ان کی دعا قبول ہو جائے گی مگر عدم قبولیت کی صورت میں سارا الزام اللہ پر ڈالتے ہیں۔

مندرجہ بالا نماز ایسی نماز ہوتی ہے جسے نفس کی نماز کہنا چاہئے۔ ایسی نمازوں سے فائدے کی بجائے الٹے نقصانات ہوتے ہیں۔ دوسری نماز وہ ہے جس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ''میں نے تمہاری امت پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں اور میں نے اس کا ذمہ لے لیا ہے جو شخص ان پانچ نمازوں کو ان کے وقت پر ادا کرنے کا اہتمام کرے اس کو میں اپنی ذمہ داری پر جنت میں داخل کروں گا۔''

وہ نمازیں جو خشوع وخضوع اور حضوری کے ساتھ پڑھی جائیں اللہ تعالیٰ نے ایسی ہی نمازوں کی ذمہ داری لی ہے اور ایسے ہی نمازیوں کو جنت میں داخل کرے گا۔ ایسی نمازوں کو حق کی نمازیں کہنا چاہئے۔ جو لوگ حق کی نمازیں پڑھتے ہیں انہی کے لئے نماز رحمت کا سبب بنتی ہے۔ حق کی نماز پڑھنے والے آدمی کے بارے میں ہے کہ جب ایسا آدمی نماز کے لئے قیام کرتا ہے تو جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ نمازی اور اللہ کے درمیان تمام پردے ہٹ جاتے ہیں۔ ایسی ہی خضوع وخشوع اور حضوری نماز میں جب بندہ سجدہ کرتا ہے تو اس کا سر اللہ تعالیٰ کے قدموں میں ہوتا ہے۔ نہ صرف اللہ کی قربت کا احساس ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات اس کا لمس بھی محسوس ہوتا ہے۔ ایسی ہی نماز کو مومنوں کی معراج کہا گیا ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جب نماز قائم کرنے کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو ان کے اوپر شدت سے رقت طاری ہو جاتی تھی اور گداز سے معمور فضا میں غیر مسلم عورتیں اور بچے بھی رونے لگتے تھے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ قیام صلوٰۃ میں اتنے زور سے روتے تھے کہ رونے کی آواز پچھلی صف تک پہنچتی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ران میں ایک تیر لگا اور آر پار ہو گیا جب تیر نکالنے کی کوشش کی گئی تو آپ کو بہت تکلیف محسوس ہوئی۔

کسی صحابی نے مشورہ دیا کہ تیر اس وقت نکالا جائے جب آپؓ نماز میں ہوں۔ چنانچہ آپ نے نماز کی نیت باندھی اور اس حد تک یکسو ہو گئے کہ گرد وپیش کی کوئی خبر نہ رہی۔ تیر کو نہایت آسانی کے ساتھ نکال کر مرہم پٹی کر دی گئی اور آپؓ کو تکلیف کا قطعاً احساس نہ ہوا۔

حضرت زین العابدین ایک روز مسجد میں نماز ادا کر رہے تھے کہ یکایک مسجد کے چھپر میں آگ لگ گئی اور آناً فاناً بھڑک اٹھی لیکن آپ بدستور نماز میں مصروف رہے۔ یہ واقعہ دیکھ کر لوگ جمع ہو گئے۔ بہت شور مچایا لیکن آپ کو خبر تک نہ ہوئی۔ جب آپ نماز

سے فارغ ہوئے اور باہر تشریف لائے تو لوگوں نے عرض کی کہ حضرت ہم نے تو اتنی زور زور سے آوازیں دیں لیکن آپ نے پرواہ تک نہ کی۔ آپ نے فرمایا کہ تم مجھے دنیا کی آگ سے بچانے کی کوشش کر رہے تھے مگر میں اس وقت خدا کے دربار میں کھڑا تھا۔

حضرت سفیان ثوری رضی اللہ عنہ ایک دن خانہ کعبہ کے قریب قائم الصلوٰۃ تھے جب آپ سجدے میں گئے تو کسی دشمن نے پاؤں کی انگلیاں کاٹ دیں۔ سلام پھیرا تو خون پڑا ہوا دیکھا اور پھر پاؤں میں تکلیف محسوس کی۔ تب آپ کو معلوم ہوا کہ کسی شخص نے انگلیاں کاٹ ڈالی ہیں۔

حضرت ابوالخیر اقطع رحمتہ اللہ علیہ کے پاؤں میں آکلہ تھا۔ طبیبوں نے مشورہ دیا کہ پاؤں کٹوا دینا چاہئے مگر وہ راضی نہ ہوئے آپ کے مریدوں نے طبیبوں سے کہا کہ نماز کی حالت میں ان کا پاؤں کاٹ دیا جائے کیونکہ اس وقت انہیں اپنی خبر نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ پاؤں کٹا ہوا تھا۔

ان واقعات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حق کی نماز ادا کرنے والے کس طرح ذہنی یکسوئی، حضوری اور خضوع و خشوع کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری دیتے ہیں۔ اس وقت ان کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔

غافل نمازی نفس کی نماز پڑھنے والا کس طرح حق کی نماز ادا کرنے والے کے برابر ہو سکتا ہے۔ ایک آدمی امانت رکھتا ہے مگر خیانت کرتا ہے دوسرا آدمی نہ امانت رکھتا ہے نہ خیانت کا مرتکب ہوتا ہے۔

نماز میں جو خضوع و خشوع اختیار نہیں کرتا جس کا ذہن ادھر ادھر بھٹکتا رہتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہو کر دوسری طرف مصروف ہو۔ اللہ تعالیٰ کس طرح اس کو معاف کرے گا وہ تو اللہ کا مجرم ہے اسے اللہ کی رحمت کس طرح حاصل ہو گی۔ ترک صلوٰۃ والے کو تو ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ معاف کر دے مگر غافل نمازی کی تو اپنی نمازیں ہی ہلاکت کا سبب بن جائیں گی۔

ذہنی یکسوئی کے لئے مراقبہ کی مشق کی جائے اور جب ذہنی یکسوئی کی عادت ہو جائے تو پھر وہ نماز آسانی سے ادا کی جا سکتی ہے جس کے ذریعہ عرفان حاصل کیا جا سکتا ہے اور غیب کی دنیا سے واقفیت حاصل کی جا سکتی ہے۔

بیعت کا قانون

سوال: ایک بندے کو بیعت کتنی عمر میں کرنی چاہئے۔ کیا بیعت ہونا ضروری ہے؟ کیا ایک شخص دو جگہ بیعت ہو سکتا ہے؟ تصوف کے حوالے سے روشنی ڈالیں۔

جواب: سوچنے کی بات یہ ہے کہ بیعت ہونا ضروری بھی ہے کہ نہیں؟ کس عمر میں بیعت کرنی چاہئے' یہ ایک الگ بات ہے۔ لیکن پہلی بات یہ کہ ایک آدمی ضرور کسی سے بیعت ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ فی الواقع بیعت کیا چیز ہے۔ یہ دو باتیں زیادہ غور طلب ہیں عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ کوئی ایسا آدمی جو کسی صورت سے ماورائی علوم جانتا ہو یا اسے بزرگوں سے کوئی علم منتقل ہوا ہو یا وہ گدی نشین ہو تو اس کی اگر سرپرستی حاصل کر لی جائے تو دنیاوی کام بہت سے آسان ہو جاتے ہیں اور آدمی بلاؤں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ عام تصور یہ ہے کہ بغیر بیعت آدمی ایسا ہے جس کے سر پر سائبان نہ ہو۔ اگر بیعت اس لئے کی جاتی ہے کہ اس کے دنیاوی کام ہوتے رہیں اور بلاؤں سے نجات ملتی رہے یا اللہ تعالیٰ بیعت کے ذریعہ سے اس کو اپنے حفظ و امان میں رکھتے ہیں تو یہ بات صحیح نہیں ہے۔ بیعت ہونا کوئی ضروری بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کی حفاظت کرتے ہیں۔

بیعت دراصل ایک اصطلاح ہے۔ ''خود کو بیچ دینا، فروخت کر دینا۔'' بیع معنی ہے خرید و فروخت کے۔ قرآن کے لفظ بیعہ سے یہ بڑا مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے کہ جب آدمی کسی کا مرید ہو جاتا ہے کسی کے ہاتھ پر بیعت کر لیتا ہے تو آدمی یہ سمجھ لیتا ہے کہ بھئی یہ تو میرا زر خرید ہو گیا ہے۔ اس نے خود اپنی مرضی سے اپنے آپ کو میرے ہاتھ میں بیچ دیا ہے جو بیعت کی اصطلاح کے تحت آتی ہے۔ پتہ نہیں کہاں سے یہ لفظ نکلا بہر حال اس لفظ کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ جیسا کہ اس کو کہا جاتا ہے۔ ہمارے حضور قلندر بابا اولیاء رحمتہ اللہ علیہ نے اس اصطلاح کو یعنی بیعہ کی اصطلاح کو ایک آدمی دوسرے کسی آدمی کے ہاتھ بیچ دے اس کو ختم کر دیا ہے۔ ہمارے سلسلہ کے جو قواعد و ضوابط ہیں ان قواعد و ضوابط میں ایک بات یہ بھی ہے کہ کوئی ایسا آدمی جو سلسلہ عظیمیہ میں کسی لائق ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ دوسرے لوگوں کو فیض پہنچائیں گے اس کے اوپر لازم ہے کہ وہ کسی آدمی کو اپنا مرید نہ کہے بلکہ دوست کہے۔ ایک آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے آزاد پیدا کیا وہ کیوں کسی دوسرے آدمی کے ہاتھوں خود کو فروخت کرے۔ اس کے جو لفظی معنی ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ بیعت دراصل ایک روحانی شاگردی ہے، کسی علم کو سیکھنے کے لئے جب کسی روحانی استاد کا آپ انتخاب

کرتے ہیں پھر استاد کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق عمل کرنے کا عہد کیا جاتا ہے تو یہ بیعت کہلاتی ہے کیونکہ کسی بھی علم کو حاصل کرنے کے لئے آپ کو استاد کی ہدایات کے مطابق عمل کرنا ہوگا ورنہ آپ علم نہیں سیکھ سکتے اور اگر آپ روحانی علوم سیکھنا نہیں چاہتے تو بیعت ہونا کوئی ضروری نہیں۔ حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے پاس جب لوگ آیا کرتے تھے تو وہ فرمایا کرتے تھے کہ دیکھو بھئی کوئی کام ہو تو بتادو۔ ہمارے سے استاد شاگردی کا رشتہ نہ استوار کرو ورنہ پریشانی ہوگی دوست بناؤ ہمیں، جو تمہارا کام ہے کہو ہم دعا کریں گے اللہ تعالیٰ پوری کریں گے۔ بیعت تو ہمارے یہاں سلسلہ عظیمیہ میں سرے سے ہے ہی نہیں۔ اس کو ہم اس طرح سے سمجھتے ہیں کہ انسان کی جو عظمت ہے آزادی کی وہ ایک طرح سے اس کو مجروح کرنے والی بات ہے اب یہ کہ کس عمر میں آپ شاگردی اختیار کریں تو روحانی علوم سیکھنے کے لئے عمر کی کوئی خاص قید نہیں ہے۔ جس طرح اور علوم حاصل کرنے کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں ہے اسی طرح روحانی علوم سیکھنے کے لئے بھی عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔ عام طور سے پانچ چھ سال کی عمر کے بچے کو آپ سکول میں داخل کراتے ہیں اس کے بعد وہ پڑھتا ہے، لکھتا ہے اس کا ایک شعور بن جاتا ہے۔ جب بھی وہ شعور کے دائرہ میں داخل ہو اور وہ یہ جاننا چاہتا ہو کہ روحانیت کیا ہے تو کسی بھی عمر میں وہ اپنا روحانی استاد بنا سکتا ہے اور روحانی شاگرد بن سکتا ہے۔ ہمارے یہاں یہ صورت ہے ہم نے عظیمیہ سلسلہ کا جو فارم بنایا ہے اس میں ہم یہ کوشش کرتے ہیں کہ ایسے لوگوں کو سلسلے میں داخل کریں کہ جن کے شعور میں پختگی آگئی ہو ایسا نہ ہو کہ ہم نے ان کو اسکول میں داخل کر لیا، تھوڑے دنوں کے بعد وہ چھوڑ کر چلے گئے تو اس کی اپنی محنت بھی ضائع ہوگئی تو عام طور سے لڑکیوں میں سولہ سال کے بعد اور لڑکوں میں اٹھارہ سال کے بعد شعور میں پختگی آ جاتی ہے۔ ہم اس بات کا خیال کرتے ہیں کہ آدمی کا شعور بالغ ہو جائے تاکہ جب وہ ایک دفعہ فیصلہ کرلے تو اس پر قائم رہے تاکہ اس کے ذہن میں کوئی اختلافی بات آئے تو وہ متزلزل نہ ہو جائے۔ کسی بھی علم کو سیکھنے کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں ہے صرف اس بات کو مدنظر رکھا جاتا ہے کہ اس کا شعور فیصلہ کرنے کے قابل ہو تو وہ استاد اور شاگرد کا رشتہ قائم کر سکتا ہے۔

نیگیٹیو بینی

سوال: آپ اکثر لوگوں کو مختلف تکالیف کے ازالے کے لئے نیگیٹیو بینی کا مشورہ دیتے ہیں۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ نیگیٹیو دیکھنے سے کیا فائدہ ہوتا ہے؟

جواب: دنیا میں کوئی بھی طریقہ علاج ہو ایلو پیتھی، یونانی، ہومیو پیتھی یا ایکو پنکچر وغیرہ ہر طریقہ علاج کے پیچھے ایک تھیوری ہوتی ہے اور اس تھیوری کے پس منظر میں لوگوں کا تجربہ ہوتا ہے۔

کوئی آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ بخار کونین کی ایک گولی کھا لینے سے کس طرح اتر جاتا ہے۔ تو ظاہر ہے اس کا جواب یہی ہو گا کہ اس دوا میں بخار کو کم کرنے کی تاثیر موجود ہے۔ اسی صورت سے ایکو پنکچر ایک طریقہ علاج ہے اور چائنا میں ہزاروں سال سے رائج ہے انہوں نے جسم پر کچھ پوائنٹ (Points) مقرر کئے ہوئے ہیں۔ سوئی سے ان پوائنٹس کو چھیڑا جاتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک پوائنٹ سے دوسرا پوائنٹ چونکہ جڑا ہوا ہے تو سوئی کی نوک جب ایک سرے پر لگتی ہے تو جسم کے اندر ایک خاص قسم کا کرنٹ Flow ہوتا ہے آپ نے دیکھا ہو گا کہ پیر میں سوئی لگتی ہے تو پورے دماغ میں جھنجھناہٹ سی ہوتی ہے۔ کبھی آپ کو چیونٹی کاٹ لے تو دماغ میں جھنجھناہٹ سی محسوس ہوتی ہے۔ جس سسٹم کے اوپر یہ جسم قائم ہے اس سسٹم کو چھیڑ دینے سے Chemical Changes پیدا ہوتی ہیں اور ان کیمیاوی تبدیلیوں کی بنیاد پر انسانی جسم میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔

اسی صورت سے یونانی علاج ہے انکا طریقہ علاج یہ ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ صاحب جسم کی اندر اگر کچھ ایسی رطوبتیں جمع ہو جائیں جن کا خارج ہونا ضروری ہو تو اس سے کئی قسم کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں جن سے یعنی اس طریقہ علاج میں جو اخلاط زائد ہو جائیں ان کا تدارک کیا جاتا ہے۔ اب یہ بھی سوال ہے کہ جڑی بوٹی جسم میں جا کے کیسے خلط کو صاف کر دیتی ہے۔ اس کا بھی جواب یہی ہے کہ ہر جڑی بوٹی کے اندر اپنی ایک خاصیت ہوتی ہے۔ اس خاصیت کی بنیاد پر جسم کے اندر جو زائد رطوبتیں ہوتی ہیں وہ نکال دیتی ہیں اور جن چیزوں کو محفوظ رکھنا ہوتا ہے ان کو محفوظ کر لیتی ہے۔

تواب بات یہ سامنے آئی کہ اس زمین پر جو بھی کچھ ہے نباتات ہوں، جمادات ہوں یا حیوانی اجزاء ہوں ہر اک کی اپنی ایک خاصیت ہوتی ہے۔ایک طریقہ علاج تو یہ ہوا کہ مرض کی کیفیت دیکھ کر ایسی کوئی دوا تجویز کی جائے کہ جس میں یہ خاصیت اللہ نے رکھ دی ہو کہ اس مخصوص مرض کا اس سے ازالہ ہو جاتا ہے۔ یہ ایک مادی علاج ہے۔

اس کے برعکس ایک اور علاج ہے جس کو آپ روحانی علاج کہتے ہیں مادی علاج میں اور روحانی علاج میں کچھ فرق ہے گو کہ روحانی علاج والے بھی مادی چیز کا سہارا لیتے ہیں چیز کی خاصیت کو بدلنے میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ مثلاً جیسا کہ ابھی وجاہت صاحب نے سوال کیا نیگیٹیو بنوا کر دیکھنے سے کس طرح کا فائدہ ہو جاتا ہے، کس قسم کے مرض ختم ہو جاتے ہیں۔ نفسیاتی امراض میں مثلاً ڈپریشن، ٹینشن، نیند نہ آنے کی شکایت، خوف وغیرہ بطور روحانی علاج ہم نے کئی مرتبہ نیگیٹیو بنی کا مشورہ دیا ہے جیسا کہ میں نے تمہید میں آپ سے بیان کیا کہ ہر چیز میں خاصیت ہوتی ہے اس کلیہ کے تحت نیگیٹیو میں بھی کچھ خاصیت موجود ہے۔اس میں دو باتیں زیر بحث آتی ہیں ایک تو یہ کہ یہ علاج زیادہ تر دماغی امراض میں استعمال ہوتا ہے مثلاً ڈپریشن میں کہ ایک شخص کو مختلف منفی خیالات آتے ہیں۔ مثلاً ایک آدمی کو خیال آتا ہے کہ میرے اوپر جادو ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مریض کا ذہن ایک منفی خیال پر ٹھہر گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ ایک طرف تو اس کیفیت سے نکلنا چاہتا ہے لیکن ساتھ ساتھ وہ نکلنا نہیں بھی چاہتا۔

اب اس کا روحانیت میں طریقہ علاج یہ ہے کہ جس آدمی کا ذہن ایک خیال پر مرکوز ہو گیا اور قائم ہو گیا اس بندے کو اس خیال سے ہٹا کر یہ دوسرے خیال میں ڈال دیا جائے۔ منفی خیال سے ہٹانے کیلئے روحانیت میں یہ طریقہ ہے کہ اس بندے کو جس خیال میں وہ گرفتار ہے اس کو یہ نہ کہو کہ یہ غلط ہے یہ بھی نہ کہو کہ اس کو چھوڑ دو اس لئے کہ وہ خود ہی چھوڑنا چاہتا ہے جب وہ چھوڑنے میں ناکام ہوتا ہے تب ہی وہ آپ کے پاس آتا ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ اس خیال کو ہٹا کے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاؤ۔خیال کو کسی ایک نقطے سے ہٹا کر دوسرے پر مرکوز کرنا ایک مشق ہوئی۔اب نیگیٹیو بنی کے عمل کی علمی توجیہہ یہ ہے کہ تخلیق کے دو رخ ہیں ایک مثبت رخ ہے ایک منفی رخ ہے، ایک نیگیٹیو ہے ایک پوزیٹیو ساری کائنات بھی نیگیٹیو اور پوزیٹیو پر بنی ہوئی ہے۔ کیمرے سے تصویر کشی کے ذریعے اس کی مثال اس طرح دی جاسکتی ہے کہ جب کیمرے سے ہماری تصویر اتاری جاتی ہے تو پہلے نیگیٹیو بنتا ہے یہ نیگیٹیو الٹا ہوتا ہے اور جب اس نیگیٹیو کو دوسرے کاغذ پر پلٹا جاتا ہے تو وہ تصویر سیدھی ہوتی ہے یہ الٹا ہونا اور سیدھا ہونا ایک مسلسل عمل ہے اور ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔اس بات کو اب ہم اس طرح بیان کریں گے ہمارا جسم جو ہمیں سیدھا نظر آرہا ہے۔ یہ پوزیٹیو اور جس نیگیٹیو کی یہ تصویر ہے وہ نیگیٹیو روح ہے۔روح اللہ تعالیٰ کے ایک سسٹم کے تحت اپنی تصویر بناتی ہے اسے جسم کہتے ہیں۔ گوشت پوست اور ہڈیوں کے اس جسم کا جب ہم نے کیمرہ کے ذریعے نیگیٹیو بنوایا تو ہوا یہ کہ ہماری جو سیدھی تصویر ہے یہ تصویر الٹ گئی الٹ کے یہ نیگیٹیو ہو گئی۔ نیگیٹیو ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ تصویر نیگیٹیو ہونے کے باعث کہا جاسکتا ہے کہ یہ تصویر روح سے قریب ہو گئی کیونکہ روح نیگیٹیو ہے اور جسم پوزیٹیو ہے جب پوزیٹیو کا نیگیٹیو بنا تو جسم جو ہے روح سے قریب ہو گیا۔ روح

میں بیماری نہیں ہوتی روح میں کوئی پریشانی بھی نہیں ہوتی روح میں Time and Space بھی نہیں ہوتا روح کو نزلہ کھانسی بھی نہیں ہوتی اور روح کو دماغی مرض بھی نہیں ہوتا۔ تو جب ایک مریض پوزیٹو کی حیثیت سے نیگیٹیو کو بار بار دیکھے گا اور اس کی طرف متوجہ رہے گا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اس بات آپ اس بات کو جان نہیں رہے ہیں لیکن آپ جسمانی و ذہنی طور پر اپنی روح کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں اب جتنی توجہ آپ کی روح کی جانب منتقل ہو گی جتنے زیادہ روح کے ساتھ آپ یکسو ہو جائیں گے اتنا ہی زیادہ منتشر خیالات ٹوٹ کر روح کے ایک نقطے پر مرکوز ہو جائیں گے اور اسی حساب سے روح کی تحریکات روح کی روشنیاں پوزیٹو کو منتقل ہو جائیں گی۔ اب آپ یوں سمجھیں کہ ایک آدمی کا نیگیٹیو ہے اس نیگیٹیو کے اوپر دھبے ڈال دیں اب آپ اس نیگیٹیو سے ایک لاکھ تصویریں بنوائیں گے تو اس ایک لاکھ تصویروں میں دھبے ضرور آئیں گے۔ لیکن اگر نیگیٹیو صاف ہے تو جتنا نیگیٹیو صاف ہو گا اتنی ہی تصویر صاف آئے گی خوبصورت آئے گی۔ روح میں داغ دھبے نہیں ہیں روح میں بیماری بھی نہیں ہے۔ جب ہم بار بار روح کی طرف متوجہ ہونگے تو ظاہر ہے روح کی تحریکات بھی ہمیں منتقل ہونگی اور جب روح کی تحریکات ہمیں منتقل ہو جائیں گی تو جو آپ کو خیالات ستا رہے ہیں بیماری سے متعلق وہ خیالات آپ بھول جائیں گے اور جب وہ خیالات آپ بھول جائیں گے تو صحت کی جانب قدم اٹھالیں گے۔ تو پوزیٹو کی حیثیت سے ایک نقطہ سے ہٹ جائیں گے جیسے جیسے ایک مخصوص خیال سے ہٹ جائیں گے اسی مناسبت سے بیماری سے متعلق ذہن میں خیالات کمزور پڑتے جائیں گے اور صحت کی طرف قدم بڑھائیں گے۔

اعتکاف رمضان

سوال: ماہ رمضان کے آخری عشرہ میں لوگ اعتکاف میں بیٹھتے ہیں اعتکاف کی کیا اہمیت ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب: ہمارے دین کے جتنے بھی ارکان ہیں اگر ان پر غور کیا جائے تو ارکان اسلام کی ایک حیثیت انفرادی ہے اور ساتھ ساتھ اس رکن کی حیثیت اجتماعی ہے اگر تفکر کیا جائے تو اسلام کا پیغام یہ ہے کہ اجتماعی حیثیت کو قائم کرو انفرادی سوچ سے نکل کر اجتماعی سوچ کو اختیار کرو اس لئے پانچ وقت مسجد میں اکٹھے ہو کر نماز باجماعت ادا کرتے ہیں۔ اس طرح نماز جمعہ کے بعد پھر عیدین کی نمازیں آتی ہیں۔ جس طرح کئی محلے کے افراد کسی ایک جامع مسجد میں جا کر جمعہ کی نماز ادا کرتے ہیں اسی طرح سارے شہر کے افراد ایک جگہ جمع ہو کر نماز عید ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح حج ایک ایسا فرض ہے جس میں ساری دنیا سے لاکھوں فرزندان توحید خانہ کعبہ میں حاضری دیتے ہیں اور فریضہ حج ادا کرتے ہیں۔ یہ بھی اجتماعی عمل ہوا۔ رمضان کا پروگرام بھی ایک اجتماعی پروگرام ہے ایسا پروگرام کہ ساری امت مسلمہ اللہ کے لئے پورا دن بھوکی پیاسی رہتی ہے۔ اللہ کے لئے اس نے روزہ رکھا یعنی اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا اس لئے کہ اللہ یہ چاہتا ہے کہ تم صبح سے شام تک بھوکے رہو تو وہ اجتماعی طور پر صبح سے شام تک بھوکے رہتے ہیں۔ جب اللہ نے یہ چاہا کہ اب تم بھوکے نہیں رہو تو روزہ افطار کر لیتے ہیں۔ یہ بھی ایک اجتماعی عمل ہے۔ روزے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بھوک اور پیاس سے اللہ تعالیٰ کا کیا تعلق۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ آپ نے پیٹ کے تقاضوں کو اللہ کے لئے وقف کر دیا تو اب یہ جو بھوک پیاس کا شدید تقاضا ہے یہ اللہ سے ہم رشتہ ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے بندہ اللہ کی ذات سے قریب ہو جاتا ہے۔ یہ ایک فائدہ ہوا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ جب انسان بھوکا اور پیاسا رہتا ہے سارا دن تو اس کے ذہن میں اس بھوکے پیاسے رہنے کے آداب بھی ہیں اس کو یہ معلوم ہے کہ روزہ رکھ کر آدمی جھوٹ بولے تو روزہ نہیں ہوتا اسے یہ بھی معلوم ہے کہ روزہ رکھ کر اگر بے ایمانی کی جائے تو روزہ نہیں ہوتا تو اس کے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ سارا دن بھوکا رہنے کے باوجود بھی اگر میرا روزہ نہیں ہوا تو اس کے بھوکے پیاسے رہنے کا فائدہ کیا ہے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ روزے میں زیادہ سے زیادہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ جھوٹ نہ بولے اور زیادہ سے زیادہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ وہ عبادت کرے۔

تیسرا فائدہ روزے کا یہ ہے کہ انسان کی صحت اچھی رہے گی جتنی بھی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں اس کا کسی نہ کسی طرح تعلق پیٹ سے ہوتا ہے۔ اگر انسان کا پیٹ صحیح ہے تو وہ بیمار بھی نہیں ہوتا جو لوگ کھانے پینے میں احتیاط کرتے ہیں۔ ان کا نظام ہضم درست رہتا ہے وہ بیمار نہیں ہوتے وہ ان لوگوں کے مقابلے میں بہت کم بیمار ہوتے ہیں جو کھانے پینے میں بے احتیاط ہوتے ہیں۔ یہ بات ہم سب جانتے ہیں تو جب ہم صبح سے شام تک بھوکے رہیں گے اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہمارے نظام ہضم کو طاقت ملے گی اور ہماری صحت بھی بحال ہو گی۔ ایک صحت مند آدمی دنیاوی کام ہو یا دینی کام ہو صحیح طریقے سے سر انجام دے سکتا ہے۔

چوتھا فائدہ روزے کا جو روحانی نقطہ نظر سے وہ یہ ہے کہ انسان جب بھوکا رہتا ہے اور وہ بھوک اللہ کے لئے ہوتی ہے تو اس کے اندر اللہ کے انوار ذخیرہ ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ

"روزے کی جزا میں خود ہوں"

یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات اللہ تعالیٰ کے انوار و تجلیات اور روشنیاں انسان کے اندر منتقل ہونا شروع ہو جاتی ہیں اور جیسے جیسے وہ روشنیاں انسان کے اندر ذخیرہ ہوتی ہیں اسی مناسبت سے روح کے اندر بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ روح کے اندر طاقت پیدا ہوتی ہے تو پہلے رمضان سے 19 رمضان تک ہر روزہ دار کے اندر ایسی صلاحیتیں بیدار اور متحرک ہو جاتی ہیں جن کا تعلق براہ راست اللہ تعالیٰ کے انوار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور نبوت سے ہے اور روح نور نبوت کے انوار سے معمور ہو جاتی ہے اب جو 19 دن بھوکا رہنے سے انوار اور روشنیاں ذخیرہ ہو نگی ان سے فائدہ بھی اٹھانا چاہیئے۔

مثلاً آپ کے پاس ایک بہترین گاڑی ہے اس کے اندر پیٹرول نہیں ہو گا تو گاڑی نہیں چلے گی یا اگر پیٹرول کم ہے تو گاڑی چلے گی اور بار بار رکے گی اب اس گاڑی کی ٹینکی کو آپ نے فل کرا لیا ہے اب ٹینک جب فل ہو گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ گاڑی آپ کے سفر میں صحیح طور پر کام آئے گی اور اگر آپ اسے نہیں چلائیں گے تو گاڑی میں پیٹرول بھرا رہے گا اور ممکن ہے بہت زیادہ دن گزر جائیں تو وہ اڑ ہی جائے۔ مثال ناقص ہے لیکن سمجھانے کے لئے دینی پڑتی ہے یعنی مسلمان روزے دار جب 19 دن میں اپنے اندر اللہ تعالیٰ کے انوار و تجلیات کا ذخیرہ کر لیتا ہے تو اب اس کا استعمال زیر بحث آتا ہے۔ استعمال سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی روشنیاں روح کو پرواز کی طرف مائل کرتی ہیں اب روح کی عالم بالا کی طرف پرواز ہونی چاہیئے۔

عالم غیب میں داخل ہو کر عالم غیب کا مشاہدہ کرنا چاہیئے۔ مشاہدے کے لئے بہت زیادہ یکسوئی کی ضرورت ہے بہت زیادہ جسمانی سکون ضروری ہے تو اس جسمانی سکون کے لئے اور ذہنی یکسوئی حاصل کرنے کے لئے اعتکاف کا مسئلہ سامنے آتا ہے یعنی انسان اپنے دنیاوی مشاغل ترک کر کے بیوی بچوں سے دور ہو کر گھر بار چھوڑ کر کسی ایک گوشے میں صرف اور صرف اللہ کے لئے بیٹھ جائے اور وہ بیٹھنا دس دن کے لئے ہو۔

اب دس دنوں میں ۲۰ کے بعد سے ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷ رمضان المبارک کی راتوں میں لیلۃ القدر کی رات ہوتی ہے اب اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا:

"ہم نے قرآن کو نازل کیا لیلۃ القدر میں۔"

قرآن کیا ہے قرآن ایک دستور العمل ہے ایسا دستور العمل جو آپ کے لئے دنیاوی رہنمائی بھی کرتا ہے اور ایسا دستور العمل جو آپ کے لئے عالم بالا اور ماورائی دنیا کے لئے بھی رہنمائی کرتا ہے۔ تو لیلۃ القدر کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ لیلۃ القدر ایک ہزار مہینوں سے افضل ہے۔

ایک ہزار مہینوں سے افضل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ رات 30 ہزار دن اور 30 ہزار راتوں سے بہتر ہے۔ 30 ہزار دن 30 ہزار راتوں کا جب ہم تذکرہ کرتے ہیں کہ انسان دن میں جاگتا ہے، بیدار رہتا ہے یعنی بیدار رہ کر زندگی گزارتا ہے حواس خمسہ میں رہ کر زندگی گزارتا ہے جذبات و احساسات کے ساتھ زندگی گزارتا ہے اور رات میں بیداری سے ہٹ کر خواب کے عالم میں زندگی گزارتا ہے۔ جب ہم سوتے ہیں تو سونے کے دوران حواس کی رفتار دن کے حواس کی رفتار سے زیادہ ہو جاتی ہے اس کی مثال یہ ہے کہ ہم یہاں سوتے ہیں تو سونے کے دوران حواس کی رفتار دن کے حواس کی رفتار سے زیادہ ہو جاتی ہے اس کی مثال یہ ہے کہ ہم یہاں سوتے ہیں اور خود کو لندن میں پاتے ہین کوئی آدمی ہمارا پیر ہلاتا ہے تو پھر ہم ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصہ میں چارپائی پر موجود ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مہینوں کا سفر سیکنڈوں میں طے ہو جاتا ہے۔ خواب کے حواس میں ہماری رفتار بڑھ جاتی ہے اب ہم یوں کہیں گے اس کو سائنسی نقطہ نظر سے کہ ایک رات بہتر ہے تیس ہزار خواب کے حواسوں سے '30 ہزار دن کے حواس سے' اب اس کا سیدھا سیدھا مطلب یہ ہوا کہ ایک رات بہتر ہے ساٹھ ہزار دن اور رات سے' یعنی ایک انسان جتنا سفر 60 ہزار دن اور رات میں کرتا ہے اگر اس کے اندر لیلۃ القدر کے حواس اللہ تعالیٰ کے حکم سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے متحرک اور بیدار ہو جائیں تو وہی بندہ ایک رات میں ساٹھ ہزار رات اور دن کے برابر سفر کرے گا۔

اگر عبادت میں اس کا ذہن یکسو ہو گیا اور اللہ تعالیٰ سے ربط قائم ہو گیا تو وہ ساٹھ ہزار گنا رفتار سے سفر کرے گا۔

یہ جو لوگ اعتکاف میں بیٹھتے ہیں یہ فی الواقع ماورائی دنیا میں داخل ہونے کا پروگرام اور صحیح بات یہ ہے کہ اگر رمضان کے روزے 20 دن تک صحیح معنوں میں رکھ لے اور اس کے بعد اعتکاف میں بیٹھا جائے تو ذہنی مرکزیت حاصل ہونے کے بعد انسان کو مرتبہ احسان حاصل ہو جاتا ہے۔

حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا ارشاد ہے:

‘‘مومن کو مرتبہ احسان حاصل ہوتا ہے‘ مرتبہ احسان کے دو درجے ہیں ایک درجہ یہ ہے کہ بندہ محسوس کرے کہ مجھے اللہ دیکھ رہا ہے اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ بندہ یہ محسوس کرے کہ میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں۔’’

رمضان کے پروگرام کی کامیابی کے نتیجے میں اگر فی الواقع صحیح معنوں میں جدوجہد اور کوشش کی جائے تو مومن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق مرتبہ احسان حاصل ہو جاتا ہے اور یہی اعتکاف بھی ہے۔ اس لئے اعتکاف کرنا چاہئے۔

روحانی لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ کثرت سے درود شریف، کلمہ تمجید اور قرآن پاک پڑھنا چاہئے۔ قرآن پاک کے معنی و مفہوم پر غور و فکر کرنا چاہئے‘ مراقبہ کرنا چاہئے‘ مراقبے سے مراد یہ ہے کہ آپ جب بھی کچھ پڑھیں تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کر کے بیٹھ جائیں اور یہ تصور کریں کہ مجھے اللہ دیکھ رہا ہے مجھے اللہ دیکھ رہا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے یہ تصور قائم ہو جائے کہ مجھے اللہ دیکھ رہا ہے یہ۔۔۔۔۔ چار پانچ دن میں ہو جاتا ہے اور اعتکاف میں آدمی بیٹھے تو پھر بقایا دن جو ہیں اسے اس بات کا مراقبہ کرنا چاہئے کہ میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں اور اللہ تعالیٰ دور تو نہیں اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا:

‘‘میں تمہاری رگ جان سے زیادہ قریب ہوں۔’’

اب یہ ہے کہ ہم اسے دیکھیں تو سہی اسے پکاریں تو سہی اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جہاں تم ایک ہو وہاں میں دوسرا

وں جہاں تم دو ہو وہاں میں تیسرا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے:

‘‘میں نے تو تمہیں احاطہ کیا ہوا ہے، میں تو ایک دائرہ ہوں تم اس کے اندر ہو۔’’

تو یہ اللہ تعالیٰ کا جو فرمان ہے جب ہم اس پر غور و فکر کریں گے اللہ تعالیٰ کو تلاش کریں گے اللہ تعالیٰ کہیں دور نہیں ہیں اللہ تعالیٰ ہمارے اندر بستے ہیں۔

اللہ تعالیٰ دل میں بستے ہیں، رگ جان سے زیادہ قریب ہیں تو رمضان میں جو اعتکاف ہے اس کی بہت ہی فضیلت ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں رمضان کی برکات سے فیضیاب کرے اور ہمیں توفیق دے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اعتکاف میں بیٹھیں اور زیادہ سے زیادہ مراقبہ کریں۔ مراقبہ میں یہ تصور کریں کہ مجھے اللہ دیکھ رہا ہے یا میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں۔